

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد ۲

(فادلات)

حضرت مولانا صفوی عبدالحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوہر حلب النوالہ

طبع سولہ

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ و آیت ۱۴۱ تا ۱۴۲)
حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور کوہ جرائوالہ
الان للعلما ین۔ ایم اے علوم اسلامیہ
۳۹۶ صفحات
پانچ سو (۵۰۰)
سید الخط طبعین حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ مدظلہ
محمد امین اللہ قادری کوہ جرائوالہ
مکتبہ دروس القرآن فاروقی ٹیچ کوہ جرائوالہ
۱۵۵۔ پ

نام کتاب

افادات

مرتب

تخنی و مت

تقدیر و تہیات

سرورق

تہیات

ناشر

قیمت

دسمبر ۲۰۰۷ء بمطابق ذیقعد ۱۴۲۸ھ

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن محلہ فاروقی ٹیچ کوہ جرائوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ درجہ بالا دروہ پٹنہ
- (۲) دارالعلوم اشرفیہ مدرسہ اسلامیہ العلوم و جرائوالہ (۶) کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوٹہ کیتھان
- (۳) مکتبہ قادیانہ دارالافتاء دارالافتاء (۷) مکتبہ علمیہ نزد جامعہ عربیہ اسلامیہ کتب خانہ
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید دارالافتاء دارالافتاء (۸) اسلامیہ کتب خانہ دارالافتاء دارالافتاء
- (۹) مکتبہ رشیدیہ دروہ پٹنہ

فہرست مضامین

دروس القرآن پارہ ۱ جلد ۱

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲	استقامت کی ضرورت	۱۵	پیش لفظ (ذوالحجۃ ۱۴۱۰ھ میں طوم اسلامید لاہور)
۲۳	مجاہد	۱۹	سخنِ گھنٹی (ذوالحجۃ ۱۴۱۰ھ میں طوم اسلامید لاہور)
۲۴	سجاد	۳۳	درس اول (آیت ۲۱)
۲۷	درس دوم (آیت ۲۱)	۳۷	سورۃ اور آیت
۲۸	محکمات متشہات مقطعات	۳۸	آیت کے مختلف معانی
۳۵	۱۰۰ مسند احمد اور ان کی تفہیم	۴۵	سورتوں اور آیتوں کی ترتیب
۳۶	حدیث متعلقات پر مضمون کے باب	۴۶	صحابہ کی آثار و عجائبات
۳۷	حضرت صدیق اکبرؓ	۴۷	ذبحِ نسیم
۳۸	حضرت علی مرتضیٰؓ	۴۸	مکی اور مدنی سورتیں
۳۹	حضرت ام شہیدؓ	۴۹	ترتیبِ تلاوت کی نکتہ
۴۰	حضرت ابن مسعودؓ	۵۰	فہرست سورت
۴۱	حضرت ام رانہؓ	۵۱	مضامین سورۃ
۴۲	مقطعات اسمائے الہی ہیں	۵۲	نام اور کوائف
۴۳	مقطعات اسمائے قرآنی ہیں	۵۳	سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں رب
۴۴	مقطعات بحیثیت جلیغ	۵۴	مہات دین
۴۵	اہم اخص شہکی رائے	۵۵	معرفت الہی
۴۶	عبداللہ بن عباسؓ کا قول	۵۶	ثبوت نبوت

۵۵	انسانوں کے تین کردہ	۴۰	امام ابو ذریٰ کی تحقیق
۵۶	کفر و معنی	۴۱	شیخ ابن عربی کا قول
۵۷	کفر کی مختلف اقسام	۴۲	نزول مقطعات معجزہ سرور کائنات
۵۸	کفر و نکار	۴۳	امام بیضاوی کا قول
۵۹	کفر و نور	۴۴	امام شاہ ولی اللہ کا فلسفہ
۶۰	کفر و غدار	۴۵	مولانا سوادوری کا نظریہ
۶۱	کفر و نفاق	۴۶	مذہب اہل حق کا قول
۶۲	کفر و شک	۴۷	خیرت و خسر
۶۳	کفر و بہات	۴۸	درس سوم (آیت ۵۱)
۶۴	کفر و تاول	۴۹	لفظ ذلت کی حکمت
۶۵	عملی کفر	۵۰	لفظ لاریب کا مفہوم
۶۶	کفر و ہریت	۵۱	مولانا شیخ السنہ کی تفسیر
۶۷	ایک اشکال اور اس کا جواب	۵۲	متنیں کے لیے ہدایت
۶۸	درس پنجم (آیت ۵۶)	۵۳	تقویٰ کی تعریف
۶۹	گزشتہ سے پیوستہ	۵۴	تقویٰ کے تین درجات
۷۰	ان آیات کا مسدق کون ہیں	۵۵	متقی کون ہیں
۷۱	مہر لگانے کا مطلب	۵۶	ایمان بالغیب
۷۲	دلوں کی سیاہی	۵۷	اقامت صلوٰۃ
۷۳	اعضائے ریسکت میں باز پرس ہوگی	۵۸	انفاق فی سبیل اللہ
۷۴	اعضائے غیر میں سے قلب کی اجماعیت	۵۹	کتاب سادہ پر ایمان
۷۵	غدا اب عظیم کی وجہ	۶۰	ایمان بالآخرت
۷۶	اعضائے رفیعہ کام نرا ایک ہے	۶۱	ہریت و ہنہ و رنگ
۷۷	درک ششم (آیت ۱۲۸)	۶۲	درس چارم (آیت ۱۲۸)

۹۰	منافقین کی مثال	۷۱	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	انذہبیوں کی مختلف قسمیں	۷۲	منافقین کا گروہ
۹۳	منافقین کی بدعتی	۷۳	منافقین کی قسمیں
۹۵	درس ششم : (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۹)	۷۴	نفاق دینی بیماری ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۷۵	فاد فی ارض
۹۶	منافقوں کی دوسری مثال	۷۶	منافقین کی دھوکہ دہی
"	اعتقادی اور عملی منافق	۷۷	حکومتی سطح پر نفاق
"	دل کی چار قسمیں	۷۸	غداپ عظیم اور عذاب الیم میں فرق
۹۷	ایمان اور نفاق کی مثال	۷۹	درس ہفتم : (آیت ۱۶۳ تا ۱۶۴)
"	قلب کی چھ حالتیں	۸۰	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بارش کی مثال	۸۱	حقیقی ایمان
۹۹	منافقین کی بے بسی	۸۲	معیار حق
۱۰۰	درس و ہم : (آیت ۲۱ تا ۲۲)	۸۳	انسان اور اس کا دل
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۴	حقیقی انسان کون ہیں
"	مخاطبہ قرآن	۸۵	بیوقوف کون ہیں
۱۰۲	چار ہم عناصر	۸۶	منافقوں کی مددنی پالیسی
"	ترنید	۸۷	استنزاز من اللہ کا مفہوم
۱۰۳	صفات النبی	۸۸	ہدایت کے بدلے گمراہی
"	معرفت النبی	۸۹	درس ہشتم : (آیت ۱۷۱ تا ۱۸۰)
۱۰۵	عبادت النبی	۹۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۰۶	وجود النبی پر دلائل		کتب آسمانی اور ارشاد
۱۰۹	درس یازدہم : (آیت ۲۱ تا ۲۲)		تفاسیر انعام القرآن
"	ترجید عبادت کے لیے شرط ہے		مثال کی حکمت

۱۳۰	۱۱۰	گزشتہ سے بیروت	دلائل توحید
۱۳۱	۱۱۱	حقیر ہیزوں کی مثالیں	کب سوال اور اس کا جواب
۱۳۲	"	حیا کی مختلف قسمیں	عبادت کیوں ضروری ہے
۱۳۳	۱۱۲	ہدایت اور گمراہی	عبادت کے لائق صرف ذات باری ہے
۱۳۴	"	فاسق کا معنی	زمین کے فوائد
۲۵	۱۱۳	بیورد و منافقین کی عمدہ شہادتیں	آسمان اور پانی کی نعمت
۱۳۶	"	قطع رحمی	لفظ نہ کا معنی
"	۱۱۵	صلہ رحمی	نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں
"	۱۱۶	فساد فی الارض	شرک فی المشیت
۱۳۷	"	نافقین کی ناکامی	شرک فی العادت
۱۳۸	۱۱۷	درس چہار و دہم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)	شرک کی دوسری قسمیں
"	۱۱۸	گزشتہ سے بیروت	شرک خفی
۱۳۹	۱۱۹	اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر	اطاعت بغیر اللہ
۱۴۰	۱۲۱	موت و حیات تصرف الہی میں ہے	درس دواز دہم ۱۵ (آیت ۲۲ تا ۲۵)
۱۴۱	"	محاسبے کا عمل	گزشتہ سے بیروت
۱۴۲	۱۲۲	میت و دفن کرنے کے آداب	قرآن پاک خاص معجزہ ہے
"	۱۲۳	تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں	عہد باعزت لفظ ہے
۱۴۳	"	موت سامانِ عبرت ہے	قرآن بطورِ حلیج
"	۱۲۴	شیار میں اسلحہ امت ہے	منکرین قرآن کی سزا
۱۴۴	۲۸	آسمانوں کی تخلیق	ایمانداروں کے لیے بشارت
۱۴۵	"	علیم کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	بھپوں میں مشابہت
"	۱۲۵	عبادت الہی لازم ہے	بائتہ دیویاں
۱۴۷	۱۳۰	درس پانزدہم ۱۵ (آیت ۳۰)	درس سیز دہم ۱۶ (آیت ۲۶ تا ۲۷)

۱۴۰	جنت سے نزع	۱۴۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۴۱	زمین ہی اصل ٹھکانہ ہے	۱۴۱	موضوع
۱۴۲	درس ہشودھم (آیت ۲۹، ۳۰)	۱۴۲	ہر صفتی بادشاہ ہوگا
۱۴۳	گزشتہ سے پیوستہ	۱۴۳	تخلیق ان فی سے قبل کے اوراق
۱۴۴	حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ	۱۴۴	قرشتوں کا مادہ تخلیق
۱۴۵	حضور علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر نفیست	۱۴۵	بغاث اور شیاطین
۱۴۶	زمین پر اترنے کا حکم	۱۴۶	ان کا مادہ تخلیق
۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کی مباحثات	۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ میں
۱۴۸	جنت کے تحفے	۱۴۸	مسک خلائف
۱۴۹	حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول	۱۴۹	درس شانزدہم (آیت ۲۱، ۲۲)
۱۵۰	بعض افیدہ مہم السلام کے پیٹے	۱۵۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۵۱	توبہ کی قبولیت	۱۵۱	آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھائے گئے
۱۵۲	توبہ کی ناسر الخط	۱۵۲	ہلائک کا امتحان
۱۵۳	زمین پر اترنے کی حکمت	۱۵۳	آدم علیہ السلام کی کامیابی
۱۵۴	توبہ کی حقیقت	۱۵۴	درس سبضہ ہم (آیت ۲۳، ۲۴)
۱۵۵	ہدایت کے متبعین	۱۵۵	قرشتوں کی سجدہ ریزی
۱۵۶	کفار و مکذبین	۱۵۶	خدا تعالیٰ کے سوا کوب ہر سجدہ حرام ہے
۱۵۷	درس نوزدھم (آیت ۳۰، ۳۱)	۱۵۷	قرشتوں کے سجدہ کی بعض ترکیبات
۱۵۸	توبہ کی اسرائیل	۱۵۸	ابلیس کا انکار
۱۵۹	بنی اسرائیل پر انعامات	۱۵۹	حمد اولین گناہ ہے
۱۶۰	بنی اسرائیل کی تہ شکنی	۱۶۰	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں
۱۶۱	ایمان بالقرآن	۱۶۱	شجر ممنوعہ
۱۶۲		۱۶۲	شیطان و سور

۲۱۲	۱۸۹	دنیا کی محبت	خست خاص نعمت ہے
۲۱۳	۱۹۰	تہیں اردن کان حق	مرد چالیس کی اہمیت
۲۱۴	۱۹۱	درس بستہ (آیت ۴۳ تا ۴۶)	بنی اسرائیل کی گرسلاہ پرستی
۲۱۵	۱۹۲	گنہگار سے بیعت	مختلف قوموں کے ایک دوسرے پر اثرات
۲۱۶	۱۹۳	قبول حق سے انکار کی وجوہات	مسند حلول
۲۱۷	۱۹۴	حب مال و جاہ کی بیماریاں	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی
۲۱۸	۱۹۵	بیماریوں کا علاج	پکڑے گئے پجاریوں کا قتل عام
۲۱۹	۱۹۶	نماز جامع عبادات ہے	درس بستہ (آیت ۵۵ تا ۵۷)
۲۲۰	۱۹۷	نماز باجماعت	ربط آیات
۲۲۱	۱۹۸	قرل و فعل میں تفاد	رویت انہی کی خواہش
۲۲۲	۱۹۹	صبر و صلوٰۃ کی برکات	بنی اسرائیل کو سزا
۲۲۳	۲۰۰	رجوع الی اللہ	رویت الہی اس جہان میں ممکن نہیں
۲۲۴	۲۰۱	درس بستہ ویکٹ (آیت ۴۷ تا ۵۰)	بنی اسرائیل کو جلاک کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا
۲۲۵	۲۰۲	ربط آیات	جہاد سے فرار
۲۲۶	۲۰۳	بنی اسرائیل کی فضیلت	بادل کا سایہ
۲۲۷	۲۰۴	اسلامی تاریخ کی حفاظت	من اور سلوی
۲۲۸	۲۰۵	امت مسلمہ کی برتری	پنہ آپ پر ظلم
۲۲۹	۲۰۶	برتری کا معیار تقویٰ ہے	درس بستہ و چہار (آیت ۵۸ تا ۵۹)
۲۳۰	۲۰۷	مسند شفاعت	ربط آیات
۲۳۱	۲۰۸	فرعون سے نجات	بستی میں داخلہ
۲۳۲	۲۰۹	فرعون کی مرقابی	سجدہ شکر
۲۳۳	۲۱۰	درس بستہ و دو (آیت ۵ تا ۵۴)	استغفار کی برکات
۲۳۴	۲۱۱	نزول توراۃ	

۲۵۰	آیات الی کا انکار	۲۳۱	حکم خداوندی میں تبدیلی
"	نبیاء عیسم السلام کا قتل	۲۳۲	عائقی قرین اور حق شفعہ
۲۵۱	نافرمانی اور حد سے تجاوز	۲۳۳	وراثت میں شریک کا حصہ
۲۵۲	درس لبت و ہفت ^{۲۵} (آیت ۶۲)	"	ظلموں کا حشر
"	قانون نجات	۲۳۴	زمین کی آبادی اور بربادی
"	مذہب ملام	۲۳۵	درس لبت و پنج ^{۲۶} (آیت ۶۰)
۲۵۳	اہل ایمان	"	رابطہ آیات
"	ہکادوا کا مضمون	"	بنی اسرائیل کا طلب آب
۲۵۵	یسودی کی وجہ تسمیہ	۲۳۶	استسقا کی حقیقت
"	یسودی عقائد	"	استسقا کا طریقہ
۲۵۶	نصاری کی وجہ تسمیہ	۲۳۷	ضرب گھسی
۲۵۸	نصاری کے عقائد باطلہ	۲۳۹	پانی کی تقسیم
۲۵۹	صابی کون ہیں	۲۴۰	ایک اعتراض اور اس کا جواب
"	صابیوں کے عقائد	۲۴۱	معجزہ اور کرامت
۲۶۱	ضیفی بقیہ صابی	۲۴۲	ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر
"	ایمان باللہ	۲۴۳	فاد فی الارض
۲۶۲	ایمان بالآخرت	۲۴۵	درس لبت و شش ^{۲۷} (آیت ۶۱)
"	اعمال صالحہ	"	رابطہ آیات
۲۶۴	درس لبت و ہشت ^{۲۸} (آیت ۶۳ تا ۶۴)	۲۴۶	غلامی کے اثرات
"	بنی اسرائیل کا عہد	"	طعام کی تبدیلی
۲۶۵	ارتقاء طوطہ	۲۴۷	کاشتکاری و مشقت طلب کام ہے
۲۶۶	دین میں جبر نہیں	۲۴۸	پیشے بمطابق فضیلت
۲۶۷	اسمہاں با کتاب	"	یسودیوں کی ذلت و رسوائی

۰۵۰	۲۶۹	مصلحت النبی	قرآن کی پابندی
۰۵۱	۲۷۰	آئی کی نشانیاں	بنی اسرائیل کی عمدگی
۰۵۲	۲۷۱	باوجود مجبور ہو گئے	درس بست و نہ (آیت ۶۵ تا ۶۶)
	۲۷۲	فضول و سمات کا نشانہ	یہود کا مقدس دن ہفتہ
۲۶۴	۲۷۳	واقو قتل	جمعہ کی فضیلت
۲۶۵	۲۷۴	ایسے موتی بھرد مجزہ	یہود کی قانون شکنی
۲۶۶	۲۷۵	قاتل و زانیہ سے جوہر	یہود کے تین گروہ
۲۶۷	۲۷۶	درس کی وڈو (آیت ۶۷ تا ۶۸)	انسان بدترین گئے
۲۶۸	۲۷۷	قادت قبی	جید سازی بڑی خصلت ہے
۲۶۹	۲۷۸	پتھر دل سے زیادہ سخت دل	جائز جید سازی
۲۷۰	۲۷۹	پتھر دل کے فائدہ	تبدیلی اشکال کی توجیہ
۲۷۱	۲۸۰	سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے	نشان عبرت
۲۷۲	۲۸۱	بعض اکابر دین	درس سکی (آیات ۶۹ تا ۷۰)
۲۷۳	۲۸۲	مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ	رابط آیات
۲۷۴	۲۸۳	درس کی وڈو (آیت ۷۱ تا ۷۲)	واقعی رابط
۲۷۵	۲۸۴	رابط آیات	وجہ قتل
۲۷۶	۲۸۵	یہود کی طرف سے نا اہلی	قانون قاتل
۲۷۷	۲۸۶	احکام میں تحریر	کثرت سوال سے جو
۲۷۸	۲۸۷	یہود کی بہت دوسری	نبی سے قطع تعلقی
۲۷۹	۲۸۸	یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت	ٹھکانہ ہے
۲۸۰	۲۸۹	منہجین کی چار مایاں	شرش لہجی باز سے
۲۸۱	۲۹۰	یہود کی موجودہ روز وین	درس کی ویکٹ (آیت ۷۳ تا ۷۴)
۲۸۲	۲۹۱	تورہ میں تحریر	رابط آیات

۳۰۵	تحریر اور سلمان	۳۰۵	درس سی و ہفت ^{۲۰} (آیت ۸۲ تا ۸۶)
۳۰۶	تحریر کرنے والوں کو دینہ	۳۰۶	گزشتہ سے بیوستہ
۳۰۷	درس سی و چہار ^{۲۱} (آیت ۸۰ تا ۸۲)	۳۰۷	نور افق اور جلالی
۳۰۸	یہودیوں کے باطل عقائد	۳۰۸	بنی اسرائیل کی عمدہ سخن
۳۰۹	عمدہ اندوزی	۳۰۹	یہودیوں کی باہمی لڑائیاں
۳۱۰	باطل عقائد کی بنیاد	۳۱۰	مسلمانوں کی حالت زار
۳۱۱	مسلمانوں کے باطل عقائد	۳۱۱	سنت تعالیٰ عالم الغیب ہے
۳۱۲	قازنِ نجات	۳۱۲	درس سی و ہشت ^{۲۲} (آیت ۸۴ تا ۹۰)
۳۱۳	کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں	۳۱۳	کتاب اور رسول
۳۱۴	جنت کا چال	۳۱۴	حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور معجزات
۳۱۵	درس سی و پنج ^{۲۵} (آیت ۸۳)	۳۱۵	روح القدس
۳۱۶	ربط آیات	۳۱۶	انبیاءِ عظیم السلام کے ساتھ سلوک
۳۱۷	ترجمہ کے دو پہلو	۳۱۷	یہودیوں کا زعم باطل
۳۱۸	بنی اسرائیل کے مختلف عمدہ	۳۱۸	یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت
۳۱۹	معرفت الہی	۳۱۹	زہود اور نزہت و قرآن
۳۲۰	الدین سے حسن سلوک	۳۲۰	نظریہ قوسل
۳۲۱	قرابتہ اردوں کے حقوق	۳۲۱	بنی انحرار الزماں علیہ السلام سے حسنہ
۳۲۲	یتیم، یتیمیں اور فقیہ	۳۲۲	غضب پر غضب
۳۲۳	درس سی و شش ^{۲۶} (آیت ۸۲)	۳۲۳	درس سی و نہ ^{۲۹} (آیت ۹۱ تا ۹۶)
۳۲۴	گزشتہ سے بیوستہ	۳۲۴	گزشتہ سے بیوستہ
۳۲۵	تہذیب اخلاق	۳۲۵	دعوت ایمان
۳۲۶	حسن سکھ	۳۲۶	نبیاءِ عظیم السلام کا قتل
۳۲۷	نماز اور زکوٰۃ	۳۲۷	کوبہ اور پرستی

۲۵۰	موت کی آرزو	۲۵۰	نبیاں بیوی میں مدافعی	۲۵۱	موت و حیات کی طلب
۲۵۱	ظہیر احمد کی خواہش	۲۵۱	نافع اور صابر علم	۲۵۲	درس چیلنگ (آیت ۱۱۰ تا ۱۱۱)
۲۵۲	موت و حیات کی طلب	۲۵۲	یہودیوں سے معرفت	۲۵۳	شانِ نزول
۲۵۳	درس چیلنگ (آیت ۱۱۰ تا ۱۱۱)	۲۵۳	درس چیل و دو (آیت ۱۰۴ تا ۱۰۵)	۲۵۴	نزل وحی کی مختلف صورتیں
۲۵۴	شانِ نزول	۲۵۴	رابطہ آیات	۲۵۵	مقرب فرشتے
۲۵۵	نزل وحی کی مختلف صورتیں	۲۵۵	بنی اسرائیل کی اخلاقی ہستی	۲۵۶	جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی
۲۵۶	مقرب فرشتے	۲۵۶	بنو اسرائیل کی اخلاقی ہستی	۲۵۷	اہل ایمان کے لیے بشارت
۲۵۷	جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی	۲۵۷	نصوحیہ اسلام کی نظریات	۲۵۸	فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے
۲۵۸	اہل ایمان کے لیے بشارت	۲۵۸	اہل ایمان کو خطاب	۲۵۹	مقربین کا عبادی معنی ہے
۲۵۹	فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے	۲۵۹	مشقیہ لفظ استعمال کی ممانعت	۲۶۰	واضح نشانیاں
۲۶۰	مقربین کا عبادی معنی ہے	۲۶۰	یہودیوں کے سوا	۲۶۱	کتاب اللہ سے روگردانی
۲۶۱	واضح نشانیاں	۲۶۱	تفسیر آیات کی وجوہات	۲۶۲	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۲ تا ۱۰۳)
۲۶۲	کتاب اللہ سے روگردانی	۲۶۲	بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے	۲۶۳	شیطان کا اتباع
۲۶۳	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۲ تا ۱۰۳)	۲۶۳	رابطہ آیات	۲۶۴	حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو گر جو شیکا الزام
۲۶۴	شیطان کا اتباع	۲۶۴	یہودیوں کے سوالات	۲۶۵	جادو کے ذرائع
۲۶۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو گر جو شیکا الزام	۲۶۵	شرعیہ کے حالات	۲۶۶	ہاروت اور ہاروت دونوں تھے
۲۶۶	جادو کے ذرائع	۲۶۶	نہرین کے حالات	۲۶۷	ہاروت اور ہاروت کی معنی شہادت
۲۶۷	ہاروت اور ہاروت دونوں تھے	۲۶۷	نہرین کے حالات	۲۶۸	ہاروت اور ہاروت کے واقعے سے انکار
۲۶۸	ہاروت اور ہاروت کی معنی شہادت	۲۶۸	کثرتِ حالات کی ممانعت	۲۶۹	سحر کیا ہے ؟
۲۶۹	ہاروت اور ہاروت کے واقعے سے انکار	۲۶۹	اہل کتاب کے باطنی ارادت	۲۷۰	کیا ہاروت اور ہاروت انسان تھے ؟
۲۷۰	سحر کیا ہے ؟	۲۷۰	حسد بہترین بیماری سے	۲۷۱	کیا سارا جادو کفر ہے ؟
۲۷۱	کیا ہاروت اور ہاروت انسان تھے ؟	۲۷۱	غیر مسلم عامہ اقوام	۲۷۲	جادو گر کی سزا
۲۷۲	کیا سارا جادو کفر ہے ؟	۲۷۲	حد زہم پر اعتراضات		

۴۱۱	خوش و مضبوط	۲۹۱	قرآن پاک کے فلاح ساز
۴۱۲	استقبال قبلہ	۲۹۲	نماز اور زکوٰۃ
۴۱۳	درس چیل و شش (آیت ۱۱۹ تا ۱۲۰)	۲۹۳	نئی کامیابی
"	اللہ تعالیٰ اولاد سے پالے	۲۹۴	درس چیل و چہار (آیت ۱۲۱ تا ۱۲۲)
۴۱۵	تشبیہ اور شرک	"	ربط آیات
"	مُصْحَفُ لَاحِظ	"	یسو و نصاریٰ
"	ملک مد مملوک	۲۹۶	نجات کا دار و مدار
۴۱۶	صفت ابداع	۲۹۷	اتباع خداوندی
"	اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت	۲۹۸	نیک نیتی
۴۱۷	اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش	۲۹۹	اعمالِ صالحہ
۴۱۸	حضور علیہ السلام کے معجزات	"	فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے
"	حضور علیہ السلام کے لیے تسلی	۳۰۰	قانونِ نجات
۴۲۰	درس چیل و ہفت (آیت ۱۲۱ تا ۱۲۲)	"	اجرِ عظیم
۴۲۱	گذشتہ سے بہتر	۳۰۳	درس چیل و پانچ (آیت ۱۲۳ تا ۱۲۴)
"	رضامندی کے لیے اہل کتاب کی شرط	"	یسو اور نعلاری آئے مائے
"	ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے	۳۰۴	کتاب کا یہ بڑی سی
۴۲۳	اہل کتاب میں سے اہل ایمان	"	حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی
"	حقِ قیامت	"	مشرکین کا نظریہ
۴۲۴	مشرکین کے لیے خار و	۳۰۵	آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی ہوگا
"	حق و باطل کی پہچان	"	تحویل قبلہ
۴۲۵	بنی اسرائیل پر انعامات	۳۰۶	جہنم میں رکاوٹ
۴۲۶	قیامت کا نقشہ	"	تمام جہنمی نے قابلِ تغفیر ہیں
۴۲۷	درس چیل و ہشت (آیت ۱۲۵ تا ۱۲۶)	۳۰۹	منجھ کے آداب
"	گذشتہ دروس پر ایک نظر	۳۱۰	

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

اما بعد

الْرَّحْمَنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن پاک ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اس دنیا میں بھی اس دہین کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی جنت کی بے پایاں نعمتوں سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ یہی وہ لاکھ عمل ہیں جس نے عرب کے صحرائیوں کو قعر مذلت سے نکال کر ہم عروج تک پہنچایا۔ تاریخ اٹھ کر دیکھئے زندہ نزول قرآن میں پورا عرب کس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہاں کسی بڑائی سے جو قرآن پاک کے اولین مخاطبین میں نہ پائی جاتی تھی، وہ کوئی غیر فطری امتیاز ہے، جو میر و غازیب، ہفت ابرو، آقا و غلام، عربی و عجمی کی صورت میں موجود نہ تھا۔ منڈیوں میں عورتوں اور بچوں کی خبیث و ذہیزنت ہوتی تھی۔ بچوں کو زندہ گھر کر دیا جاتا تھا، وہ لوگ سیاسی نظم و نسق کے نام سے آشنا تھے، وہاں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی، نہ کوئی ضابطہ اور قانون تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ سرگشتا تھا کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھے، جنگل کا قانون رائج تھا اور جس کی لامٹی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

خداوند تعالیٰ نے یہ نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ لوگ جائز ناجائز، پاک، ناپاک اور طلال و حرام سے نا آشنا تھے، زنا، جوار، چرن، قتل و غارتگری کے دلدادہ تھے۔ ایک دلاش سے کوئی پردہ نہ تھا، ننگے طواف ہوتے، اخلاقی گویوٹ کا یہ حال تھا کہ باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے بہت پستی و ذلیلانہ تھے، توحید نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، طرح طرح کے توہمات

کاشکار تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعویدار اُن کی تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔
 پھر وہ وقت بھی آیا جب حضور نبی کریم ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی، نزولِ قرآن
 کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب اسی حوالہ کی پروردگار جابل اور نوازندہ قوم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو
 دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے لگام قوم دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی، قیصر و کسریٰ اس کے سامنے سرنگوں ہو
 گئے، اربابِ زمین و آسمان بن گئے۔ ————— پھر اور ڈاکو امین بن گئے، حسب و نسب پر فخر کرنے
 والے کالے کلوٹے بمبشی غلام کو سیدنا کہنے لگے، سیاست سے نابلد قوم۔ مہذب ترین قوموں کو سبق
 سکھانے لگی، ضرب و حرب کے وہ معرکے دکھائے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک
 اسلام کا پرچم بائیس لاکھ مربع میل پر لہرانے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں قرآنی تعلیمات کے ثمرات دنیا
 کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے، مگر مقامِ افسوس ہے کہ گذشتہ چند صدیوں سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل
 ہوتے، ایک ارب کی آبادی اور دنیا میں چالیس سے زیادہ ملکوں پر حکمرانی کے باوجود مسلمان قوم ذلت
 و سکنت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ قومیں جو ان کے نام سے کانپا کرتی تھیں، آج ان پر سلاطینِ مملکت
 شیر پادشہ کے دستِ نچو ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اسرائیل جیسا بڑا بھڑا جب چاہتا ہے ان کے محلے
 میں گھس کر انہیں شکار بنالیتا ہے۔ وجہ ظہر ہے۔ بقول علامہ اقبال:

دو معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر اور ہم خوار ہیں تارکِ قرآن ہو کر

جب سے مسلمانوں نے قرآن پاک کا دامن چھوڑا ہے، ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، مسلسل ناکامیوں
 کا شکار ہیں۔ بلاشبہ تمام غیر مسلم اقوام ملتِ واحدہ میں، اُن کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان قوم
 مغلوب اور ذلتی دستِ نچو بن کر رہے، اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ کسی طرح مسلمان قرآنِ کریم سے دستِ نچو
 ہو جائیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان قرآنی پروگرام پر عمل کر کے کبھی غلبہ نہیں آئے تھے اور اس پروگرام کے محسن جاننے سے ہی مغلوب
 ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت بھی وہ یہ کہتے تھے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ
 وَالْغَوْفِ بِهِ لَعْنَتُكُمْ تَقْبَحُونَ ۝ دیکھنا تمہارے کانوں میں قرآن کی آواز نہ پہنچے پائے۔ بلکہ
 خوب شرمیہ تاکہ کوئی دوسرا بھی سن کر اس کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ تمہاری کامیابی کا یہی راز ہے۔ آج
 جس وہ لوگ یہ نسخہ آزماتے ہیں مگر ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہیں، قرآن پاک کی تعلیمات سے بے بہرہ
 ہو چکے ہیں۔ یہ کلام مقدس بآبی صورت میں ترجمہ سے دور نہیں، ہم اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ

کر اپنے طاقتوں میں سجاتے ہیں، کبھی کبھی قنوت بھی کر لیتے، حسن قرأت کی مخلصی بھی جہاتے ہیں، مگر کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قرآن پاک سے دریافت کریں کہ تیرے نزل کا مقصد کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری قرآن پاک کے ادب و احترام تک ہی محدود ہے۔ اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا کسی اور قوم کا کام ہے۔ یاد رکھئے، اگر آج ہم نے قرآن پاک کو سینے سے نہ لگایا تو بارگاہ رب العزت میں کتنی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی جب خود رسول شکایت کریں گے۔ یَسْرِبُ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا یعنی اے مولا کریم! میری قوم نے قرآن پاک کو نظر انداز کر دیا تھا۔

قرآن پاک کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے مفسرین کرام نے ہر زمانے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ اور زبانی اور تحریری صورت میں قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ضرورت صرف ان لوگوں کی ہے جو قرآنی پروگرام کو لے کر اٹھیں اور دنیا میں ایک دفعہ پھر اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔

دوسرا قرآن کا یہ سلسلہ بھی اپنی بساط کے مطابق قرآن پاک کے علوم و معارف کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ آئیے ہم قرآن پاک کی آواز کو کانوں کے ذریعے دل میں جگہ دیں، اس پر غور فکر کر کے اس سے رہنمائی حاصل کریں اور پھر عمل پیرا ہو کر اپنا کھویا ہوا قار دوبارہ حاصل کر لیں، نہ صرف دنیا کو امن کا نسوار بنادیں بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا الْبَلَاغُ

الحمد للہ سلسلہ دوسرا قرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر جلد اول جو کہ سورۃ فاتحہ پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم پارہ اول مکمل پر مشتمل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسے کام کے لیے پوری زندگی وقف ہوئی ہے۔ کام وسیع اور کمشن ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کام کے لیے آج جس طرح وسائل میسر ہیں اور کارکنان کی پوری ٹیم جس طرح قرآن پاک کے ساتھ والہانہ محبت اور دلی لگاؤ کے ساتھ مصروف کار ہے، ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مہربانی سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے گا۔

اس جلد پر کام شروع کرتے وقت اس کی ضخامت کے متعلق تردد تھا کہ آیا یہ جلد پوری سورۃ بقرہ

پر مشتمل ہوگی یا اسے پارہ اول تک محدود کرنا پڑے گا۔
 — پارہ اول کے مسودے کی ضخامت اور اس پر صرف ہونے والے وقت کے پیش نظر آخری فیصلہ ہوا، کہ سورۃ بقرہ کو دو حصوں میں شائع کیا جائے، پہلا حصہ مکمل پارہ اول پر مشتمل ہو اور دوسرے حصہ میں پارہ دوم اور سورۃ کا بقیہ حصہ از پارہ سوم آجائے۔ یہیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور قارئین کو اندازے سے کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑا اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے پائے پر کام جاری ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے۔ کہ سورۃ بقرہ کے ہر دو حصے تقریباً برابر برابر ضخامت کے ہوں گے۔ اور اس کے بعد ہر جلد ایک یا ایک سے زائد مکمل سورتوں پر مشتمل ہو کر گی اس طریقے سے ہر جلد مکمل پارہ جات پر مشتمل تو نہیں ہوگی، تاہم مکمل سورتیں اس میں آسکیں گی اسف صالحین نے اسی طریقہ کو اپنہ فرمایا ہے۔

اگرچہ وقت کے لحاظ سے تو نہیں مگر کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ کام جس قدر وسیع اور کٹھن ہے، اس کے لیے اُسی قدر مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اسے مزید وقت دیا جائے تاکہ ہر آمدہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں کم سے کم ہو سکیں، قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلہ اشاعت سے وابستہ جملہ کارکنان خصوصاً صوفی صاحب محترم کی درازی عمر اور صحت اور اس عظیم کام پر استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

الحاج، لعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)
 شالامار ٹاؤن، لاہور

سخنہائے گھنٹی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاۡہِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَاَزْوَاجِهِ وَاتَّبَاعِهِ
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

• خیر اُمّت: کا خطاب پانے والی قوم آن جس قدر دیگر گروں حالات، ہستی اور
تہ تنزل کے جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی گوش شنوا اور چشم بینا سے مخفی نہیں۔ اعمال و
اخلاق اسلام کی قید سے تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ایسا دہمردی، مشترک اجتماعی مقاصد اور ملی ترقی کی
کوشش کے بجائے، نفس پرستی، خود غرضی، اور ذاتی حقوق مقصد حیات بن چکا ہے، دفتروں میں
عزت کی غمویت اور استیصال اس قدر عام ہے کہ پناہ بجا ہر دولت والا شخص جس کی عزت پر چاہے ہاتھ ڈالے
اور کمزور آدمی کے لیے جائز حقوق کا حصول بھی تقریباً ناممکن ہے اور حصول انصاف حقا ہے۔ دوسروں کو
پچائی کا سبق دینے والی قوم نے آج خود جھوٹ کو روزی کھانے کا ذریعہ بنالیا ہے، عریانی و فحاشی عروج پر
ہے، فرقہ وارانہ کشمکش، فوجی استبداد، مارشل لا کی طاغوتی حکومتیں، جدید آلات و انکشافات کا غلط استعمال
تصویری فتنہ، مد سے زیادہ آرام طلبی اور رفاہیت بانغہ کا فادہ، کھیل و تماشا کی کثرت، اسلام کو اپنے
غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا، ملوکیت کی عشرت پسندیاں، اسراف اور بدعت طرازیوں، اللہ تعالیٰ
کی کتاب کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلیں، رسم و بدعت کی فراوانی، اور دھوکا بازی اور فریب دہی
میں دوسری تمام قوموں کو مات کر دیا ہے۔ اور ان کے ماضی کا تمام ریکارڈ توڑ دیا ہے، قوم کی دیانت،

شرافت، صداقت اور امانت کا حال کسی سے مخفی نہیں، اِنَّكَ الصُّوْرَةُ مَوْجِدَةٌ اِنْ حَوَتْ دِمَامَ مُسْکَانَ اَپْسِیْنَ
 بھائی بھائی میں) کی تعلیم پانے والی قوم کے ممالک اور افراد آپس میں نبرد آزما ہیں۔ آئے دن قتل میں اضافہ، گھر
 کے اندر عزت اور باہر جان محفوظ نہیں، اشتراکیت، سرمایہ داری کی لعنت کے عروج، بھائییت، ایسوی
 ازم کی تباہ کاریوں، بند و ازم کی تنگ نظری سے متاثرہ قوم، زبان پر اسلام اسلام اور عمل اس کے برعکس
 اور اسلام کی میٹھ میں ایک زہر آلود خنجر ہے۔

بائیں ہمہ مسلم معاشرہ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں۔ جو کہ صحیح معنوں میں قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہونا
 چاہتے ہیں۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تمنا رکھتے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے ساتھ
 دلی ہمدردی اور ان کی اس حالت زار پر درد دل رکھنے والے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔
 کہ وہ ان کو صحیح قرآنی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

بچہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا صفوی عبد الحمید صاحب دمام مجاہد کا انداز بیان سادہ اور دلپند ہے۔ قمیس، بناوٹ
 اور تکلف سے دور لیکن پُر مغز، جامع اور مسلک سلف کے مطابق منشا قرآن کا صحیح منظر ہے۔ اور داعی الی اللہ
 برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے کیا۔
 اس کے بعد شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر نے اردو میں بے حد مفید ترجمے کیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے
 حکیمانہ تفسیر لکھی۔ اور دیگر بزرگان دین نے بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ متأخرین میں
 حضرت تھانویؒ، کا بیان القرآن، حضرت شیخ الحداد کا ترجمہ اور تفسیر، تفسیر عثمانی اور حضرت لاہوریؒ کا ترجمہ
 حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن اور اس قسم کے دیگر تراجم اور تفسیر مستند اور ہر اعتبار سے
 سے خلق خدا کے لیے نافع ہیں۔ اور دل میں کلام الہی پر عمل کا سچا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں۔

معالم العرفان فی درکس القرآن بھی اسی پاکیزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور چند وجوہ کے اعتبار
 سے ممتاز بھی ہے۔ عام فہم طرز، انداز بیان میں مخاطبین کے ذہنوں کا لحاظ، واقعات کا سلسلہ انتہائی مربوط
 اور دور حاضر کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی رعایت، مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی واضح نشاندہی، تفسیری
 سلسلہ کے شبہات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے شبہات کا بڑے لطیف انداز میں
 حل تحقیق کے نام پر تحریر کرنے والوں اور جدت پسند حضرات کی ٹھوکروں کی نشاندہی، سیاسی، اقتصادی،
 معاشی، فقہی مسائل اور جدید دور کے مسائل کی انجھی ہوئی گتھیوں کا قرآن و سنت اور سلف صالحین کے

مسک کے مطابق لکھا ہوا تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مغتربین سلف اور ان کی کتب کا تعارف، حفظ و نقلی اور تصوف کا افادی پہلو، ویسے بھی حضرت صوفی صاحب دہم مجہد کا نام نامی ہی کسی کتاب کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔

آج کل مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے بڑی پر زور کوششیں ہو رہی ہیں۔ تقاریر، جلسے، اخباری مضامین، لٹریچر، مباحثے، پیچھے اور تصنیفات کے ذریعے باہمی اتفاق پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں جو چیز اتفاق کی جڑ ہے۔ اور ہر کوئی ترجیح نہیں کرتا۔ یعنی مخالفت پر تنقید میں نہ اعتدال سے تجاوز، آپس کے اختلافات کی شدت اور ایک درس سے بعد کا ایک بست بڑا سبب زبان کی درشتی اور تیزی ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ دروس القرآن میں باطل مذہب کی پوری پوری تردید، اور کمرہ فرقوں کے غلط عقائد و مسائل اور نظریات پر نئے ششہ انداز میں تنقید ہے۔ لیکن اعتدال کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور عام آدمی پر بھی حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن و سنت کا صحیح مشاہدہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور حق کا تلاشی حق کو پا لیتا ہے۔

سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے باقرہ میں ہے۔ اس سے پیشتر سورۃ فاتحہ پر مشتمل جلد اول شائع ہو چکی ہے۔ یہ جلد سورۃ بقرہ کے سولہ رکعات یعنی پورا آلہ پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ میں سینکڑوں مضامین بیان ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا سرکاری مضمون یہود کے غلط عقائد کا بیان اور ان کی تردید، ان کی خباثت اور تنزیل کے اسباب، ان کی سیاہی غلطیاں اور روحانی بیماریاں اور ان کی اوصاف ہے۔ امت مسلمہ بھی آج انہیں حالات سے دوچار ہے۔ جس میں بنی اسرائیل تھے۔ مگر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حالات کی پیشین گوئی آج سے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔ لَبَّائِتَيْنَ عَلٰی اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰی عَلٰی اَبْنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَلْبَتَّ مَزْدَرِیْمِیْنِ اَمْتُ پُرِیْ اِیَّا کُورِیْ کَحَذُوْ الثَّقَلِیْنِ اَلنَّعْلِیْنِ رَزْمَکُمَا

جس طرن بنی اسرائیل پر آیا جیسا کہ جوتے کے ساتھ جوتا ملے۔ تو اس طرن آن کے جملہ مسائل کا حل بھی صرف اور صرف قرآن پاک میں ہی ہے۔ قرآن پاک کا مشہور دہم دیکھنے اور اذہان کو کتاب الہی کے قریب تر کرنے کے لیے دروس القرآن یقیناً بہترین رہنما ہو چکی ہے۔ علماء، طلباء، خطباء اور خواہم بلکہ ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہے۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ عام فہم، سلیس اردو اور معنی خیز ترجمہ بھی سامنے آ رہا ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دہم مجہد اور انجمن مجاہد شاعت قرآن کے جملہ اراکین جو کہ دروس القرآن کی طباعت اور ان دروس کو کیسٹوں

کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب
ایم اے علوم اسلامیہ اور اس میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے ان کی اس سعی کو قبول
فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط

محمد اشرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

۵ صفحہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء



آلۃ
درس اول

البقرة
(آیت ۲۸۱)

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَكِّيَّةٌ نَبِيَّتُهَا هَاشِمَانِ وَسِتٌّ وَأَمْنُونُ آيَتُهُ الْبَعُورُ ذِكْرُهَا
سورة بقرہ مدنی ہے اور یہ دو سو چھیالیسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

آلۃ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ترجمہ۔ آلۃ ① یہ کتاب، سبب شک اس میں بے راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ②
سورة کے موضوع اور نام سے پہلے قرآن کریم کی سورتوں سے متعلق چند بنیادی باتوں
کا ذکر ضروری ہے، اس کے بعد سورة بقرہ کے نام کے بارے میں کچھ بیان ہوگا۔

لفظ سورة س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے قِطْعَةٌ مِّنَ الْاٰیٰتِ
یعنی آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ گویا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو
اسے سورة کہا جاتا ہے۔ کسی سورة کے لیے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ
سورة غفر، سورة کوثر اور سورة نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورة بقرہ سب سے لمبی سورة
ہے۔ اور اس کی دو سو چھیالیسی آیات ہیں۔

سورة اور
آیت

سورة کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی
طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے
جیسے اَللّٰہُ یا حَمْدٌ۔ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے۔ ق۔ ن وغیرہ اور
بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورة مزمل کے
دو رکوع والی آیت ہے۔

آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ
آیت کے
مختلف معانی

ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: لَا آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ اس میں عقلمندوں کے لیے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ روم میں فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ مِنَ الرَّحْمَةِ إِنَّكُمْ فِيهَا لَمُبْلَوُونَ۔ اللہ تعالیٰ کے دلائل قدرت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔

قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا: كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ مَضَىٰ أَمَّا لِقَوْمٍ يُكَفِّرُونَ كَذَلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا، یُضَوُّونَ فِي مَسْكِنِهِمْ۔ جو اپنے مکانات میں چلتے پھرتے تھے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ اَسْمٰی میں درس عبرت ہے۔ اسی طرح آیت کو معجزے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے معجزات پیش کئے۔ جن کا مطالبہ قوم کے لوگ کرتے تھے۔ سورۃ رعد میں دو مقامات پر آیا ہے: وَلَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اَلَا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا آيَةٌ مِنْ رَّبِّنَا۔ کفار کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا گویا آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔

آیت کا معنی حکم بھی آتا ہے۔ جیسے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ عِلْمَ اللّٰهِ عَلَيْنَا۔ جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں فرمایا: وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ اور ہمارے احکام سے کافر ہی انکار کرتے ہیں۔

تاہم ان تمام تر معانی کے باوجود جب آیت کا لفظ سورۃ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی سورۃ کا ایک حصہ یا جزو ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات مل کر سورۃ ترتیب پاتی ہے جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا، قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ بقرہ ہے۔ پھر آل عمران اور سورۃ نساء ہے۔ یہ ترتیب اجتہادی نہیں بلکہ توفیقی ہے۔ یعنی یہ ترتیب صحابہ کرامؓ کی دی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ

سورتوں اور آیتوں
کی ترتیب

حضور علیہ السلام کی مقرر کردہ ترتیب ہے۔ اسی طرح ہر سورۃ میں آیات کی جو ترتیب ہے مثلاً
 پہلے الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور پھر
 هٰذَا یَوْمَ الدِّیْنِ یہ ترتیب بھی تو قسفی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **صَلُّوا هَذِهِ
 الْاٰیَةَ فِی السُّورَةِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْهَا کَذٰوْکَذًا** یعنی اس آیت کو فلاں مقام پر
 رکھ دو، تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق آیات کو ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اپنی
 طرف سے آگے پیچھے نہیں کیا۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کی۔ حدیث
 میں عبات طور پر آتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے: اے
 فلاں مقام پر رکھ دو۔ تو صحابہ کرامؓ ویسے ہی کرتے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق کچھ اختلاف
 پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین محققین فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 قطعی فرمان نہیں ہے تاہم مہمور کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد کے
 مطابق ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہی موجودہ ترتیب
 کو قائم کیا۔

سورتوں کے اقام
 بطاخط طوالت

قرآن پاک کی پہلی سات سورتوں یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ یونس تک کو
 سبع طوال یعنی سات لمبی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چودھویں پائے میں سورۃ نحل تک
 کو ثانی یعنی طوال کے بعد دوسرے نمبر والی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد حجرات تک کی سورتوں
 کو تیسری کہا جاتا ہے۔ مبین سے مراد وہ سورتیں ہیں جو کم و بیش ایک سو آیات پر مشتمل ہوں
 اس کے بعد واناس تک سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ آگے مفصلات کے بھی تین گروپ
 ہیں۔ حجرات سے لیکر سورۃ بروج تک کو طوال مفصل بروج سے لے کر سورۃ جینہ تک کو سادہ

۱۔ تفسیر اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ص ۶۲ مطبوعہ سید اکیڈمی لاہور۔

۲۔ تفسیر اتقان ص ۶۱ ۳۔ ترمذی ص ۴۴۔

۴۔ ترمذی ص ۴۴، تفسیر اتقان ص ۶۱ مسند احمد ص ۱۰۲، متذکر حاکم ص ۲۳۔

۵۔ روح المعانی ص ۶۲ ۶۔ روح المعانی ص ۶۱۔

مفصل اور پھر آخر تک کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ قصار کا معنی چھوٹی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے ناموں کی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی حروف ہیں ق۔ ص۔ ط۔ یس وغیرہ بعض سورتوں کے اسماء ان کے پہلی آیت کے کسی لفظ پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے سورۃ کوثر کا نام اس کی پہلی آیت اِنَّا اَعْصَيْنَا الْكَوْثَرَ سے لیا گیا ہے۔ کسی سورۃ کا نام اس سورۃ میں مذکور مشہور واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جیسے بقرہ کہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اسراء میں معراج کا واقعہ آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں اعراف کا واقعہ ہے۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ سورۃ الاعراف کا نام بھی واقعہ اعراف کی وجہ سے ہے۔ سورۃ یونس کا نام یونس اس لیے ہے کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

زمانہ نزول کے لحاظ سے سورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی مکی اور مدنی سورتیں جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں ورنہ کہلاتی ہیں۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران نازل ہوئیں یا طائف میں یا کسی اور سفر کے دوران۔ مدنی سورتیں وہ ہیں، جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد جو بھی سورتیں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ قیام مدینہ کے دوران یا تبوک یا خیبر یا کسی اور مقام پر وہ سب مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے زمان و مکان کے لحاظ سے کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جو سورۃ حصہ یعنی اقامت کی حالت میں نازل ہوئی۔ وہ مخفری کہلاتی ہے۔ اور جو سفر کی حالت میں اتری اس کو مخفری سورۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح رات کے وقت نازل ہونے والی سورۃ لیلیٰ اور دن کے وقت اترنے والی نہاری کہلاتی ہے۔

بعض سورتیں دفعۃً یعنی یکدم نازل ہوئی ہیں۔ ان کو دفعی سورتیں کہتے ہیں اور بعض سورتیں تدریجی کہلاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ کبھی چند آیتیں نازل ہو گئیں۔ پھر درمیان میں وقفہ آگیا پھر کچھ نازل ہو گئیں۔ یہ تدریجی سورتیں ہیں۔ بعض سورتیں ایسی ہیں جو کہلاتی تو مدنی ہیں مگر ان کے کچھ حصے مکی دور میں نازل ہوئے مثلاً

یہی سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔ مگر اَمَّنَ الرَّسُولُ سے لے کر آخر تک کی آیتیں مکی زندگی کا حصہ ہیں۔ مشہور روایت میں آتا ہے کہ معراج کے دوران حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین تحفے دیے گئے۔ یعنی پانچ نمازیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ اور ان لوگوں کے لیے خوشخبری جو شرک میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا معراج مکی زندگی میں ہو۔ لہذا یہ آخری آیتیں مکی زندگی کی ہیں۔ اگرچہ سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔

ترتیب تلاوت
کی حکمت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آئیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوع انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں۔ اور یہ عام طور پر مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر فیادنی عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے۔ تو گویا پہلے مدنی اور مکی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے۔ کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہو جائیں۔

فضیلت سورۃ

حدیث پاک میں سورۃ بقرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَعَابِرَ یعنی اپنے گھروں کو قبروں کی طرح سنان نہ بنالو۔ بلکہ وہاں نمازیں بھی پڑھا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا۔ وَإِنْ تَابَ الْبَيْتَ الَّذِي تَقْرَأُ الْبَقْرَةَ فِيهِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ یعنی جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہو۔ وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا، مسلم شریف کی روایت میں اس طرح آتا ہے يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَأَهْلِيهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ تَقْدِمُهُ سُورَةُ الْبَقْرَةِ وَأَنْ عُمَرَانِ يَعْنِي قِيَامَتِ كَيْفَ رُزِقَ الْقُرْآنُ پَاک اور اس کے اہل کو لایا جائے گا۔ ان کے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہوگی۔

نے منعم علیہم لوگوں کے بجز اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اسی طرح گمراہ لوگوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت کا ذکر دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے ساتھ آیا ہے ختم نبوت کا بیان ہے۔ اور وحی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے مکلف ہونے کا بیان ہے۔ اور پھر وحی الہی کی احتیاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے تمام تر مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر وحی الہی کی دستگیری کی ضرورت ہے۔

اس سورۃ میں عبرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کو بیان کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان کے فضائل کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے اسلاف پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان ہے۔ اور موجودہ بنی اسرائیل کی خباثتوں، شرارتوں، ان کے غدار اور ضد کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں قت ابراہیمی کا ذکر ہے۔ بیت اللہ شریف کے کعبہ ہونے کا ذکر ہے۔ تہذیب، امداد اور تعلیم کے ارکان، تدبیر منزل اور سیاست من کا ذکر ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں قوانین مملکت اور خلافت کبریٰ کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ امیر کیسا ہونا چاہیے۔ اور قوج کے لیے کیا قوانین ضروری ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی پہچان کرائی گئی ہے۔ سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخل کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کے قوانین کا بیان ہے۔ عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ معاشرتی امور سے متعلق نکاح، طلاق، قسم، ایلا وغیرہ کے احکام ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا بیان ہے۔ عقوبات میں قصاص اور دیت کے احکام ہیں۔ اصلاح معاشرہ، جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ، غرض اس سورۃ مبارکہ میں سینکڑوں ہزاروں مضامین بیان ہوئے ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔ بقرہ عام طور پر گائے کے لیے بولا جاتا ہے تاہم عربی زبان میں یہ لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر وضاحت کرنی ضروری ہو تو بیل کے لیے ثور کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جس بقرہ کا ذکر ہے کہ وہ نہر ہوا مادہ ہو۔

نام اور کوائف

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مردہ گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہو گیا تھا یا خود بخود ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر خود بخود زندہ ہو گیا۔ تو دوسرے سینکڑوں بزرگوں نے خود بخود کیوں نہیں زندہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ مردہ گائے کا گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوا، تو گائیں بھی بیمار ذبح ہوتی ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ ہر مرنے والے کو زندہ کرنے کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا وہ مردہ نہ تو خود بخود زندہ ہو گیا۔ اور نہ ہی مرنے والے کا گوشت لگانے سے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا۔ جو صانع اور قادر مطلق ہے۔ لہذا اللہ رب العزت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سمجھ میں آتی ہے۔ اور یہ سورۃ مبارکہ کی سب سے اہم بات ہے۔

ثبوت نبوت اس سورۃ میں دوسری اہم بات نبوت کا ثبوت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کا پتا لگانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ کامیاب ہوا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہو گئی جب ایک نبی کی نبوت ثابت ہو گئی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ نیز یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نبی کی بات کو بغیر تفتیش کے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس میں حیل و حجت نہیں کرنی چاہیے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے بتائے گئے طریقے میں حجان بن شریع شروع کر دی۔ کہ جس گائے کو ذبح کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ کیسی ہونی چاہیے اور اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے مطابق فوراً عمل کرتے ہوئے گائے ذبح کر دیتے، تو مسئلہ فوراً حل ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے اوپر جس قدر سختی کی، اُسی قدر قیدیں بڑھتی چلی گئیں۔

اس واقعہ میں تیسری اہم چیز استقامت ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عقیدے عمل اور اخلاق پر قائم رہے۔ اگر استقامت میں لغزش آجائے گی۔ تو کسی قسم کے فساد پیدا ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے آدمی کے قاتل نے اس جرم کا ارتکاب اس لیے کیا تھا۔ تاکہ مقتول کو راستے سے ہٹ کر چچا کا سارا مال حاصل کر لے۔ گویا اُس نے استقامت کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذمے ذلیل و بے ہوش کر دیا۔ معلوم ہوا کہ استقامت بڑی چیز ہے اس کو چھوڑنے سے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس واقعہ کی جو تعلیمات مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین اور ایمان کے راستے میں کوشش

اور جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جوانی کے عالم میں انسان کی عقل مغلوب ہوتی ہے۔ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس عمر میں اکثر لوگ مجاہدہ میں ناکام ہوتے ہیں۔ جب انسان پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ تو ظاہری قوتیں کمزور ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف حالت انسان کے قلب و ذہن میں سخت بوجھکی ہوتی ہے لہذا اس عمر میں بھی انسان مجاہدہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہذا اس کی بڑی اہمیت اور بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اس واقعہ کی پانچویں اہم چیز معاد یعنی حیات بعد الممات کا ثابت ہونا ہے۔ یہ پورا واقعہ معاد ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِكَ يُخَيِّرُ اللّٰهُ الْعَوَّلٰی یعنی جس طرح اس مُرُتے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، اسی طرح معاد میں سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

یہ تمام دین کے بنیادی اور اہم اصول ہیں۔ باقی چیزیں ان کے ضمن میں آتی ہیں اس ایک واقعہ میں خدا تعالیٰ نے دین کے بنیادی مسائل اور معارف سمجھائے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔

اس درس میں سورۃ بقرہ کے فضائل اور اس کے مجموعی مضامین کا مختصر بیان ہوا۔ ائمہ درس میں انشاء اللہ آلہ کے تعلق بیان کیا جائے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْعَمَّ ① ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②

تو عجب!! الْعَمَّ ① یہ کتاب میں شک اس میں۔ یہ راہنمائی کرتی ہے متقینوں کی ②

محکمات، متشابہات
مقطعات

گزشتہ درس میں سورۃ بقرہ کی فضیلت، اس کے نام اور اس کے موضوعات کا اجمالی تذکرہ ہوا تھا۔ اس درس میں حروف مقطعات میں سے الف، لام، میم کے متعلق بیان ہوگا۔

اصولی طور پر یہ بات معلوم کر لینی چاہیے کہ قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں۔ پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔ آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا معنی

تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں رَحْمَن عَرْش اور استوائی کے معانی معلوم ہیں۔ مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنی تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں جو قرآن پاک کی انیس سو تینوں کے ابتداء میں آتے ہیں۔ سورۃ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو الْعَمَّ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر ن، ص، ق، الراء، یس، طس وغیرہ کے حروف آتے ہیں۔ مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کا معنی واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

احکام فذوذی
لونا کی حکمتیں

تاہم ہر قسم کی آیات کے احکام پر ایمان لازماً ضروری ہے۔ خواہ ان احکام کی حکمتیں واضح ہوں یا غیر واضح۔ مثلاً نماز پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے مجبور کے سامنے تواضع کرتا ہے۔ اور اپنے منعم کا شکر ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ جو کہ عہدیت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات پیش کرنے کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اسی طرح روزہ کا مقصد نفس کو دبانا شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ تاکہ انسان میں تقویٰ کی روح پیدا ہو سکے۔ بھوک اور پیاس سے خواہشات نفسانی پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح حکمت ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس میں دو بڑی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مساکین کی حاجت پوری کی جاتی ہے تاکہ کوئی غریب بھوکا پیاسا نہ رہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان بخل کے مادہ سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نکالتا ہے گا اس میں بخل کی بجائے سخاوت کا وہ پیدا ہوگا۔ لہذا زکوٰۃ کی حکمت بھی واضح ہے۔

اب بعض احکام ایسے ہیں جن کی حکمتیں بڑی گہری ہیں۔ اور ہر آدمی انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً حج کے ارکان منجملہ ان کے بیت اللہ شریف کا طواف۔ منیٰ اور عرفات کا وقوف ہے۔ جہالت کی رہی ہے۔ ان احکام کی حکمتیں غامض اور دقیق ہیں۔ مگر ان پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مکلف کے لیے لازم ہے۔ اور جن احکام کی حکمت واضح نہیں۔ ان کے متعلق زیادہ کہہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان احکام کی ہر حالت میں تعمیل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ احکام آیات محکمات کے ہوں یا آیات متشابہات کے ہوں۔

حروف مقطعات
مغرب کی حکمت

اسی طرح حروف مقطعات کے بارے میں بھی زیادہ کہہ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں ہوا۔ جس نے حروف مقطعات کی کریمہ کی جو جس طرح حضور علیہ السلام نے فرما دی تھی اسے تسلیم کر لیا مگر بعض ذہین تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن حروف کے معانی ہی معلوم نہیں۔ ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ چنانچہ

صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی بعض علمی ذہن کے لوگ تھے۔ جو ان کے متعلق سوال کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں بھی بعض لوگوں نے ان الفاظ کے معانی پوچھے۔ بعض نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ تو انہوں نے تقریب ذہن یعنی ذہن کو قرآن کریم کے قریب کرنے کے لیے کچھ معانی بتا دیے۔ اس کے بعد دوسرے مفسرین کرام نے بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان الفاظ کے معانی بیان فرمائے مگر ان میں سے کوئی بھی معنی قطعی نہیں ہے۔ محض احتمال اور ظن غائب سے کچھ معانی بیان کر دیے ہیں تاکہ ذہن قرآن پاک سے مانوس رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے اقوال ملتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ

حضرت ابو جرحہؓ نے کافور شہ لِكُلِّ كِتَابٍ رِسْوَةٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی راز کی بات ہوتی ہے۔ یعنی ہر کتاب کی ہر چیز واضح نہیں ہوتی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز پوشیدہ بھی ہوتی ہے۔ جو عام انسانوں کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں وَرِسْوَةُ الْقُرْآنِ أَوَّلُ السُّورِ یعنی قرآن پاک کے اسرار اس کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ لِكُلِّ كِتَابٍ صَفْوَةٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی چھائی ہوئی یا منتخب بات ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی بات حروف تہجی السَّوَدِ وغیرہ ہیں۔ جنہیں ہر آدمی کا سمجھنا ضروری نہیں۔

حضرت علیؓ

حضرت ام شجیہؓ

ام عامر بن شرجیل المعروف شعیؓ نے پانچ سو صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ اور ان سے علم حاصل کیا ہے۔ آپ ام ابیانیفہؓ کے استاذ ہیں۔ جب آپ سے حروف مقطعات کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا رِسْوَةُ اللَّهِ فَلَا تَطْلُبُوا یہ اللہ کے راز ہیں۔ ان کے پیچھے مت پڑو۔ جو کتاب ہے تم انہیں سمجھنے میں ناکام رہو اور کسی غلط چیز میں مبتلا ہو جاؤ۔ لہذا تم انہیں صرف پڑھ لیا کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے ہر حرف کی تلاوت پر

منہ تفسیر عزیزی ۱۰۰، تفسیر کبیر ص ۲۴۰
 ۱۰ تفسیر عزیزی ص ۱۰۰، تفسیر کبیر ص ۲۴۰
 ۱۰ تفسیر عزیزی ص ۱۰۰، تفسیر کبیر ص ۲۴۰

دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔ جو مومن ان حدود کو پڑھے گا۔ اُسے تیس نیکیاں حاصل ہوں گی یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہذا اُن کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔

امام رازیؒ پچھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بڑے عظیم مفسر قرآن گزے ہیں۔ جس صحنہ میں
 صدی میں امام ابن جریر طبریؒ اور چوتھی صدی میں ابو جبر جصاصؒ ہوئے ہیں اسی طرح آپ کا مقام
 تھا ابو جبر جصاصؒ معنی تھے۔ اور امام رازیؒ شافعی تھے۔ امام ابن جریرؒ خود مجتہد صاحب مذہب تھے۔
 اور کسی کے مقلد نہیں تھے۔ ابو جبر جصاصؒ نے صرف احکام کی تفسیر کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کی صرف
 ان آیات کی تفسیر لکھی ہے جن میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ البتہ امام رازیؒ نے چھیتر سو پارے
 تک مکمل تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ چنانچہ بقیہ تفسیر آپ کے نہایت قابل
 شاگردوں نے کی۔ اس تفسیر کی آخری دو جلدیں امام رازیؒ کی اپنی تالیف نہیں۔ بلکہ آپ کے تلامذہ
 کی ہے۔ ان آخری جلدوں کا مقابلہ پہلی جلدوں کے ساتھ کرتے ہیں، تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا
 اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ شرف عطا فرمایا۔

حدود مقطعات کے متعلق امام رازیؒ کا قول یہ ہے کہ آلۃ سورۃ بقرہ کا دوسرا
 نام ہے۔ ایک نام بقرہ ہے۔ اور دوسرا آلۃ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آلۃ اور دیگر حدود مقطعات کہلیعص، حۃ
 عسق وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک ہیں۔ امام رازیؒ نے ایک ہدایت ذکر کی ہے۔
 کہ اللہ تعالیٰ کے چھ ہزار نام ہیں۔ اس نے اپنے تمام نام آسمانی کتابوں میں نازل فرمائے ہیں۔
 سوائے ایک کے جو اُس نے محسوس کر لیا ہے۔ اور کسی کو نہیں بتایا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ آلۃ
 جل اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسا کہ حۃ کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے
 لکھا ہے تَذَكِّرُنِي خَيْرًا مِنَ الرِّيحِ شَلْجَبًا وَوَحْشًا کا واسطہ ہے کہ کتاب ہے۔ کہ لڑائی
 چھوڑ دو۔ وہاں تِلَاخًا حۃ قَبْلَ التَّقْدِيرِ۔

مقطعات
 اسمائے الٰہی ہیں

۱۔ تفسیر کبیرہ ص ۲۱
 ۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۶۹

۱۔ تفسیر کبیرہ ص ۲۱
 ۲۔ تفسیر کبیرہ ص ۶۹

اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ اب جب کہ نیزے کھٹک رہے ہیں۔ اب واسطہ پیش کرتا ہے۔ ح کا واسطہ پہلے کیوں نہ دیا تاکہ ہم لڑائی شروع نہ کرتے۔ اب ہم لڑائی نہیں چھوڑ سکتے اس مقولہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ح جو حروف مقطعات میں سے ہے یہ اللہ کا نام ہے۔

بعض اس کی توجہ یوں کرتے ہیں کہ حروف مقطعات اللہ کا پورا نام نہیں بلکہ بعض اسماء کی طرف اشارات میں مثلاً الف کا اشارہ اس کے ذاتی نام اللہ کی طرف ہے۔ ل سے مراد رحمن ہے۔ اور اسی طرح لک کا اشارہ کافی کی طرف ہے ل کا اشارہ اکم لطیف کی طرف ہے۔ اور ہ سے مراد مالک اور اکم مجید ہے۔

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات قرآن پاک کے نام ہیں جیسے ح لیس۔ ا وغیرہ۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتب الفوز البکیر، خیر کثیر، اور ہوامع میں حروف مقطعات پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طہ پر یہ فہم دیا ہے۔ کہ جس سورۃ کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں اس سورۃ کا خلاصہ اور عنوان ان حروف میں مذکور ہے۔ ان حروف سے سورۃ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی شخص کے لیے مفتی، قاضی، امیر سلطان یا حاکم وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یا اس طرح سمجھ لیں۔ جیسے تعلیمی ڈگری بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی، ڈاکٹر (ڈاکٹر آف لٹریچر) وغیرہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت کی علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح حروف مقطعات کے ذریعے کسی سورۃ کا خلاصہ یا اس کی سرخی بیان کی جاتی ہے۔

مقطعات
اسمائے قرآنی میں

امام مہر دتیسری صدی کے بڑے صوفی، انجمنی اور لغت و ادب کے امام تھے آپکی مشہور کتاب "کامل ہے" وہ فرماتے ہیں کہ "ان فیصح و یبلغ حروف مقطعات میں جیلج ہے"

مقطعات
بحیثیت جیلج

۱۰ تفسیر طبری ص ۱۰۰ تفسیر کبیر ص ۲۰

۱۱ تفسیر طبری ص ۱۰۰ تفسیر کبیر ص ۲۰

۱۲ تفسیر کبیر ص ۲۰

۱۳ الفوز البکیر ص ۱۰۰ مطبوعہ لاہور

کہ اے دنیا والو! یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہی حروف میں قرآن پاک نازل کیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے: **فَالْتَوُوا سُورَةَ مِّنْ مِّثْلِهِ** تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ اگر تم بھی ایسا کر سکو تو مان لیں گے کہ قرآن بھی خدا تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے۔

عربی زبان بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ نزول قرآن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان کی ترقی شروع ہوئی اور اس عرصہ میں وہ اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ عرب لوگ اس زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ غیر عربوں کو بھی یعنی گونگے کہتے تھے۔ عربی زبان کا شعر و ادب کا ذخیرہ کمال درجے کا ہے۔ ہمارے درسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اسی ترقی یافتہ زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا ہے **قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا اہم اور استاذ بنایا تھا۔ انہی اہل زبان کے سامنے الٰہ کھلیج کا چیلنج پیش کیا گیا۔ کہ اگر کوئی ہے تو اس جیسا کلام بنا کر لائے۔ مگر کوئی بھی اہل زبان اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔

اہم اخفش: اور مفسر تغیر غازی کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حروف مقطعات قسم کے معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔

بعض فرماتے ہیں کہ ان حروف کو قرآن کے انقطاع کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ **غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ** پر ختم ہوئی۔ تو دوسرا کلام شروع کرنے کے لیے **الْحَمْدُ لِلّٰہِ** لایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے زمانے میں ہی بحث و تمحیص کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔ جو اس قسم کے معاملات میں تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ آپ سے **الْحَمْدُ** کا معنی دریافت کیا گیا۔ تو فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **اِنَّا اللّٰهُ عَلَمٌ**

یعنی میں تمہارا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ گویا آسے مراد اَنَا لَے مراد اللہ اور م سے مراد اَعْلَمُ ہے۔ اسی طرح اَلْقَصَص سے مراد اَنَا اللہ اَفْقَح ہے یعنی میں تمہارا اللہ ہوں، جو تمہارے لیے ہر چیز تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ اَلْاَل کا مطلب ہے اَنَا اللہ اُرَی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر بات کو دیکھتا ہوں۔

امام ماوردیؒ
کی تحقیق

امام ماوردی صاحب احکام السلطانہ پندرہ زمانے کے بہت بڑے محقق ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اَلْقَصَص کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلْعَرَبِکُمْ اور اس کی تفصیل ہے نَزَّلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں۔ اَلْقَصَص کا معنی اَقْلُ لَزِیْمٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ذَلِکَ الْکِتَابُ یعنی ایمانداروں کے لیے اولین ضروری چیز یہ کتاب ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہدایت کا منبع و مرکز یہی کتاب ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آسے مراد اللہ ہے۔ ل سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے اور م سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

شیخ ابن عربیؒ
کا قول

شیخ ابن عربیؒ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کل وجود خداوند تعالیٰ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام درمیان میں ایک واسطہ ہے۔ جو اللہ سے فیض لے کر اُدھر پہنچاتا ہے۔ اور آخر الوجود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان تک فیض پہنچانے کا واسطہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَلْقَصَص میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے انسانیت کی تکمیل کے لیے ذَلِکَ الْکِتَابُ لَزِیْمٌ فِیْہِ اس عظیم کتاب کو نازل فرمایا۔

۱۔ تفسیر کبیر ص ۲۱

۲۔

۳۔ احکام القرآن شیخ ابن عربیؒ ص ۵

۴۔ تفسیر کبیر ص ۲۱

بعض فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کی تلاوت کی جانی چاہیے تاکہ برکت اور ثواب حاصل ہو۔ خواہ اس کا مطلب سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ تاہم ثواب تو ہر ایماندار کو حاصل ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ایک معجزہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام تو اُمی ہیں۔ آپ نے کوئی نوشتہ و خوانہ نہیں کی جب تک کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے، ایک اُمی حروف تہجی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کے اُمی ہونے کے باوجود ان الفاظ کا پڑھنا ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔ حالانکہ نہ آپ نے کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اور نہ کسی استاد سے پڑھا۔ لہذا اس معجزے کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حروف مقطعات نازل فرمائے۔

اہم بیضاوی ساؤلچمدنی کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیروں میں اہم صاحب کی تفسیر سب اہم ہے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا۔ آپ اللہ کی تائید اس طرح کرتے ہیں کہ حرف الف حلق کے انتہائی آخری حصے سے نکلتا ہے۔ لام درمیان سے م ہونٹوں سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ حروف آخر، اوسط اور ابتداء کی حصے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے کلام کی ابتداء اوسط اور آخر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہونی چاہیے۔ گویا اہم بیضاوی نے حروف اللہ کو اللہ کے ذکر کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ کا قول

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے کشفی اور ذوقی طور پر معلوم ہوا ہے کہ اللہ کا مطلب وہ غیر مادی فیض مجرب ہے۔ جو اس مادی اور متحیر مکان والے عالم میں آکر مقید ہو گیا ہے اور لوگوں کے ادب اور علوم وغیرہ کے مطابق ان کی سنگدلی سے متصادم ہے۔ یہ فیض مجرب اعمال فاسدہ، اقوال کاسدہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اور بہ عادت اور اخلاق ردیہ کا رد کرتا ہے۔ یہ اللہ تشریع اور تحقیق قدسی پیش کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ساری سورۃ بقرہ میں اللہ کا یہی اجمالی معنی نظر آتا ہے۔ اس سورۃ میں

۱۔ تفسیر درخوردی ص ۲۲ بیضاوی ص ۱

۲۔ تفسیر مظہری ص ۱۲ تفسیر غزالی قادی ص ۱۲

۳۔ تفسیر بیضاوی ص ۱

۴۔ الفہم البکیر ص ۸۲ مطبوعہ کراچی

لوگوں کی نگاہ دلی کا مقابلہ، قوانین کی تشریح اور تحقیق اور بُرے اقوال و عہدہ اور بُرے اخلاق کی اصلاح کے متعلق ہی مضامین پائے جاتے ہیں۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ الف کا اشارہ استقامت علی الشریعہ کی طرف ہے۔ اِنَّ
الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا یعنی شریعت پر استقامت اختیار کرنی
چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ لام کا اشارہ مجاہدہ کی طرف ہے۔ یعنی وہ چیز جو ریاضت اور مجاہدہ کرنے
سے حاصل ہو۔ جیسے ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلًا“
یعنی جو لوگ ہماری طرف مجاہدہ کریں گے۔ ہم ضرور ان کو راہ بتلائیں گے۔ اسی طرح حرف میم میں
یہ اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجزن ہونی چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب
کا تفسیر

مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفسیر تفسیر القرآن میں ایک نہایت ہی غلط بات لکھی
ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ الہ کا معنی پہلے زمانے میں معلوم تھا مگر بعد میں سارے لوگ بھول
گئے۔ اسکا مطلب یہ کہ کچھ لوگ ایسے معانی جانتے تھے بعد میں سارے لوگ بھول گئے۔ یہ تو بالکل ہی غلط بات ذکر کر دی
کہ کسی کو بھی اسکا معنی نہ آتا ہو۔ مفسرین کو کہنے جو معانی بیان کیے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

مفسر فراہی
کا قول

مفسر قرآن فراہی کہتے ہیں کہ قدیم مصری زبان میں الف کو سر کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔
بعض زبانوں میں حروف جانور یا درخت کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ ایسے الف کے دو معنی استعمال
ہوتے تھے۔ ایک معنی لگائے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سورۃ کو گائے کے ساتھ مناسبت ہے
کیونکہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ الف کا دوسرا معنی اللہ وعدہ لا شریک ہے۔
تو فراہی لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حروف اس محاورے کے مطابق استعمال کیے
گئے ہوں۔

حرف آخر

اہم جلال الدین سیوطی اور بہت سے مفسرین آخری بات یہ فرماتے ہیں گئے۔ اَللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمُرَادِهِ کہ الہام دیگر حروف مقطعات کی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اَمَّا بِذَلِكَ وَصَدَّقْنَا بِهْمِ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں
 ہمارے عقل ناقص ہے۔ لہذا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے معانی ضرور ہی معلوم کر سکیں۔ اس کا
 احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیے۔ کہ ان حروف سے
 اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔
 اَمَّا وَصَدَّقْنَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الحزب الاول

جمع

عند الغفرین

الْعَمَّ ① ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُ
يُنْفِقُونَ ③ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِمَّا
أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ④ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ⑤ أُولَٰئِكَ
عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ⑥ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑦

ترجمہ: ① الْعَمَّ یہ کتاب۔ نہیں شک اس میں۔ یہ رہنمائی کرتی
ہے متقینوں کی ② جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو۔ اور
جو روزی ہم نے ان کو دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ اور
وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اُس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس چیز
پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ④ یہی
لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ مراد کر پیچنے
والے ہیں۔ ⑤

لفظ ذلک
کی حکمت

عربی میں ذلک اشارہ بعید کے لیے اور هذا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے
یہاں پر گفتگو اس کتاب یعنی قرآن پاک کے لیے ہو رہی ہے۔ لہذا اہم اشارہ هذا
استعمال ہونا چاہیے تھا۔ یعنی یہ کتاب۔ نہ کہ ذلک یعنی وہ کتاب۔ اس اشکال کے متعلق مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر اشارہ بعید استعمال کرنے کا مقصد اس کتاب کی عظمت اور شان

لے تفسیر بن المعالی ج ۱۰، تفسیر عزیزی خدی شک پارہ ۱

کا اظہار ہے۔ لہذا ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا معنی یہ ہو گا۔ کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اپنے کمال حقائق و دقائق، اسرار اور درجے کی بندی کی وجہ سے مخاطبین کے فہم سے غائب اور انسانی افکار کی توانائیوں سے بہت بلند ہے لہذا اس کے لیے ذٰلِكَ کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام ایک دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں میں قرآن پاک کے متعلق پیش گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ میں تیرے بھائیوں میں سے تیرے جیسا ایک بنی برپا کروں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ اور وہ کلام ہی وحی الہی قرآن پاک ہے۔ تو یہاں پر ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا معنی ہے کہ یہ وہی کتاب ہے۔ جس کی پیش گوئی پہلی کتابوں میں کی گئی تھی۔

یا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جسے پہلے لوح محفوظ سے بیت العزت میں نقل کیا گیا۔ اور پھر وہاں سے تیس سال کے عرصہ میں بدریج بنی علیہ السلام پر نازل کیا گیا یا وہ ہے کہ بیت العزت آسمانوں میں ایک مقام ہے۔ جہاں پر قرآن پاک اود بیک وقت منتقل کیا گیا تھا۔

لَا رَيْبَ فِيهِ
کا مضمون

لَا رَيْبَ فِيهِ کا عام فہم معنی یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ نہیں یعنی چاہیے کہ کوئی دوسرا شخص اس کلام میں شک و شبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بلاشبہ کفار و مشرکین قرآن پاک کی صداقت پر شک کرتے تھے۔ اسی لیے تو تیسرے رکوع میں ان لوگوں کی جیسلیج کیا۔ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا یعنی اگر تمہیں اس چیز میں کوئی شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بند پر اتاری ہے۔ فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ مَن تَوَّاس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ تمہاری قابلیت کا پتہ چل جائے گا مطلب یہ کہ مشرکین کو لازم اس کلام میں شک کرتے تھے۔ تو یہاں پر لَا رَيْبَ کا معنی یہ ہے کہ واقعہ اور نفس الامر میں اس کلام میں شک و شبہ والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی شک کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی اور دماغ کی غامی ہے۔ وہ شخص تعصب اور عناد کی وجہ سے شک کرتا ہے۔ ورنہ اس کتاب

میں تو کوئی غامی نہیں۔

حضرت شیخ المنہ
کی تفسیر

شیخ المنہ مولانا محمود الحسن فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اُس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز میں تو کوئی شک و شبہ یا نقص نہیں ہوتا مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اُسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک و شبہ سے پاک ہے۔ اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلاف واقعہ چیز ہے۔ یہ تو محض شک کرنے والے کے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے۔ مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے، آج کل کے محدوں کے ذہن بھی پر اگندہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں۔ بلکہ یہ تو مبینع رشد و ہدایت ہے۔

حضرت مولانا شیخ المنہ برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں یہ میرٹھ کے پاس انہیں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ آپسے، ٹاکی جیل میں اسیری کے دوران کیا تھا۔ تقریباً دو سو توں کا حاشیہ بھی لکھا تھا مگر زندگی کے یام پوسٹ ہو گئے۔ حاشیہ کا باقی بھر آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ ہی کی سب مشا انجام دیا۔ آپ کا کیا ہوا ترجمہ قرآن با محاورہ ہے۔ اور بلند ترین ترانہ میں سے ہے۔

قرآن پاک کے اردو ترجمے بہت سے بزرگوں نے کیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا ہے۔ یہ سب آسان لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے ذریعے الفاظ کے معانی سمجھنا نہایت سہل ہے۔

آپ کے بعد دوسرا محاورہ اردو ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی کا ہے۔ یہ بہترین با محاورہ ترجمہ ہے آج تک علماء اہل اہل ترجمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ شیخ المنہ

۱۔ ترجمہ قرآن ۲۔ مطبوعہ دارالتبلیغ دہلی

۳۔ صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی کے پاس دوران درس

کا ترجمہ پھر حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ آپ نے قرآن پاک کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فن تجوید کے متعلق اور پھر ربط کے بارے میں، اور اصول کے بارے میں آپ کی کتب موجود ہیں۔ آپ کی تفسیر علمی ہونے کی بنا پر ذرا مشکل ہے۔ تاہم یہ بلند پایہ اردو تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے ترجمہ کیے ہیں یہ آپ کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ہے۔ انہوں نے نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

فرمایا یہ وہ کتاب مقدس ہے جو شک و شبہ سے بالابے اِدْ هٰذِي لِّلْمُتَّقِينَ
قرآن پاک متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ہدایت تو کمرہوں
کے لیے ہونی چاہیے تھی مگر تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں، ان کے لیے ہدایت ہونے کا کیا
معنی؟

اس ضمن میں شاہ عبد القادرؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متقیین سے مراد
ہیں، بچکنے والے اور ڈرنے والے لوگ اور تقویٰ کی طرف جانے والے لوگ۔ یعنی جن میں ضد
اور مخالفت نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں
کہ اس قرآن کو پڑھیں گے، تو ان میں تقویٰ پیدا ہوگا، یہ متقی بن جائیں گے، مقصد یہ کہ اگرچہ
آج یہ لوگ متقی نہ بھی ہوں، مگر اس قرآن پاک کی برکت سے آئندہ زندگی میں تقویٰ اختیار کر لیں گے۔
شاہ عبد العزیزؒ اس کا معنی سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بڑا
عقلمند، نوجوان، بڑے مضبوط جسم والا شخص ہو۔ تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے
فداں ماں کا درد سچ پایا ہے۔ دیکھو کتنا طاقتور ہے، گویا اس کی ماں کے درد میں وہ طاقت
اور تاثیر ہے جس سے اس قسم کے کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ
هٰذِي لِّلْمُتَّقِينَ کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے

قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے۔ کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ **هٰذِي لِلْعٰلَمِيْنَ** بھی آیا ہے۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ کی
تعریف

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا۔ حضرت تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا **اَمَّا سَلَكَ طَرِيقًا ذَا شَوَاطِئَ** کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑ ہوں۔ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا، پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا **شَمَوْتُ وَاجْتَنَدْتُ** میں نے دامن سمیٹ لیا اور پورنی کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھ جائیں اور میں سلامتی سے ایسے راستے سے نکل گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا **فَذَلِكَ التَّقْوٰی** تقویٰ اسی کو کہتے ہیں کہ دنیا میں پیسے ہوتے کفر، شرک، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے۔ جو شخص ان چیزوں سے دامن بچ کر نکل گیا۔ وہی متقی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے تقویٰ کا مطلب پوچھا گیا، تو فرمایا اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ مانے اور یقین رکھے کہ تمام کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا جس شخص کا اعتقاد اور عمل یہ ہو وہ متقی ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا **اَلَا تَرٰی نَفْسًا خَيْرًا مِّنْ اَحَدٍ**۔ یعنی تم اپنے نفس کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھو۔ تم یہی سمجھو کہ میں ہی کمزور ہوں اور میرا ہی قصور ہے جب تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہو جائے تو متقی بن جاؤ گے۔ حضرت مجتہد الف ثانی کا قول ہے مجھے

برآں کس معرفت خدا علم است کہ خود را از کافر خرمگ بستر دانہ

یعنی جو شخص اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر سمجھتا ہے۔ اس پر خدا کی معرفت صراحت ہے

آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ کہ اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر نہ سمجھے۔ کیونکہ ہو

۱۰۰ تفسیر کبیر ص ۱۱۱

۱۰۰ تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۱

بیچھے مگر آپ نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کہتے تھے یہ رقم ان کو دو جن کا حق چھین رکھا ہے۔
مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے لقمے کی بات تھی۔
خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کہ حکیم سے پوچھا کہ بجائی بہت کون ہوتا ہے، تو اس حکیم نے جواب دیا متقی وہ ہوتا ہے
جو خدا کو مخلوق پر اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ وہ ممتقی ہوتا ہے۔

ایمان بالغیب

کتاب الہی کا ابتدائی تعارف کرنے کے بعد کہ یہ متقین کے لیے ذریعہ ہدایت ہے
ارشادِ ربانی ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ جو غیب پر ایمان
رکھتے ہیں۔ غیب وہ چیز ہوتی ہے جو ادراک، حواسِ ظاہرہ و باطنہ، عقل و فہم اور خیال کی دوسری
سے باہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ فرشتے ہیں۔ برزخ اور آخرت
کا دن ہے۔ اس میں آخرت کے تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ سب غیب ہیں۔ اس کی تشریح
سورۃ بقرہ کی آخری آیات اَمَّا الرَّسُولُ فَمَا نُنْزِلُ اَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰهِ وَهَلْ يَكْتُمُ رَكْتَبِهِ وَدُسُوْلُهُ میں آچکی ہے۔ ان تمام
چیزوں پر ایمان ہونا چاہیے۔ البتہ غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ بندوں کے لیے
سوائے وحی۔ الہام یا کشف وغیرہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کسی پر
الہام نہ کرے، تب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ جب تک کسی نبی یا رسول پر وحی نہ کرے، یا کشف
کے ذریعے کسی پر کوئی بات منکشف نہ کرے، اس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جب کسی
کو کسی بات کی اطلاع دے دی جائے، یا کوئی چیز ظاہر کر دی جائے۔ تو وہ غیب نہیں رہتا۔ غیب
وہ ہوتا ہے جو عقل و حواس یا کسی اور ذریعے سے منکشف نہ ہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے
ساتھ مختص ہے۔ اسی کو علم الغیب و الشہادۃ کہا گیا ہے جو بغیر کسی حواس، قوت یا آسے
کے جانتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ علم کا معنی ہوتا ہے۔ جاننا اور معرفت کا معنی ہے پہچاننا اور ایمان
کا معنی ہے ماننا۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہودی حق کو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ انسان
مستی کس طرح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ مستی وہ شخص ہو سکتا ہے جو
اولاً اپنے دلی جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو۔
ثانیاً اپنی پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہو۔

ثالثاً یہ کہ اپنے ابتداء جنس پر اسی طرح رحم کرنے والا ہو۔ جس طرح اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔
گویا جس طرح خود اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جذبہ ہوسرور
کے لیے بھی موجود ہو۔ جس شخص میں یہ تین علامتیں پائی جائیں گی وہ مستی بن جائے گا۔

محمد بن یوسف فریابی ایک بزرگ ہوئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ
سے پوچھا کہ کیا بات ہے جہاں جائیں آپ ہی کا چہرہ ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے اس قدر
مدح میں۔ حالانکہ میں نے تو آپ کو رات کے وقت سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی آپ
کو ساری رات عبادت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ آپ نے فرمایا چپ رہو۔ یہ بات تقویٰ
پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کرے، اُسے مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرح حکومت کے
معتوب ہے حتیٰ کہ منصور نے آپ کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا کہ سفیان جہاں سے
اُسے سولی پر لٹکا دو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ حکومت کے غلط احکام پر تنقید کرتے تھے۔ انہیں ظلم
سے منع کرتے تھے۔ ایک موقع پر ساتھیوں نے عرض کیا، حضرت! منصور ابراہیم ہے آپ
کو گرفتار کر لے گا۔ وہ آپ کے لیے سزائے موت کا حکم پہلے ہی جاری کر چکا ہے۔ لہذا
آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے خانہ کعبہ کا خلافت پکڑ کر دعا کی کہ اے پروردگار! اگر
منصور مکے میں آجائے تو میں کعبہ سے بری ہو جاؤں گا۔ آپ نے ایسی سخت دعا کی کہ منصور
راستے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو بادشاہ نے بڑا لالچ دیا۔ پچاس ہزار روپے بطور عطیہ

اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا، اور دینی مدارس کا قیام بھی
 مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں
 یا نل لگوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے
 راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب بذات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ
 میں آتا ہے۔ اور باعثِ اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ
 خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے۔ کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں
 دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے جو مال خرچ کیا جائے۔
 اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات
 وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، ان کو کر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، یہ
 سب اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ کا مصداق
 بنتا ہے۔

کتبِ سماوی
 پر ایمان

اس کے بعد فرمایا متقین وہ لوگ ہیں وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
 یعنی آپ پر جو کتاب ہدایت اور جو احکام نازل ہوئے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں وَمَا
 أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور جو پہلے پیغمبروں پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں
 یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ پہلی کتابوں پر صرف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان پر عمل کرنا
 ضروری نہیں، عمل ان احکام پر ہو گا۔ جو آخری کتاب قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں۔ قرآن
 پاک کے نزول اور حضور علیہ السلام کی شریعت کے نفاذ پر پہلے تمام احکام منسوخ ہو چکے
 ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ان پر عمل ضروری نہیں تاہم ان پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے
 پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ نازل فرمایا وہ برحق ہے۔ یہ اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام آسمانی
 کتابیں برحق ہیں۔ تاہم قابلِ عمل احکام صرف قرآن پاک کے ہیں۔

ایمان بالآخرت متقین کی آخری صفت یہ بیان فرمائی وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ وہ آخرت

مگر مانتے نہیں۔ وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ یہودی نبی آخر الزماں کو
 "يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ" اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی
 اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! ایماندار اور پھر متقی وہ ہیں جو غیب پر ایمان
 رکھتے ہیں۔ ملائکہ، برزخ، آخرت وغیرہ تمام چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ
 چیزیں نبی علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلائی ہیں۔ لہذا متقی وہ ہیں جو ان سب پر ایمان رکھتے ہیں
 کہ یہ چیزیں برحق ہیں۔ اَمَّا وَحَكِّقًا

اقامت صلوٰۃ

متقین کی دوسری صفت ہے۔ اقامت صلوٰۃ فرمایا متقین وہ ہیں وَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
 جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہاں پر یُقِيمُونَ الصَّلَاةَ یعنی نماز ادا کرتے ہیں۔ نہیں فرمایا۔
 بلکہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کہ بڑا گہرا لفظ ہے۔ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ قیام
 رکوع، سجود، تلاوت، فرائض، سنن، واجبات اور مستحبات وغیرہ کو احسن طریقے سے ادا کیا
 جائے۔ جو لوگ ان تمام چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز
 ادا کرتے ہیں، اقامت صلوٰۃ کرنے والوں سے وہی لوگ مراد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 نے اقامت صلوٰۃ کا معنی یہی کیا ہے کہ نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طور پر ادا کیا جائے۔

انفاق فی
 سبیل اللہ

ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے بعد متقین کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی وَ هِمَّا
 رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں
 خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف حالت میں سے پہلے نمبر
 پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائیں۔ محتاجوں۔
 مہمانوں۔ کمزوروں۔ یتامیٰ اور یتیم خانوں کی حاجت برداری ہے۔ اس کے بعد وقف کی مدائی
 ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اس کو
 آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور علیہ السلام سے عرض کیا
 کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ اپنے فرمایا وقف کر دو۔ چنانچہ وہ وقف
 کر دی گئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ترجمہ:۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انکو

ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے سرنگادی ہے

ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے

لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ⑦

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں پہلا

گروہ مومنین کا ہے۔ جو ہدایت کو ظاہر اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اسے اپنا لے ہیں۔ یہ مومن تھے

کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان

ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے، جو ہدایت الہی کا ظاہر بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً

بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، البتہ کافر کہلاتے

ہیں۔ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔

ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے، مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ

منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیسرے ۱۳ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔

ان میں سے پہلا گروہ جو متقین اور مومنین کا گروہ ہے، وہ فلاح پانے والا گروہ ہے

البتہ دوسرے دونوں گروہ ناکام ہیں۔ پھر ان میں سے کاذبوں کا حال مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔

کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین

کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا

ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں شبہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ

کے دن پر یقین رکھتے ہیں آخرت کے دن سے مراد قیامت کا دن یا دنیا کا آخری دن
 (LAST DAY OF THE WORLD) ہے۔ اسی لیے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اے
 دارالآخرت یا آخرت کا گھر بھی کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ اسی
 طرح فرشتے، آسمانی کتابیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور توحید یہ سب ایمان
 کے اجزاء ہیں۔ تقدیر بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا
 اللہ تعالیٰ کے علم ارادے اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔
 فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى
 مِّنْ رَبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ وَ اُولَئِكَ هُمُ
 الْمُفْلِحُونَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کے معنی مراد کو پہنچنے والے ہیں
 تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پروگرام کو لوگ نماز میں اِصْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
 کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس
 پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں
 کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی سودہ حال ہو جائے۔ پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے
 یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان،
 اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی مذاب
 سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

ہدایت یافتہ
لوگ

سکتے ہیں کہ انگریز کافر کسی وقت ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔
اور تمہارا نفس موٹا موٹا ہوتے ہوئے شیطان ہی بن جائے لہذا جب تک اپنے آپ کو اس سے
حفظ نہ سمجھو گے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر یہ عامل نہ ہوئی تو متقی کیسے بن سکتے ہو
(محمد الاسلام) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شجرہ مبارکہ میں ایک شعر آتا ہے۔

زمن دارد سگے نصرانیاں عار کہ او بے گناہ دین گنہگار
یعنی مجھ سے تو نصرانیوں کا کتا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ گنہگار نہیں اور میں گنہگار ہوں عجزی
اور انکساری کا یہ معیار ہے۔ اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان شرک کی تمام
اقسام سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو عذاب سے خلاصی پائے گا۔ ”وَالَّذِينَ هُمْ كَلِمَةُ
التَّقْوَىٰ“ کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے۔

تقویٰ کے
تین درجات

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور چھوٹے گناہوں
پر صبر نہ کرے۔ اور تیسرا درجہ تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان مشکوک اور شبہات والی باتوں سے
بچتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کے ان تینوں درجات پر پورا اترے گا وہی کامل درجے کا متقی ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حسرت کے دن یعنی قیامت کے روز آواز آئے گی
کہ متقی لوگ کہاں ہیں متقی لوگ اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سایے میں چلے جائیں گے۔

متقی کون ہیں؟

والتجلی ان پر ہر وقت سایہ فگن ہوگی اور کسی وقت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی کسی نے حضرت معاذ بن جبلؓ
سے دریافت کیا کہ حضرت! متقی کون ہیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے
آپ کو انواع شرک سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرتے رہے۔ متقیوں کی علامت
یہ ہے کہ اگر انہیں مصیبت آئے تو صبر کریں۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر راحت
آئے تو خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں قرآن پاک کے احکام کے سامنے ہمیشہ مطیع و فرمانبردار رہیں
یہی لوگ متقی ہیں۔

قرآن پاک میں کفر کی جس دوسری قسم کا ذکر آتا ہے۔ وہ کفر جود ہے۔ جحد کا معنی انکار
 ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وَاجْهًا لِّكَ ظَہِرٌ ہے۔ کفر جود کی تعریف یہ ہے کہ آدمی دل
 سے پہچانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ بات سچی ہے۔ مگر وہ اس کا زبان سے اقرار نہیں کرتا۔
 جیسا کہ فرعونوں کے متعلق فرمایا: وَاجْهًا لِّكَ ظَہِرٌ وَاسْتَقْنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا
 وَكُلُّوا دُلَّ مِی سَمَّجَتے تھے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین سچا ہے۔ مگر وہ اس کا انکار کرتے تھے
 یہ انکار ظلم اور تعدی کی بناء پر تھا۔ اس کو کفر جود کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا
 کفر ہی ہے۔ کیونکہ وہ دل میں حق بات کو سمجھتا ہے۔ مگر اقرار کی بجائے انکار کرتا ہے۔
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بلعم بن باعور ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ
 کی بارگاہ سے مردود ہوا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے
 زمانہ میں ایک بڑا حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت ہوا ہے۔ اس کا کفر بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے
 حق کو جانتے پہچانتے ہوئے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت
 محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں وحی نازل کی۔ مجھ پر کیوں نہیں کی۔ عربی زبان میں اس کا کلام
 موجود ہے۔ وہ شخص نبی ابدی اور قیامت تک کا تصور رکھتا تھا۔ وہ توراۃ اور انجیل کا قاری
 اور ہدایت کا طلب گار تھا۔ مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔
 اور آپ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ دل سے برحق سمجھتا تھا۔ وہ اتنا قابل آدمی تھا
 کہ اس کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بڑا مومن آدمی ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے اس
 کے متعلق فرمایا: اَنْتَ مِمَّنْ اٰمَنَ لِسَانُهُ وَلَمْ یُؤْمِنْ قَلْبُهُ یعنی زبان تو اس کی مومنوں
 جیسی ہے مگر دل کافر ہے۔

بعد کے زمانہ میں ایک افسانہ نویس انگریز برنارڈ شا گزرا ہے۔ بڑا صاحب علم تھا، اسلام
 کو وہ بھی سچا سمجھتا تھا۔ مگر کم محنت سے اقرار نہیں کیا۔ یہی حال مشرک گاندھی کا تھا۔ وہ اسلام کو
 سچا مذہب کہتا تھا۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ عیسائیت اور ہندو مت کو بھی سچے مذاہب ہی

سمجھتا تھا۔ ملائکہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے۔ "إِنَّ الْمَذِينَ عِنْدَ اللَّهِ الرَّسُلُ"۔
باقی سب ادیان باطل ہیں۔ یہی کفر مجرب ہے۔ کہ کسی چیز کو دل سے صمیم سمجھ کر پھر زبان سے
اس کا اقرار نہ کیا جائے۔

کفر کی تیسری قسم کفر عناد ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دل سے پہچانتا بھی ہے زبان

سے اقرار بھی کرتا ہے کہ یہ دین درست ہے۔ مگر قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ابو طالب کا
کفر ہے۔ وہ حضرت علیؑ کے والد اور حضور علیہ السلام کے چچا تھے۔ وہ تھا کہ میرا بھتیجا سچا ہے
صادق اور امین ہے۔ جو کہتا ہے۔ سچ ہے مگر اس نے ایمان اور توحید کو قبول نہیں کیا۔

اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ وہ عجیب قسم کے دہم کا شکار تھا۔ محض اس ڈر سے اسلام قبول
نہیں کیا۔ کہ عورتیں ملاست کریں گی کہ موت کے ڈر سے باپ و مادرین چھوڑ دیا۔ یہ کفر عناد ہے

کفر نفاق

کفر کی چوتھی قسم کفر نفاق ہے۔ اس کا ذکر اگلی باتوں میں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ انسان زبان سے اسلام کی سچائی کا اقرار کرتا ہے۔ گلابی پڑھتا ہے۔ نمازیں بھی ادا کرتا ہے
زکوٰۃ دیتا ہے۔ بسا اوقات جہاد میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مگر دل سے تکذیب کرتا ہے۔ یہ
کفر نفاق ہے۔ اور پھر نفاق بھی دو قسم سے ہے یعنی اعتقادی نفاق اور عملی نفاق۔ یہاں پر
جس نفاق کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اعتقادی نفاق ہے کہ اعتقاد اول سے تسلیم نہیں کرتا عملی نفاق
کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہ اور چیز ہے۔

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چاروں کفر خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی مبتلا ہو
گیا۔ وہ اللہ کے ہاں کبھی نجات نہیں پاسکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یہ قطعی
بات ہے۔

کفر شک

اس کے علاوہ بھی کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے کفر شک ہے۔ قرآن پاک میں
بعض منافقوں کے بارے میں آتا ہے۔ فَهَمْ فِي رَيْبِهِمْ يَكْتُمُونَ دُونَ دُورِ
مَكْرَهُ يَأْبُلُوهُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ یعنی ایسے لوگ شک میں ہی کھیل رہے ہیں۔

یہ کفر شک کہلاتا ہے۔

اسی طرح کفر کی ایک قسم کفر جہالت ہے۔ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ساری عمر جہالت میں گزر جاتی ہے۔ نہ علم ہوتا ہے اور نہ وہ راہِ راست پر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی جگہ جگہ پر مذمت بیان کی ہے: أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی علم نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ کہ برابر نہیں ہوتے۔ اس قسم کا کفر کفر جہالت ہے۔ جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

کفر تاویل کو اتحاد و تہو و تہذیب بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شی کو غلط مطلب پہنا دیا جائے۔ اصل مقصد کچھ اور ہو مگر تاویل کچھ ذریعے کچھ سے کچھ بنا دیا جائے مثلاً غلام احمد پرور قرآن پاک کی آیت أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کا مطلب مرکز ملت یا سنٹرل گورنمنٹ مراد لیتا ہے۔ کہ مرکزی حکومت کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح حج کا معنی اس نے عالمی کانفرنس کیا ہے۔ حالانکہ حج ایک عبادت کا نام ہے۔ اس کے ارکان ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے محض عالمی کانگریس یا عالمی کانفرنس کا نام دینا بالکل غلط ہے۔ پروریز نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا کے محکوم ہونے کا مطلب اپنی فطرت کا محکوم ہونا ہے۔ یہ بھی کفر والا معنی ہے۔ اس نے ترجمہ القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ کا معنی قانون ہے۔ جہاں بھی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد قانون ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات یا ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حُرُورِ عَيْنٍ کا معنی پاکیزہ فکر کیا ہے۔ گویا جنتوں سے مراد پاکیزہ فکروا لے لوگ ہیں۔ حالانکہ حُرُورِ عَيْنٍ کی اصطلاح کو تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ غورتوں کی ایک پاکیزہ مخلوق ہے۔

غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ازالہ اودھام میں مُتَمِّدِ رِسُولِ اللّٰہِ کے متعلق لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی۔ العیاذ باللہ۔ یہ کفر والا معنی ہے۔ اس سے پہلی آیت وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ کا معنی قادیانی یوں کرتے ہیں۔

بِالنَّبَوَةِ الْآخِرَةِ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو آخری نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آخری نبوت مرزا غلام احمد مرتد کی لیتے ہیں حالانکہ آخرت سے مراد دارالآخرت یا یوم آخرت ہے نہ یہ زمیوں کی تادیل کی مثال ہے۔ اسی طرح انہوں نے وَلَٰكِنْ رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ کا معنی یہ کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے مہر لگانے والے ہیں۔ یعنی اب جو نبی آتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر سے آتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہر لگا لگا کر دوسروں کو نبی بنا رہے ہیں (الیاذ باللہ)

الغرض کفر تادیل سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا معنی نہ کرنا جو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، نہ صحابہ کرام سے، نہ از سلف صالحین سے ثابت ہو، وہ کفر تادیل، از مذقہ الحاد میں شمار ہوگا۔

سر سید احمد خاں نے بہشت کا معنی مسرت اور خوشی کیا ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی اور مسرت اچھے اعمال کا صلہ ہوتی ہے۔ اور رنج و غم بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور دوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی کفر یہ معنی ہے۔ کفر کی ایک قسم عملی کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر دانی کی بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، حضور! کفر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ناشکر گزاری اور نافرمانی۔ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے تَكْفُرُ نَ الْعَشِيرَةِ یعنی تم خاوند کا کفر کرتی ہو۔ ناشکر گزاری کرتی ہو۔ یہی عملی کفر ہے۔ فرمایا کہ خاوند زمانہ بھر راحت و آرام مہیا کرتا ہے اگر ایک مرتبہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ ترک کرتی ہو، تیرے گھر آکر مجھے کبھی کبھی نصیب نہیں ہوا کفر من نعمت اکثر عورتوں کے مزاج میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر ہے۔

محدثین اور فہم کے کرام عملی کفر کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ بعض عملی کفر ایمان کے بالکل منافی ہوتے

عملی کفر

ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے کفر کا ارتکاب کرے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی بت کے سامنے بجد و ریز ہو جائے، یا قرآن کریم کی توہین کا مرتکب ہو اُسے گندی جگر پر پھینک دے یا مثلاً کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے یا کسی نبی کو قتل کئے تو ایسا آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

عملی کفر کی دوسری قسم وہ ہے۔ جن میں جب سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا مثلاً کوئی شخص نماز کا تارک ہو، شراب پی لے، کسی کو قتل کر ڈالے، زنا کا مرتکب ہو یا کسی سے ناحق لڑائی کی۔ یہ سب کفر ہی کی قسم سے ہیں۔ مگر یہ ایمان کے منافی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا میرے بعد کفار کی طرح نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ ان امور سے انسان اسلام سے تو باہر نہیں نکلتا۔ مگر کام کافروں والے ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ یہ کام کرے۔ قَتَالَةُ الْكُفَرِ مَوْتٌ مِّنْ مَّوْتٍ سے مقابلہ کفر ہے۔ مومن کو گالی دے فسق کی بات کرے، ناحق لڑائی یہ سب کفر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ کافر، مسلمان کی جان کا دشمن ہوتا ہے جب کہ مومن، مومن کی جان کا محافظ ہوتا ہے۔ فرمایا شَارِبُ الْخَمْرِ كَافِرٌ وَبَنٌ يَعْنِي شَرَابِ پینے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا بت پرستی کرنے والا۔ گویا شرابی کو بت پرست کے ساتھ تشبیہ دی۔ نَسَائِي شَرِيفٌ مِّنْ آتَمِہِ مَنَ اَلِ عَرَا فَا اَوْ كَا هِنَا جو کابن یا عزان کے کے پاس غیب کی خبریں پوچھنے کے لیے گیا فَتَدْکُفِّرُ اس نے کفر کیا۔ اس کی مزید تفصیل آتی ہے۔ کہ اگر نجومی کی بات کو بالکل سچا سمجھ رہا ہے تو اسلام سے خارج ہو گیا۔ اور اگر سچا سچا تو نہیں سمجھتا، ویسے ہی اس کی رائے لینا چاہتا ہے، تو یہ عملی کفر ہے، اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا۔ مگر سخت گنہگار ہوتا ہے۔

کفر و ہریت بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن پاک میں اسی کفر کے متعلق مذکور ہے کہ بعض کافر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دَمَآہُہُنْکُمْ اَرَا الدَّہْرُ یعنی ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے ایسے لوگ زمانے کے تمام حادثات کو زمانے ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات

کا اقرار نہیں کرتے کہ وہی ہر چیز کرنے والا ہے۔ بلکہ زمانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کفر و کبریت کلام ہے۔
 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاذُنُ قَوْمٍ مِّنْهُمْ مِّثْلُ مَا يَدْعُوْنَ ۚ اَشْكَالٌ وَّارِدٌ
 ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔
 اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ایمان کی تبلیغ و دعوت سے کیا حاصل ؟

ایک اشکال وارد
 اس کا جواب

مفسرین کرام وضاحت فرماتے ہیں کہ اس مقام پر لفظ سَوَاءٌ عَلَیْہِمُ یعنی ان کفار کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ سَوَاءٌ عَلَیْکَ کے الفاظ نہیں آئے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ان کو تبلیغ کرنا یا نہ کرنا آپ کے لیے برابر ہے۔ یہ تو ان کے لیے برابر ہے۔ کہ انہیں کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا تو فرض ہے کہ آپ فرض تبلیغ انجام دیتے ہیں۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے۔ آپ کے لیے حکم یہی ہے "فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتْ الذِّكْرٰی" آپ نصیحت کرتے چلے جائیں، چاہے وہ انہیں فائدہ دے یا نہ دے۔ آپ کو اس تبلیغ کا ہر حالت میں اجر ملے گا۔

سفا

درس نمبر ۲

البقرة ۲

(آیت ۷۶)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ع

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے ہر ٹکادی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ⑦

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دو سرگروہ گزشتہ پیرہ یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متعین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دو سرگروہ کا بیان ہے اور دوسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہر اور باطن اللہ تعالیٰ کی توحید کا انککار کرتے ہیں۔ اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ کفر کی تشریح اور اس کی مختلف اقسام گزشتہ درس میں مختصر بیان کر دی گئی تھیں۔

گزشتہ درس میں اس اشکال کا تذکرہ ہوا تھا کہ اگر کافروں نے ایمان ہی نہیں لانا خواہ انہیں ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے، تو پھر انہیں تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا کہ ڈرانا یا نہ ڈرانا کفار کے لیے برابر ہے۔ نہ کہ خود مبلغ کے لیے، کیونکہ مبلغ تو ہر حالت میں اجر کا مستحق ہے، خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے کافر

ان آیات کے مصداق کون ہیں

اگرچہ ایمان نہیں لائے۔ مگر دوسرے بہت سے ایمان لائے۔ ابوسفیانؑ کافر ہی تو تھے۔
وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ ابوجہل جیسے بدترین دشمن کا بیٹا عکرمہؑ ایمان لایا۔
مشہور جبریل خالہ بن ولید بھی بڑی دیر کے بعد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ تو اس کا
جواب یہ ہے۔ کہ یہاں یہ کفار سے مراد وہ کفار ہیں۔ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے
کہ ان کی استعداد خراب ہے۔ ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ ان سحقرہ۔ شعیبہ۔ ابولہب۔ ابوجہل
جیسے کافر مراد ہیں۔ جن کا خاتمہ حالت کفر پر ہوا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جب
قرآن کریم نازل ہوا تو انہیں اسلام کی دعوت پیش کی گئی۔ مگر وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ
لائے۔ ماسوائے اکادکا آدمی کے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ہم پہلی کتابوں
پر ایمان لا چکے ہیں۔ لہذا ہمیں اس کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے
وہ انتہائی درجے کے متعصب لوگ تھے۔ یہ روش انہوں نے عباد کی وجہ سے اختیار کی۔
چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں کثرت سے یہود کا ذکر آئے گا۔ بلکہ اس سورۃ کا موضوع ہی یہود کی
اصلاح ہے۔ یہود کا ذکر یہ سورۃ سے شروع ہو کر اختتام پارہ اود پھر
دوسرے پارے تک چلا گیا ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔
تو پھر انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بلکہ انہیں دعوت دینا تو خلاف انصاف
معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ کہ یہود کے بقیہ
کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے۔ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں
ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اس کی مثال ایسے
ہی ہے۔ جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کسی مریض کو دیکھ کر بتائے کہ اسے ٹی بی کا مرض لاحق
ہے۔ لہذا اب یہ یقین درجے عبور کر کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔۔۔ مریض کی موت

طرف جانا چاہتا ہے۔ خدا اسی طرف کی توفیق دے دیتا ہے۔ توفیق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مگر ارادہ تو انسان کا ہوتا ہے۔ اور ارادے کی حد تک انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے کسب کہتے ہیں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے **وَفَضَّلَهُ جَهَنَّمَ** آخر کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تندرست آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا شخص بوشہ کامریض ہے۔ اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی تندرست آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی نقصان کرے، کوئی برتن توڑے کسی کو تھپڑ مارے تو وہ اس فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور قابل گرفت ہوگا۔ برخلاف اس کے کسی سچے دالے آدمی سے غیر ارادی طور پر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ تو بچارہ مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے توار گر کر کسی کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے، تو اس کے ذمے قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اسی کو شریعت میں کسب کہا جاتا ہے چنانچہ جو شخص بقائم بوشہ و حواس اپنے ارادے سے صحیح راستے سے روگردانی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ مہر لگانے کا یہی مطلب ہے۔

دلوں کی سیاہی

مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے **لَعَسَ وَضَّ الْفِتْنُ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْخَصِيرِ** **هُوَ ذَا عُوْذَا** دلوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں جس طرح مگس کا جوتا کر چٹائی تیرا۔ سو جاتی ہے اسی طرح دلوں پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ٹھپہ لٹ جاتا ہے۔ یہ فتنے گمراہی کی باتیں ہیں جو ایک ایک کر کے انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ان فتنوں کو قبول کر جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پورے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور انسان اس شیخ

پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور بُرائی کو بُرائی نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے لٹے کو اٹا کر کے رکھ دیا جائے یعنی ہینڈ اوپر اور منہ نیچے کی طرف کر دیا جائے۔ تو اس میں کوئی چیز نہیں سما سکتی۔ اسی طرح انسان کا دل بھی اٹا ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی بات اس میں جگہ نہیں پاتی۔ برخلاف اس کے جو شخص دل پر وارد ہونے والے فتنوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا دل سنگھڑ کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اگر بندہ توبہ کرے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لے تو سیاہ داغ دھل جاتا ہے اور دل پھر سفید ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرنے کی بجائے دوبارہ گناہ کا مرتکب ہوا تو سیاہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کے ارتکاب پر دل کی سیاہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِحَاطَتْ بِہِمْ خَطِیئَتُہٗ" اس کے گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس کا دل معصیت، کفر اور شرک میں گھر گیا ہے۔ اسی حالت کے متعلق فرمایا "کَلَّا بَلْ عَصَاہٗ اَنۡ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَاۡلَاۤیَ کُیۡبُوۡنَ" خبردار! سن لو! ان کے دل پر زنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا اپنا کیا دھڑ ہے۔ یہی وہ شیج ہے جس کے متعلق فرمایا "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ" یعنی اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔

اعضائے زیر کے
باتے میں باز پرس
ہوں

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے تین اہم اعضاء یعنی دل، کان اور آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ دل محض گوشت کا ایک لوتھر ہی نہیں بلکہ اس کو عقل قلب اور فواد سے بھی تعبیر کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سوچ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور قوت ارادہ کا تعلق قلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی قوت ارادی کو فواد کہا گیا ہے قرآن پاک میں موجود ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّۢ اُولٰٓئِکَ کَانَ عِنۡہُ مُشَوِّرًا" یاد رکھو! کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق ہوال ہو گا۔ یہ اعضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ انسانی جسم میں یہی چیزیں علم کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ

چیزیں نہ ہوں تو انسان کی کچھ حقیقت نہ ہو۔ یا اگر اللہ تعالیٰ یہ اعضاء عطا کر دے اور پھر انہیں اُن سے کام نہ لے تو اُس کی مثال قرآن پاک نے یہی بیان فرمائی **صَلُّوا بِلِقَہِ عُمٰی**۔ ایسے لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں **فَہُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ**۔ کہ یہ عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ گویا کافروں کی مذمت کی ہے۔ کہ ان کی حالت یہ ہے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں دی ہیں۔ کہ انسان دل کے ساتھ سمجھے اور غور کرے۔ کیونکہ یہ دل ہی منبع اخلاق ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سزا کے ذکر میں **تَطَّلِعُ عَلٰی الْاَفْیَادِ** فرمایا۔ یعنی جہنم کی آگ کا اثر سب سے پہلے ایسے لوگوں کے دلوں پر ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے قلب جیسے مرکز اخلاق کو بگاڑا، تو جہنم کی آگ کا اثر بھی پہلے دل پر ہی ہوگا۔ جسم کے باقی حصوں یعنی ہاتھ پاؤں پر آگ کا اثر دوسرے نمبر پر ہوگا۔

اعضائے ریہ
میں سے قلب
کی اہمیت

حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھر ہے اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوگا اور اگر یہ لوتھر بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہوگا **فَسَرَّیَا اَلَا وَہُوَ الْقَلْبُ** سنو! وہ لوتھر اول ہے۔ حسن و قبح کا سارا دار و مدار دل پر ہے۔ محبت اور نفرت کے تمام جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سارا معاملہ دل سے تعلق رکھتا ہے۔ دل کے ذریعے انسان سمجھتا ہے۔ اور کان کے ذریعے اللہ تعالیٰ معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت۔ نبی کی حدیث اور احکام کا وعظ وغیرہ سب چیزیں کانوں کے ذریعے سے سنی جاتی ہیں۔ لہذا کان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح آنکھ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ انہیں کے ذریعے انسان قدرت کی عظیم نشانیاں دیکھتا ہے۔ کتابیں پڑھتا ہے۔ اگر آنکھیں نہ ہوں تو ساری دنیا گھپ اندھیرا ہو جاتی ہے۔ دل کی اہمیت کے متعلق علامہ اقبال مرحوم کہتے ہیں:۔۔۔
مہ غافل ترے زمرہ مسلمان مذہب ام
دل درمیان سینہ او بیگانہ دل است
کہ میں نے مسلمان سے زیادہ غافل کسی کو نہیں دیکھا۔ کہ دل جیسی عظیم دولت اس کے سینے میں موجود ہے۔ مگر وہ اس سے غافل ہے۔ اُسے شعور ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت اس کو عطا کی ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمتیں انسان کو ودیعت کی ہیں۔ یہ اس کے لیے حصول علم کے ذرائع ہیں۔ جو شخص ان ذرائع کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی مثال حسرت مولانا اشرف علی تھالوی نے یوں دی ہے۔ جیسے کوئی امیر کبیر کسی کی تنخواہ مقرر کر دے۔ کہ بھائی تم غریب ہو ہر ماہ یہ وظیفہ وصول کر لیا کرنا۔ وہ شخص ہر مہینے اپنا مشاہرہ وصول تو کرتا ہے۔ مگر کسی مصرف میں لانے کی بجائے اسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ امیر دیتا رہتا ہے اور غریب ضائع کرتا رہتا ہے۔ آخر کار اس امیر کو کسنا پڑتا ہے۔ کہ یہ شخص کس قدر نمک حرام ہے۔ کہ میں نے اس پر رسم کرتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مگر یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا چنانچہ اس کا وظیفہ بند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شخص کو افسوس بلکہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کی آمدنی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس قسم کے شخص کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ یہ بیوقوف مسر کا ہی مستحق ہے۔

عذاب عظیم
کی وعید

یہی حالت اس شخص کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دل عطا کیا۔ کان اور آنکھیں دیں مگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کو بروئے کار نہیں لاتا۔ تو آخر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی، اور ایسا شخص نمک حرام قرار پائے گا۔ وہی وہ حالت ہے۔ جس کے متعلق فرمایا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے لہذا ان کے لیے عذاب عظیم مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

ان کے ذرا
مرکز ایک ہے

یہاں پر جن تین اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں قلوب جمع ہے۔ سمع واحد اور البصار جمع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں کہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ لہذا بہت لوگوں کی وجہ سے اسے جمع فرمایا۔ ”وہ ان اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں مگر ان دونوں کی سماعت اکٹھی ہوتی ہے۔ ان کا مرکز ایک ہے۔ لہذا اس کے لیے واحد کا صیغہ بولا۔ اور آنکھیں دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ اور ایک کو بند کر کے کسی ایک سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہذا ان کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے دو اعضاء یعنی دل اور

کانوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر پتھر دگادیا گیا ہے۔ اور آنکھوں کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ان کو استعمال نہیں کرتے اُن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کفر، شرک اور برائی کا پردہ ہے۔ جو آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ صحیح بات نظر ہی نہیں آتی۔ جب کسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ جو آگے چل کر انہیں ملے گی۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے گروہ انسانی کا حال بیان فرمایا۔ جنہوں نے ظاہراً اہل باطن کفر کو اختیار کیا۔ اور ہدایت سے محروم ہے۔ ان کی سزا کا ذکر بھی اجمالاً کر دیا۔ اہل الفاظ کے ضمن میں وجوہات بھی ذکر کر دیے۔ ان کا حال مختصر طور پر بیان فرمایا ہے۔ آگے منہ فتن کا ذکر آئے گا۔ چونکہ یہ زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ اس لیے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تیسرا گروہ ہے۔

السم
درس ششم

البقرة ۲

آیت ۱۲ تا ۱۴

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِينَ ۝۸ يُخَدِّعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يُخَدِّعُونَ
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝۹ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰ بِمَا كَانُوا
يَكْذِبُونَ ۝۱۱ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا
إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝۱۲ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن
لَّا يَشْعُرُونَ ۝۱۳

ترجمہ: اور بعض لوگوں میں سے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ
پر اور قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۸ وہ دھوکا دیتے ہیں
اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور حقیقت میں وہ نہیں دسکتے مگر اپنی
جانوں کو، اور وہ سوچتے بھی نہیں ۹ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب سے اس
وجہ سے کہ وہ مچھوٹ بولتے ہیں ۱۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں
فساد نہ کرو تو کہتے ہیں بیشک ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۱۱ سنو!
بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں ۱۲

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر چکا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے
جو ظاہر اور باطناً ہدایت کو قبول کرتے ہیں، وہ مومن و متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار
آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ظاہر اور باطناً ہدایت الہی کا انکار
کرتا ہے۔ وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے اب ان
آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ ہے جو ظاہر میں تو ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان

کے بطن میں کفر ہوتا ہے۔ اگلی تیرہ آیات میں منافقین کی خرابیاں، ان کی سازشوں اور چال بازیوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعے سارا معاملہ سمجھایا ہے۔

منافقین کا گردہ قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں صرف منافقین کے نام پر ہیں مثلاً سورۃ منافقون۔ اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورۃ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام ابو بکر جصاصؓ بہت بڑے مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ امام یزید بن ہریرہؓ بھی بہت بڑے عالم گزشتے ہیں انہوں نے علوم عربیہ میں کامل نامی عظیم کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ نفاق کا اشتقاق نَافِقًا الْیَرُوجُ سَعًیً جِسْلاً کا معنی ہے جنگلی چوہے کا بل مشہور ہے کہ گوہ یا جنگلی چوہے کے چار بل (سوراخ) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شکاری کو دھوکا دیتا ہے یہ کسی ایک سوراخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شکاری اس کو کھوٹتے ہیں، تو وہ کسی دوسری طرف غائب ہو جاتا ہے۔ منافق کا حال بھی یہی ہے۔ یہ شرک کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے جنگلی چوہے کی طرح یہ بھی خَدَّاعٌ یعنی دھوکے باز ہوتا ہے۔ شریعت میں منافق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں لِمَنْ يُظَاهِرُ الْإِيمَانَ وَيُخْفِي الْكُفْرَ جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کفر کو چھپاتا ہے۔

اب منافق کی کسی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متنبہ رہتا ہے۔ وہ ظاہراً اور باطناً شک میں ہوتا ہے ایسا منافق مُدْبِذٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَلِكَ کا مصدق ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کا اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے، وہ یہی اعتقاد ہی منافق ہیں۔ جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔

تیسری قسم کا منافق وہ ہے، جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنئے وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ
الْآخِرِ بَعْضُ لَوْ لَئِيْهِ هِيَ جَوَاسِعُ هِيَ کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے
ہیں وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ ایسے لوگ دھوکے باز ہیں۔
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَهْتَكِرُ اللّٰهُ تَعَالٰی اور ایمانداروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر
حقیقت یہ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اَنْفُسَهُمْ کہ یہ اپنی جانوں کو دھوکا دے رہے
ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا ایمان والوں کا کیا بگاڑیں گے۔ یہ تو اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اور اپنا
سہی انجام خراب کر رہے ہیں۔ اور سوچتے بھی نہیں وَمَا يَشْعُرُوْنَ یہ اتنا شعور بھی نہیں رکھتے
کہ خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ آخرت کو برباد کر رہے ہیں فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ انکے
دلوں میں بیماری ہے۔ اور یہ بیماری شک کی بیماری ہے۔ اکثر صحابہ کرام خصوصاً حضرت عبداللہ
بن مسعودؓ نے یہی معنی کیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں شک ہے۔

نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں، بلکہ دین کی بیماری ہے۔ جس طرح اجمام کی بیماری
ہوتی ہیں۔ اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے
کی بیماری ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے۔ وہ
بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے مختلف عناصر اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان
کی صحت درست رہتی ہے۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ عقیدے
کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر بد عقیدگی، حسد،
کینہ، اور گناہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو

نفاق دینی
بیماری ہے

فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مَرَضٌ کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کہنے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں۔ نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان مہمان کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خونِ صفر اور غیرہ کی ظاہر بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور اتحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا کیونکہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری ہے کہ جب علاج نہیں کیا جاتا تو بیماری بڑھ جاتی ہے دیکھ لیجئے اسلام کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ مگر منافقوں کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے باطن میں پوشیدہ حسد اور کینہ، اسلام کی مخالفت اور بدعتیگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کو فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اب اس بیماری کا نتیجہ یہ ہوگا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اور یہ سزا انہیں اس جرم کی پاداش میں ملے گی۔ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ زبان سے حق کا اقرار کرتے تھے۔ اہل ایمان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ مگر دل سے کفر کے ساتھ بولتے تھے۔ گویا وہ زبان سے جھوٹ بولتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے انہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ یہ ان کے نفاق یا حسد یا کفر کی سزا ہے۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں جب ان سے کہا جاتا ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا

فساد فی الارض

فِي الْأَرْضِ كَرِزِينَ مِثْلَ فِئَادٍ بِرَافِدِهِ قَالُوا إِنَّمَا خُنَّ مُصْلِحُونَ. تو کہتے ہیں کہ ہمیں فساد کی کون کون سی کتاب ہے۔ ہم تو اصلح کرنے والے ہیں۔

فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں۔ اعتدال کی حالت کو اصلاح اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں۔ لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا، ان کے رازوں کا افشاں، گنہگاروں کا اظہار، دین کی اہمیت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک فساد اور اصلاح محض معاش کی درستگی ہے۔ یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں۔ عبادت الہی کی بجائے کفر و شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی فساد ہے۔

ابہرہریٰ اور ابن کثیر: تعدد مفسرین کرام سے — روایت کرتے ہیں کہ اِصْلَاحُ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ بِالطَّاعَةِ زَمِينَ وَآسَمَانَ كِیْ اصْلَاحِ اطَاعَتِ كِیْ ذَرِیْعَۃً سَیْ بَیْ سَیْ طَاعَتِ بَیْ سَیْ ہوگی تو ارض و سما کے معاملات درست ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہوگی، تو زمین پر فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور منافق یہی کچھ کرتے ہیں۔

منافقین کی
دھوکہ دہی

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا یُخَذِّعُونَ اللہَ یہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ دھوکا تو دیا جاسکتا ہے۔ جہاں کوئی حالات سے ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے اے دھوکا کیسے دیا جاسکتا ہے۔ اس اشکال کے متعلق اہم بیضاویؒ اور دو سکر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زبان سے کہتے ہیں: ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کے پیروکار اور فدائی ہیں، مگر قلب کفر سے بھرپور ہے۔ ایمان کی مقدار ایک رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور دیئے فحاشی کے طور پر بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو اہل اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ گویا خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ مقتصد یہ کہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال موجود ہے إِنَّ الَّذِیْنَ یَبَايِعُونَكَ اِنَّمَا یَبَايِعُونَ اللہَ یعنی اے پیغمبر! جو لوگ آپ کے دست مبارک

پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا: مَنْ يُطِيعِ
الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت
کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور کی
رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے
رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

منافقین کا طریقہ واردت بھی وہی ہے۔ جو ایک عام دھوکا باز کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔
کہ اس طریقہ سے ہم اپنے مفاد بھی حاصل کر لیں گے۔ اور ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ اس طرح
ہم اس بد عقیدگی پر قائم رہ سکیں گے۔ گویا اسلام کا دھوکے بھی کرتے رہیں۔ اور کفر کے پروگرام کو
بھی ساتھ ہی جاری رکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ دو متضاد پروگرام ہیں اور کسی صورت میں ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو
سکتی۔ اسلام کا پروگرام نہایت ترقی یافتہ پروگرام ہے۔ جب کہ کفر انتہائی رجعت پسندانہ نظام
ہے۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

ایک طرف توحید، ایمان، اور تقویٰ کا پروگرام ہے۔ اور دوسری طرف کفر، شرک اور باطنی
بیماریوں کا نظام ہے۔ معاصی اور جنگ و جدل کا نظریہ رکھنے والے یہی لوگ فساد فی الارض کے
مرتبکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ
اصل فساد ہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں وَلٰكِنْ لَا يَتَعَرُّوْنَ مَكْرَ
یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آج کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو
یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام
کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی
راج ہے۔ اور اسلامی قوانین بھی جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں پروگرام اکٹھے
نہیں چل سکتے، صرف ایک نظام کو اپنانا ہو گا۔ ورنہ فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔
اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک

حکومتی سطح
پر نفاق

نظام کا مبنی ہی فساد ہے اور دوسرے کا ایمان، تو یہ اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے۔ کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ بات اشارہ کر دی ہے۔

عذاب عظیم اور
عذاب الیم
میں فرق

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا "وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" اور منافقوں کے متعلق فرمایا "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ کافر مردود اور محروم اذلی ہے۔ اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے۔ کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل محرومی کی حالت اختیار کر لی ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہو گا۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے۔ ان میں استعداد تو موجود تھی، مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود محرومی پیدا کر لی۔ جب سزا کی قربت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہو گا اور دکھ پیدا ہو گا۔ کہ افسوس ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا لہذا ان کو مولم عذاب ہو گا۔ یعنی جس قدر احساس ہو گا۔ اسی قدر تکلیف ہو گی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں۔ کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ تو اول و آخر کافر ہی رہے۔ برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اس کا حکم اور ہوتا ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بکثرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں۔ جہاں الے پھل نہیں ہوتے۔ تو انہیں احساس محرومی ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بڑا مشورہ واقعی ہے کہ ابدالی نے جب پانی پت کا معرکہ سر کیا۔ تو دلی کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں۔ تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا: ایں جانار قنہ حار کجا است۔ یعنی یہاں قنہ حار کا انار کہاں ہے۔

جو میں یہاں قیام کروں۔ وہ قندھاری انار کے ذائقے سے واقف تھا۔ اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر
ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

منافقین کا مال بھی یہی ہوگا۔ چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چٹھا تھا۔ اس
لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہوگا۔ اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دھڑ
دھڑ میں اعنافتہ ہوگا، اسی لیے اس کو عذاب الیم کہا گیا ہے۔

الْعَمَّ

درس ہفتم

البقرہ - ۲۵

آیت ۱۳ تا ۱۶

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ
 السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذْ
 لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِكُمْ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيُطَانِهِمْ قَالُوا
 إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُتَهَيِّزُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
 وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
 اشْتَرُوا الضَّلَالََةَ بِالْأَمْدِ ۖ فَمَا رَجَعَتِ تِجَارَتُهُمْ وَمَا
 كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ : اور جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ اس طرح جس طرح دروگر
 لوگ ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بیوقوف لوگ
 ایمان لاتے ہیں۔ سنو! بیشک یہی لوگ بیوقوف ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں ﴿۱۳﴾
 اور جب یہ سنے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لاتے، تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان
 لاتے ہیں۔ اور جب یہ تنہا ہوتے ہیں۔ اپنے شیطانوں (سرداروں) کے پاس تو کہتے
 ہیں، ہم تم سے ساتھ ہیں۔ بیشک ہم تو ہنسی کرتے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کے ساتھ
 ہنسی کرتا ہے۔ اور مہلت دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں وہ سرگردان ہو رہے ہیں ﴿۱۵﴾
 یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خریدے گمراہی کو ہدایت کے بدلے پس نہیں فائدہ دیا
 ان کو ان کی تجارت نے۔ اور نہیں تھے یہ لوگ ہدایت پانے والے ﴿۱۶﴾

ہدایت کے اعتبار سے قیہ اگر وہ منافقین کا ہے۔ کل بھی ان کا ذکر ہوا تھا۔ اور آج کی آیت
 میں بھی منافقین کا ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی خرابیوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا
 ہے۔ پہلی آیت میں آیا تھا کہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے
 ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان کی نفی فرمادی ہے۔ کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

گذشتہ سے پورے

اور ایمانداروں دونوں سے دغا بازی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ان کے دھوکے سے بچائے گا۔ کیونکہ ان کا دھوکا ان کی اپنی ہی جانوں پر ہے اور یہ ان باتوں کو سوچتے تک نہیں۔ ان کے دلوں میں شک، تردد اور نفاق کی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو امد بڑھا دیا ہے۔ امد ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ کیونکہ یہ تھوٹ بولتے تھے ظاہر اسلام کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر تھا۔ ان کی ایک اور بیماری فساد فی الارض تھی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو اکڑ جائے اور کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہمیں کوئی فساد کیسے کہہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی لوگ فساد میں مگر یہ سمجھتے نہیں۔

حقیقی ایمان

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور غرابی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُسی طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یہ قائلو! تو جواب میں کہتے ہیں أَلَوْ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ کیا ہم جی اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں فرمایا لَا يَنْفَعُهُمْ هُمْ السُّفَهَاءُ سن لو! بیوقوف خود ہی ہیں وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ مگر یہ جانتے نہیں۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ منافقین تو بڑے ایمان کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بظاہر تو وہ ایمان لاچکے تھے۔ تو پھر وہ یوں کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح کیسے ایمان لائیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بات بڑے مسلمانوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے خاص محترم آدمیوں کے دربر کرتے تھے جنہیں اپنا راز داں سمجھتے تھے کہ وہ ایسی بات کا بُرائی نہیں منائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ قابل غور ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ۔ جیسے مَدَسَّرُ مُسْلِمَانِ ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ فلاح کا دار و مدار اُسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ، شوائع نفسانیہ، ریاکاری، طلبِ جاد وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں کسی بطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار بہ گز مفسد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دل کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول

کرو۔ دوسرے مقام پر آئے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا ۝ اے ایمان والو! ایمان لاؤ
یعنی محض زبانی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لاؤ۔ وہ دوسرے لوگ کون
ہیں؟ بلاشبہ وہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاص کے ساتھ
ایمان لائے۔ ابن عساکرؒ جو بہت بڑے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن
عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ کَمَا
أَمَّنَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ ۖ یعنی جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ،
حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ایمان لائے ہیں، اس طریقے پر تم بھی ایمان لاؤ۔ ان کا ایمان خلوص اور
حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے معیار پر پورے اترو محض زبانی دعوے سے بات نہیں بنے گی تم تو
جھوٹے ہو وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۖ یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہیں۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَبِأَنِ آمَنُوا
بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۖ اَلَا أَرَىٰ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ یہاں سے معیار حق ہونے والی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔
کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ معیار حق ہیں۔ یہ اصحاب کبار اگرچہ
نبی کی طرح معصوم تو نہیں ہیں۔ مگر امت کے لیے نمونہ ہیں۔ وہ اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی
وجہ سے ان خرابیوں سے محفوظ تھے۔ جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جن
کی وجہ سے آدمی ناکام ہو جاتا ہے معیار حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں
فرمایا ہے لَسْتُ كُؤُلُوشُهُدًا ۖ عَلَى النَّاسِ وَيَكُودُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ
شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ جو جاوید لوگوں کو جاننے والے
لہو معلم اور اللہ کا رسول تمہیں جاننے والا ہے :

۱۔ تفسیر درمنثور ص ۳۲ بحوالہ ابن عساکر و تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ ص ۱۰۷
۲۔ قرآن مجید ترجمہ شاہ عبدالقادر ص ۳۲ مطبوعہ تلج کمپنی

گویا اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو فونے کی مجاہدت تیار کر کے ان سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ بھی فرمایا اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ خدا کی زمین پر تم اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم بُرائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں بھی بُرا ہوگا۔ اے صحابہ! تم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ کے یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے متعلق فرمایا اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبُهُ يَعْنِي اللّٰهُ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے۔ یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلب پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے، کیا وہ معیار حق نہ ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے جو خلوص سے بھر پور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

انسان ہوا
اسکا دل

النَّاسُ يَعْنِي انْسان اُنْس کے ماٹے سے ہے۔ انسان اس لیے انسان ہے کہ اس میں الفتن اور مانوس ہونے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں اے مَا سَمِعْتَ الْاِنْشَانَ اِلَّا رَاَيْتَهُ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اُٹا ہوتا ہے مَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنْتَ يَتَقَلَّبُ اَيْکَ تَوْبَةٍ اپنی وضع کے اعتبار سے اُٹا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا چنیدا اوپر اور سر نیچے ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں ہٹیاں آتی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ يُحَوِّلُ بَيْنَ الْمَعْدِ وَقَلْبِهِ اللّٰهُ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ اس لیے محتاط رہنا چاہیے۔ ذرا سی غلطی پر خدا تعالیٰ دل بدل سکتا ہے۔ اسی لیے دعائیں بھی ایسی کہتے يٰمُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ اے دلوں کو پھٹنے والے اللہ کریم! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔ بہ حال انسان

کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر انس کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔

حقیقی انسان
کون ہیں؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی یہاں پر ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسلانے کے وہی لوگ مستحق ہیں جو حقیقی ایمان سے معمور ہیں۔ یہی لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں، اور انہی کی وجہ سے دنیا کا نظم درست رہتا ہے۔ جو لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُولَٰئِكَ كَالْاَنْفَامِ بَلَّوْهُمْ اَصْلًا یہ تو جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ یہ انسان کسلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور جھتی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ لہٰذا حقیقی انسان وہ ہیں جو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

بیوقوف کون ہیں؟

پہلے گزر چکا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح راسخ ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں حالانکہ حقیقت میں منافق ہی بیوقوف ہیں۔ مگر انہیں علم نہیں۔ یہ لوگ ایمانداروں کو اس لیے بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کے نفع سوئے کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی ٹمک و درد میں لگے رہتے ہیں۔ مگر وہ بیوقوف یہ بات نہیں سمجھتے کہ عقل مند ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نقصان سے بچ جائے اور فائدہ حاصل کرے ایماندار دنیا کے اس عارضی فائدے کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کے ابدی فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا صحیح معنوں میں عقل مند ہی میں اور منافق بیوقوف ہیں۔ جو آخرت کو چھوڑ کر عینی حقیقی اور ابدی فائدہ کو بھائی دنیا کا عارضی اور فانی فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بیوقوف جانتے ہیں۔ اور اس طرح اس فریب سے دنیا کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ حقیقت میں یہی بیوقوف ہیں وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ مگر یہ حقیقت حال کو نہیں جانتے۔

منافقوں کی
دو ٹہنی پالیسی

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

جب یہ ایمان لائے تھے تو خوشام کرتے ہیں قَالُوا آمَنَّا بِكَ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں تاکہ نشان میں اپنی پارٹی کے آدمی سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے وَلَاذِ أَخْلَوْا إِلَىٰ شَبِيهِهِمْ جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں۔ قَالُوا لَا نَمَعُكُمْ تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہم نہیں، فَمَا نَحْنُ مُتَهَيِّدُونَ یہ تو ہم مسلمانوں کا محض تمسخر اڑا رہے ہیں۔ تو یا محمد ان کی نصیحت کا دعویٰ کر کے نہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہاں پر شیاطین سے مراد منافقوں کے بڑے بڑے سردار اور سرغنہ ہیں جو نفاق کے پروگرام کے بانی تھے۔

بعض بول اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی نقطہ نظر سے ان لوگوں کو بے وقوف یا شیطان کا لقب دینا کسی قدر زیادتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ القاب اس وقت دیے گئے ہیں۔ جب تبلیغ کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی کرتوتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تبلیغ کے ابتدائی دور میں اس قسم کے القاب دینا درست نہیں مگر اتمام محبت کے بعد ایسا کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ منافقین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمسخر اڑا رہے ہیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمُ اللَّهُ تَعَالَىٰ ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے وَيُمِذُّهُمْ فِي ظُلُمَاتِهِمْ اور مہلت دیتا ہے، ان کی سرکشی میں کھینچ دیتا ہے اور سرگردان ہو رہے ہیں۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا تو فعل غیث اور ناجائز ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام غیوب سے متبرک ہے۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ استہزاء نہیں بلکہ مشاکلت ہے۔ یعنی جو سلوک منافقین نے مسلمانوں کے ساتھ کیا، وہی ہی سلوک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا۔ اس قسم کی مثالیں دروس و معامات پر بھی ملتی ہیں مثلاً جَزَاؤُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ بڑائی کی جزا بڑائی ہے ملاخہ جزا تو عدل کا نام ہے۔ اور عدل بڑائی نہیں ہوتی۔ تو یہاں پر بھی مراد یہی ہے کہ جیسا سوال ہے اس کا ہم شکل جواب ہے۔ یہی بات ہے وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا میں

استہزاء من اللہ
کا مضموم

بھی پائی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی لطافت، بجاغت اور فصاحت ہے۔ اور اُسے مخالفت کہتے ہیں اس طرزِ کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے استنزار کا نقصان انہی کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے تمسخر کا ضربہ خود ان کی طرف جاتا ہے۔ وہ نہ کہہ سکتے کہ ضرر پہنچا نہیں گئے۔ بنی علیہ السلام اور مومنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ ان سے ضرر نہ لیں **اللَّهُ يَكْتُمُ سِرَّهُمْ**۔ استنزار منجانب اللہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ دیا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے چونکہ منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعتِ مسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ **يَعْنِي نَوَالِيَا كَرْنِي دَر۔** وہ نمازیں پڑھیں، صدقہ دیں، جہاد میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل فیسوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں لہذا ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ بھی گویا ان کے ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن منافقین دوزخ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے۔ تو جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ گویا انہیں جنت میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے، تو وہ محسوس کریں گے کہ واقعی انہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ وہ دوڑ کر جنت کے دروازے پر پہنچیں گے مگر اتنے میں دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور منافق نامہ دروازہ جائیں گے۔ **اللَّهُ يَكْتُمُ سِرَّهُمْ** کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ یہ لوگ اس دنیا میں اس قسم کی چالاکی کر رہے ہیں، تو کل قیامت کے دن ان کے ساتھ بھی تمسخر ہوگا۔

گائے کا واقعہ اس سورۃ میں آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا آدمی قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ گائے ذبح کریں، تو اس

موقع پر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہم سے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا، اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تم سے ٹھٹھا کر کے جابروں میں شمار ہو جاؤں۔ خدا کے بندو! میں تو اللہ کا حکم تم کو سنا رہا ہوں کہ گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا ستر امرے پر مارو۔ تو قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ میں تم سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔

الغرض! فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کی سرکشی میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ اور وہ اندھے ہو رہے ہیں یہاں پر یَقْمَهُوْنَ سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج میں ہے۔ کہ دیکھو ظاہری آنکھیں اکثر اندھی نہیں ہوتیں تَقْمَى الْقُلُوبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُورِ وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینوں میں موجود ہیں۔ زور دے سمجھ بات کو دیکھتے ہیں نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ آگے ان کی مثالیں بھی آ رہی ہیں۔

فَرِیَا اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی مِیْسِیْ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں۔ ظاہر میں انہوں نے زبان سے یہی کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بے عقیدگی اور گمراہی کو اختیار کیا فَعَا رَبَّیْ حَتَّی تَجَارَ تَهُمْ پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا وَهَآ کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔

یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے۔ کہ یہ تمہاری پونجی ہے۔ اس کے ساتھ اعمال خیرہ و۔ اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادوں کی تیش پڑے۔ ہی ہے۔ اور یہ برف چلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے چھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لو گے۔ تو یہ عمر

کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے
 بے لے کفر، شرک، بدعتیہ گی، معاصی اور لہو و لعب خریہ، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خلتے میں مبتلا
 ہو جاؤ گے، اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک
 اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہر ملا بل خریہ سے۔ اگر تریاق حاصل کر لیا تو بہر قسم
 کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر فہم خواستہ اس نے زہر کو پسند
 کیا۔ تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ اور یہ
 لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض خرابیاں بیان فرمائی ہیں۔ اگلی آیات میں
 مثال کے ذریعے ان کی مزید خرابیاں اور ان کا انجام بیان فرمایا۔

الْعَمَّ درس ہشتم ۵

البقرة ۲
(آیت ۱۸۱، ۱۸۲)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْفَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَّ
يُبْصِرُونَ ۝ (۱۷) صُمُّوا بَكُمْ عَمَىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ (۱۸)

ترجمہ: ۱۷۔ ان منافقوں کی مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلانی جب
آگ نے اس کے — اس پاس کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی
زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ۱۸۔ وہ ہرے،
گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے ۱۸

بدبختی اور شقاوت کے لحاظ سے درسر اگر وہ منافقین کا ہے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال
بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا کام جھوٹ بونا، فریب دینا، زمین میں فساد کرنا ہے وہ ایمانداروں کو
بیوقوف کہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے۔ جب انہیں حقیقی مومنوں
کی طرح ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں۔
مسلمانوں کی جماعت کے دہرہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے۔ تاکہ ان کی جان و مال محفوظ رہے۔ اور
ان کے حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو کہتے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں حقیقت میں ہم ان کے ساتھ نہیں
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک نشانی یہ بھی بتائی کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے میں
گمراہی کو خرید لیا۔ اور اس تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ بلکہ ایسے لوگ ابدی نقصان میں
بتلا رہے۔

گذشتہ سے پورے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں جن سے منافقوں کے حالات
پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاملہ واضح اور قریب الغم
ہو جائے جو چیز فامض اور باریک ہوئے واضح کر دیا جائے۔ ایسی مثالیں تمام آسمانی کتب میں بیان

کتب آسمانی
اور املا

کی گئی ہیں۔ تورات، زبور اور انجیل میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ اور دیگر قلم آسانی صحیفوں میں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا اپنا بیان ہے وَ قُلْتُ اَلَا مَثَلٌ نَضْبُوْهُ لِّلنَّاسِ ۚ وَ مَا يَعْقِلُوْهُۚ اِلَّا الْعَالَمُوْنَ یعنی ہماری ان مثالوں سے اہل علم ہی سمجھ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مقصد کو پالیتے ہیں۔

شیخ ابو بکر ابن العربی مابکی نے تفسیر احکام القرآن مکمل کی ہے۔ آپ کی تفسیر میں تین چار کتابیں ہیں۔ حدیث کی شروح، فتویٰ، نحو اور دوسرے علوم و فنون میں بھی بے شمار کتابیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ صرف سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار مثالیں بیان کی ہیں۔ گویا قرآن کریم دیگر آسمانی کتب اور قلم حکماء کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت لقمانؑ ان کی طرف منسوب کتب، نیز ہر زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں کے کلام میں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

تفاسیر
احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں قرآن پاک کی صرف انہیں آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ جن میں حلال و حرام کے احکام بیان ہوئے ان میں سے اہم کتاب ابو بکر جصاص رازیؒ کی احکام القرآن ہے۔ دوسرے مفسر ابو بکر ابن العربی اندلسیؒ ہیں۔ آپ کی احکام القرآن مابکی مسلک کے مطابق ہے۔ اسی طرح کشف و تصوف کے بہت بڑے اہم شیخ ابن عربیؒ کی تفسیر احکام القرآن ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ایک چھوٹی سی تفسیر لکھی ہے جس کا نام اکیلیلی فی استنباط التذریذ ہے۔ اس میں قرآن کریم کی اُن آیات کی مختلف تفسیر ہے۔ جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ آپ نوری اور دسویں صدی کے حافظ الحدیث ہوئے ہیں۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں پائی۔ اٹھ سال کی عمر میں وفات پائی مگر پانچ سو تینوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث نہیں ہوا۔ حافظ الحدیث وہ بلند پایہ ہوتی ہے۔ جسے ایک لاکھ حدیث جمع سند زبانی یاد ہو۔

آپ کے بعد بڑے بڑے محدثین ہوئے ہیں۔ مگر حافظ الحدیث کوئی نہیں ہوا۔ البتہ

آپ سے پہلے ہزاروں کی تعداد میں حافظ الحدیث، ائمہ کبار، جن میں بخاری شریف کے شارح ابن حجر شافعی اور علامہ سیوطی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح صحیح ستہ کے تمام مؤلفین حفاظ حدیث تھے۔ ان کو کم از کم ایک لاکھ حدیث مع سند اور رجال کے زبانی یاد تھی۔

مثال کی حکمت

الغرض مثال بیان کر چکی حکمت یہ ہوتی ہے کہ کسی باریک چیز کو انسانوں کے ذہن کے قریب تر کر دیا جائے۔ اور عقلی چیز کو محسوس بنا دیا جائے۔ مثال کے ذریعے کہیں کسی چیز سے نفرت دلانا مقصود ہوتا ہے، تو کہیں کسی چیز کو ثابت کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہودیوں کی بُرائی اور قباحت اس طرح بیان فرمائی ہے مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الصَّورَةَ ثُمَّ كَفَرُوا يَحْمِلُونَهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ هَٰمِينَ تَوْرَةً
نے توراہ کو بگاڑ دیا۔ انہوں نے اُسے اس طرح نہ اٹھایا جس طرح اٹھانے کا حق تھا۔ تو اُن کی مثال گمبھ کی ہے، جس پر کتابوں کا دفتر لاد دیا گیا ہو۔ جو اُن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ گمبھ کو علم ہی نہیں کہ اس کی پشت پر کتابوں کا بوجھ ہے یا سکرٹوں کا گٹھا۔ تو یہی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بیان فرمائی۔ کہ توراہ کے حاملین ہونے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہو سکے۔

منافقین کی مثال

منافقین کی دو مثالوں میں پہلی مثال آج کے درس میں بیان ہوئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ مثال اُن منافقوں کے بارے میں ہے جن کے دل میں کفر پختہ ہو چکا ہے۔ اور دوسری مثال جو آگے آرہی ہے، اُن منافقوں کے متعلق ہے جو ابھی متردد ہیں اور شک میں مبتلا ہیں۔
الغرض! اس پہلی مثال کے مصداق پختہ کفر والے منافقین ہیں۔ جن کے ہدایت پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور جن کے متعلق پہلی آیات میں گندہ چکا ہے کہ انہوں نے اپنی کوتاہ نظری اور غلط فہمی کی بنا پر ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خرید لیا۔

فرمایا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ اِنَّ مَنَافِقِينَ كَمَثَلِ اَسْرِ
شخص کی طرح ہے۔ جس نے جہنم کی حالت میں آگ جلائی۔ تاکہ اُس سے مدد ملے اور گرمی حاصل کر لے۔ یہ دونوں چیزیں ضروریات زندگی میں سے ہیں جن کے بغیر گزارا نہیں۔

چنانچہ ان منافقوں نے بھی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کی۔ لوہے پر غصیر علیہ السلام کی صحبت اختیار کی ان لوگوں نے اہل ایمان کی رفاقت بھی حاصل کی۔ اور زبان سے اقرار کیا اَمَّنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ چاہیے تو یہ تھا کہ ایمان کی اس روشنی سے اُن پر تمام حقائق روشن ہو جاتے۔ مگر انہوں نے تو صحیح معنوں میں ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ محض وقتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر وہ دل سے نہ ایمان کی آگ کو روشن کرتے۔ تو ان میں الطاعتِ الہی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور ان کے دل میں ذکرِ الہی کا شوق پیدا ہوتا۔ اُن کے دل بھی توحیدِ خالص سے سحر ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو وقتی طور پر ایمان کا اعلان کر کے اپنے مال و جان کی حفاظت چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے هُنَّ قَالَتْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَتَدْعُكُمْ مِثْلِي مَالًا وَنَفْسًا حُضُورِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا جس نے زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کر لیا اس کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو گئی۔ اسی سے یہ منافقین اپنی فطری صلاحیت کو برے کار لائے ہوئے نہ بنی ایمان لے آئے۔ ان کا یہ ایمان لانا گویا جھگل کے اندھیرے میں آگ جلانے کے مترادف تھا۔

فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَبَّ اُسْ آگ نے آگ جلانے والے شخص کے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ اُسے محسوسِ اہست گرد و پیش کا پتہ چل گیا۔ تو پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس آگ کو بجھا دیا۔ یہاں پر اَطْفَأَهَا اللہُ محذوف ہے۔ اس طرح کہ موت طاری ہو گئی۔ جب وہ آگ بجھ گئی جس کی روشنی میں یہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کر رہے تھے۔ تو پھر ذَهَبَ اللہُ بِسُودِهِمُ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کو لے گیا۔ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ اور انہیں بے پناہ اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ پھر اُن کی حالت یہ ہو گئی کہ لَا يُبْصِرُونَ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ روشنی تو عارضی تھی جب وہ منقطع ہو گئی۔ تو وہ اپنی اختیار کردہ بازیوں کے افتاء اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اس مقام پر جن اندھیوں کا ذکر ہے۔ اور جن میں منافقین سرگردان ہیں اُن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری منافقین کی جماعت پر صادق آتی ہیں۔

اندھیروں کی
مختلف قسمیں

سب سے پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔ یہ لوگ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر کا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے: **اللَّهُ قَوْلُ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ** یعنی اللہ تعالیٰ ایمانداروں کا دل اور کارساز ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے جس کی وجہ سے دل میں روشنی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ روشنی آگے چل کر حقیقی روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔

فرمایا دوسرا اندھیرا جو منافقین میں پایا جاتا ہے۔ وہ مکروہ فریب کا اندھیرا ہے۔ **يُخَذِّعُونَ اللَّهَ وَلِذِينَ آمَنُوا** یہ وہی دھوکے اور فریب کا اندھیرا ہے۔ جو وہ اہل ایمان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرا اندھیرا دروغ گوئی اور اقرار کا ہے۔ جیسا فرمایا **يَمَّا كَانُوا يَكْذِبُونَ** کہتے ہیں ہم مومن ہیں۔ حالانکہ یہ صریح محبوب بول رہے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔ ان کے دل میں کفر چاہا ہوا ہے۔ لہذا یہ ایمان کے دعوے میں مہوٹے ہیں۔

منافقین کا چوتھا اندھیرا طعن و تشنیع کا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان کو احمق اور بیوقوف کہتے تھے۔ حالانکہ ایمان والے آخرت کے طلبگار ہیں۔ انہوں نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اختیار کیا ہے مگر منافق ان کو بیوقوفی کا طعن دیتے ہیں۔ یہ ان کا چوتھا اندھیرا ہے۔

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہل بسیط اور جہل مرکب۔ کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو یہ جہل بسیط ہے۔ جب بھی ایسا شخص متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کرے گا۔ وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔ دوسری قسم کا جہل جہل مرکب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھنے لگے۔ بڑے عقیدے کو اچھا خیال کرے۔ یہ بہت خطرناک جہت ہے کیونکہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا اور نہ وہ اس جہالت سے نکلے گا۔

منافقین کا پانچواں اندھیرا جہل مرکب ہے۔ وہ اپنے دھوکے اور فریب کو بڑا اچھا سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ پانچویں قسم کے اس اندھیرے میں مبتلا ہیں۔

پہٹا اندھیرا معاصی اور شہوات کا اندھیرا ہے۔ اطاعت و روشنی ہے اور معاصی اندھیرا ہے جن خواہشات کی تکمیل میں یہ لوگ سرگردان ہیں۔ وہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ساتواں اندھیرا قبر کا اندھیرا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلُمَةً عَلٰی اَهْلِهَا یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے دل میں نورِ ایمان رکھتا ہوگا۔ اس کو وہاں بھی روشنی میسر ہوگی۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ ایمان والوں کے دل سے روشنی کی لٹ نکلتی گی، نیز ان کے اعمال صالحہ کی روشنی انہیں حاصل ہوگی۔

بخاری شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلْظُّلُمَةُ ظُلُمَاتٌ يُّوَفُّ الْقِيَمَةَ اس دنیا میں کسی پر کیا گیا ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ قبر میں جا کر پتہ پتہ چلے گا۔ کہ ظلم کا اندھیرا کس قدر شدید ہے۔ پل صراط سے گزرتے وقت حشر کے میدان میں ادھر پھر دوزخ کی گہرائیوں میں اندھیروں کا احساس ہوگا۔ الغرض! یہ تمام اندھیرے ہیں جو منافقین پر وارد ہوں گے۔ اور یہ لوگ غضب الہی کا شکار ہوں گے۔

ان لوگوں کی بد نصیبی کی حالت یہ ہے کہ صُفْہَہٗ یہ ہرے ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس قدر خراب کر لیا ہے۔ کہ صحیح بات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ اس بد بختی کی بنا بر بکُفْرَ یعنی گونگے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی سچی بات نہیں نکلتی۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کے سوا ان کی زبان پر کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ حُسن و قبح میں، اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ عُصٰی یعنی اندھے بھی ہیں۔ ان کی ظاہری آنکھیں تو موجود ہیں۔ مگر ان کے دل اندھے ہیں۔ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایمان و شرک، سنت اور بدعت ان کے نزدیک برابر ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

فرمایا یہ لوگ کفر و شرک اور معاصی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں۔ فَهٖمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس ہٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھتے منافقوں کا یہ حال بیان فرما دیا۔

لَا يَرْجِعُونَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ
 واپس آ کر کوئی نئی کمائی کر لے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدیل نہیں ہو سکے
 گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں مٹ سکتی ہیں مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیے گئے اعمال میں
 کوئی رد و بدل نہیں ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِفَةً فِي
 عُقْبَتِهِ" ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد وُخْرِجُ
 لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا قیامت کے دن ہم نکال کر سامنے کر دیں گے۔ کہ یہ تیرا اعمال
 نامہ ہے۔ لو خود پڑھ لو۔ لطف یہ ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت بھی اُس وقت دیا ہو جائے گی
 اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لو خود پڑھ لو الغرض فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ کا مطلب یہی ہے کہ یہ
 پلٹ کر نہ ہدایت کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دنیا کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی کمائی
 کر سکیں گے۔ یہ اُن منافقوں کا حال ہے جن کے دل کفر میں راسخ ہو چکے ہیں۔

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٢٠﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْءٌ فِيهِ إِذَا ظِلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢١﴾

۲
۳

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اترنے والی اس بارش کی ہے۔ جس میں آرجیاں گرنے اور بجلی کی چمک ہے۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ بادل کی کڑک سے موت کے ڈر سے۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ جب وہ ان کے لیے روشنی کرتا ہے۔ تو اس میں چلتے ہیں۔ اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۰﴾

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی برائی میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال گزشتہ درس میں گزرتی ہے کہ منافقوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے جنگل میں آگ جلائی ہو۔ اور جب اُس نے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو لے گیا۔ اور آگ کو بجھا دیا۔ منافقین کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے وہ ہرے گونگے اور اندھے ہیں پس وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

گزشتہ پورے

یہ پہلی قسم کے وہ منافق ہیں جو اپنے نفاق میں پختہ ہیں اور جبل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کی اصلاحات کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ رہے ہیں۔ ایسے لوگ محض چال بازی اور فریب کاری کی بنا پر کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ

اور قیامت پر ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر ایمان کا شائبہ تک نہیں۔

منافقوں کی
دوسری مثال

دوسری مثال اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کی بیان کی ہے، جن کا کفر کسب نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ متردّد ہیں۔ ان کا رجحان کبھی اسلام کی طرف ہوتا ہے، اور کبھی باطل عقیدے کی طرف تو ایسے لوگوں کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ساتھ دی ہے۔ جس طرح بارش کے نتیجے میں بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح ظہور اسلام کے ساتھ منافقین کے لیے بھی کئی ایک چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ ترہیاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ان متردّد قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی طرف سے بالکل ایسی نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا ہے، کہ کسی وقت ان کے ذہن میں صحیح چیز آجائے۔ اور یہ نفاق سے باز آجائیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اعتقادی منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے۔ بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔

اعتقادی اور
عملی منافق

منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ دل میں نورِ ایمان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، پیغمبر علیہ السلام کی رسالت اور قیامت پر ایمان ہے۔ مگر ظہر اور باطن میں مطابقت نہیں پائی جاتی حضور علیہ السلام نے عملی منافق کی بہت سی نشانیاں بتائی ہیں مثلاً اِذَا اَوْثُمْنَ خَانَ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ اِذَا خَاَصَمَ فَجَرَ جب کسی سے جھگڑا کرتا ہے۔ تو گالی گھونچ پر اُتر آتا ہے۔ اور اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وعدہ کرتا ہے، تو خلاف ورزی کرتا ہے ایسا شخص اعتقادی نہیں بلکہ عملی منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض نماز، روزہ وغیرہ کو فسخ و بھتہ ہوئے انہیں بھانسیں لاتا۔ ایسے عملی منافقوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

مذہب احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلْقُلُوبُ اَرْبَعَةٌ یعنی دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے متعلق فرمایا قَلْبٌ اَجْرَدٌ ایسا دل جو صاف و شفاف ہو۔ فرمایا اس کی مثال روشن چراغ جیسی ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہ ہو۔

دل کی
چند قسمیں

دوسرا دل اعلیٰ ہے۔ جو غلاف میں بند کر دیا گیا ہو اور پھر اوپر سے دھاگے کے ساتھ
باندھ دیا گیا ہو۔ فرمایا تیسری قسم کا دل معکوس ہے یعنی اوڑھا ہوا ہے۔ اس کا سر نیچے اور پیٹ اوپر
ہے۔ اور چوتھی قسم کا دل مصغ ہے۔ یعنی دو پہلو والا دل۔

پہلی قسم کے دل کے متعلق فرمایا کہ صاف و شفاف دل مومن کا دل ہے۔ جس میں فداکاری
بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی خرابی یا کسی قسم کی عیوب نہیں ہوتی۔ غلاف میں بند دل کے
متعلق فرمایا۔ یہ کافر کا دل ہے امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی
پرندے کو ایسے بجرے میں بند کر دیا گیا ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ ایسا دل کافر، مشرک یا دہریے
کا ہوتا ہے۔ جس میں سے باہر دیکھنے کے لیے سوئی کے برابر بھی سوراخ نہ ہو۔ کہ وہ اپنے خول سے
باہر حق کی بات کو دیکھ سکے۔ فرمایا اوڑھا دل منافق کا دل ہے۔ جس نے ایمان کو پہچان تو لیا ہے
مگر قبول نہیں کیا۔ محض اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی فریب کاری کی ہے۔ مگر ہے پکا منافق۔ دو پہلو دار
دل، تو وہ ایسا ہے، جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی۔ یہ عملی منافق ہے۔ جسے کسی حد تک یقین
بھی ہوتا ہے۔ اور کبھی متردد بھی ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا ایمان کی مثال گھٹیلے بقلے یعدھا نمکاً و
الطیب اُس پوٹے کی ہے، جسے پاکیزہ پانی سیراب کرتا ہو۔ پوٹے کا بیج اچھا ہو، اُس کی
آبیاری بھی صاف پانی سے ہو، تو ظاہر ہے کہ اُس کی نشوونما بھی اچھی ہوگی۔ نیز فرمایا کہ منافق کی
مثال انسانی جسم میں پیدا ہونے والے پھوڑے کی ہے۔ ایک طرف سے پیپ آتی ہے۔
تو دوسری طرف سے خون کا دورہ ہوتا ہے۔ گویا پھوڑے کی غذا خون اور پیپ ہوتی ہے۔ ان
میں سے جس چیز کا غلبہ ہوگا، تو مریض ملکہ ہو جائے گا۔ اور اگر خون غالب آگیا۔ تو صحت یابی
ہو جائے گی۔ منافق میں دونوں قسم کے مائے پائے جاتے ہیں۔

دل کے حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ
بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قلب پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔

یعنی حیات اور موت۔ صحت اور بیماری، بیداری اور خندہ، فرماتے ہیں کہ قلب کی حیات ہدایت کی مروجہ منت ہے۔ اگر ہدایت نصیب ہو گئی ہے تو سمجھ لیں کہ دل زندہ ہے۔ اور قلب کی موت گمراہی سے واقع ہوتی ہے۔ فرمایا مَوْتُهُ الْخَلَلَةُ دِل کی موت کا سبب گمراہی ہے۔ کسی قسم کی گمراہی دل میں پیدا ہو جائے۔ سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو گیا، اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

قلب کی صحت طہارت اور صفائی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور طہارت کا حصول ایمان اور توحید کی بدولت ہے۔ کہ ایمان کے بغیر طہارت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف قلب میں بیماری، کہ مدت گزرتے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے: **يُؤْخَذُ لَّا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنۡ اٰتٰی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ** اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے قیامت کے تذکرہ میں فرمایا: اُس دن نہ مال کسی کام آئے گا۔ اور نہ اولاد مفید ہوگی، مگر جو قلب سلیم لے کر پہنچ گیا، اُس کو فائدہ ہوگا۔ اور قلب سلیم وہی ہے جس میں طہارت، پاکیزگی اور نور ایمان ہوگا۔

فرمایا دل کی بیداری ذکر الہی میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کا دل بیدار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ** اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہے تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر غفلت کی خندہ طاری ہے قرآن میں جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو **وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ** اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

فرمایا منافق کی مثال ایسی ہے **اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ** جیسے آسمان سے بارش آتی ہے۔ صیب کا معنی زور سے برسنے والی بارش ہے اور عربی زبان میں سماء آسمان کو بھی کہتے ہیں، فضاء کو بھی اور یہ لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے چھت

بارش کی مثال

کو بھی سہا۔ کہتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر سہارے مراد بادل ہیں۔ کیونکہ بارش بادلوں میں سے برستی ہے ہو سکتی ہے اس کا تعلق آسمان سے بھی ہو۔ جس کو عام انسان اور سائنس دان نہیں سمجھ سکے تاہم بظاہر بارش کا تعلق بادلوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں پر آسمان کا لفظ فرمایا۔

فرمایا فِيهِ ظُلُمَاتٌ اس میں اندھیرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بارش کے دوران بادل چھائے ہوئے ہیں اور سورج غائب ہوتا ہے، اور کسی قدر اندھیرا ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا رات کے وقت ہو تو تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سائے تک نظر نہیں آتے۔ جب قرآن پاک نازل ہوا۔ تو اس وقت ہر طرف کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیروں کے علاوہ فرمایا وَدَعَا اس میں گرج بھی ہوتی ہے۔ فرشتے بادلوں کو ہانک کر لاتے ہیں۔ تو ان کے لئے گرج پیدا ہوتی ہے۔ اے اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں کفر و شرک پر وعید کو بھی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرمایا وَبَرْقِ بَارَشٍ میں اکثر اوقات بجلی بھی چمکتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ بادل آپس میں رگڑ کھاتے ہیں۔ تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کا معنی یہ بھی ہے کہ قرآن پاک میں بڑے واضح دلائل موجود ہیں جن سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دلائل بمنزلہ برقیے ہیں۔

منافقین کی
بے بسی

فرمایا منافقوں کی حالت یہ ہے کہ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ من الصواعق اپنی انگلیاں کرکڑک کے خوف سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ جب بارش کے دوران بجلی چمکتی ہے۔ اور بادلوں میں گرج پیدا ہوتی ہے۔ تو دہشت کے مائے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ حَذَرَ الْعَوَاقِبِ کہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔ موت کے ڈرے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موت سے بھاگ نہیں سکے۔ کیونکہ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے۔ وہ پکڑنا چاہے گا تو فوراً گرفت کر لے گا۔ منافقین کا خوف و ڈر انہیں اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔

فریاد یکاۃ الذوق یخطف ابصارہم قریب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراضگی کی وجہ سے ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ اور وہ اندھے ہو کر رہ جائیں۔ کَلَمًا اَضَاءَ لَهُمْ مَشْرَافِیْہِ جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْہِمُ قَلَمُوْا اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اہم جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کفر و شرک کا ذکر فرمایا ہے اور یہ اندھیروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں، بصارت، قلب اور حواس عطا کئے۔ یہ سب اس کے انعام ہیں۔ اور ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ منافقین کس خیال میں پھرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں چھین نہیں سکتا بلکہ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمِیْعِہُمْ وَاَبْصَارِہُمْ اَکَر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت ہی زائل کر دے۔ یہ لوگ باطنی طور پر تو اندھے ہی ہیں۔ اللہ چاہے تو ظاہری طور پر بھی ان کی مبنائی ضائع ہو جائے اور قوت شنوائی سلب ہو جائے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت قبول کریں اپنے لیے کمال حاصل کریں تاکہ آئندہ زندگی میں ان کے کام آئے۔ مگر یہ ان ذرائع کو غلط طرہ پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے صحیح طور پر استفادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

النَّاسِ

البقرة ۲

درس دہم

(آیت ۲۱ تا ۲۳)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
 قَبْلِكُمْ لَكُمْ تَشْقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ
 فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ
 بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَشْدَادًا
 وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

قر مجید: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور
 ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گئے ہیں، تاکہ تم بھی جاؤ (۲۱) وہی رب جس نے تمہارے
 لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور آسمان کی طرف سے پانی اتار ہے۔
 پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ
 کے لیے شریک، اور تم جانتے ہو۔ (۲۲)

دوسرے رکوع کے اختتام تک اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ بقرہ
 کی ابتدائی چار آیتوں میں ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اگلی
 دو آیتوں میں ظاہر اور باطن انکار کرنے والے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ اس کے
 بعد تیسرے آیت میں منافقین کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان کی چال بازی۔ دھوکا بازی
 فریب کاری، ریشہ دوانی، ظاہر و باطن میں تغاوت، فساد فی الارض اور غلط عقیدے کا رد ہے۔
 پھر اس کی وضاحت و مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایک آگ کی مثال اور دوسری پانی کی۔
 منافقین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور تمہید بھی کی گئی ہے۔

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ حضرت
 عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی يَا أَيُّهَا النَّاسُ کے خطاب ہے

دہاں روئے سخن اہل مکہ کی طرف ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکثر و بیشتر وہی لوگ کفر میں مبتلا تھے۔ اور جہاں پر **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ ان سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ کہ انہوں نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا۔ اور اسلام کی مرکزیت کے لیے پیغمبر قربانیاں دیں۔ تو یہاں پر **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کے مخاطب دنیا کی تمام اقوام اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے براہ راست خطاب ہے۔ اور جو بعد میں آئے ہوں گے۔
 میں انہیں اہل ایمان کے واسطے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **لَا تُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ** تاکہ میں اس قرآن پاک کے ذریعے تمہیں بھی تمہارے خطرناک انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور جن لوگوں تک یہ قرآن پہنچے گا انہیں بھی متنبہ کر دوں، مگر میں سب کو ان کے بُرے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔

اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں، لہذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مد کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا مضمون خود قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا وحی الہی ہونا ہے۔ جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وحی الہی ہے۔ کیونکہ یہاں پر انسانی عقل و شعور کام نہیں کر سکتے۔ انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الہی ہے۔

اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔ قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھے اور بُرے نتیجے کا دار و مدار روز قیامت پر ہے۔ اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظہور ہوں گی۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔ اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دوچار ہوگا۔ لہذا یہ اہم مضمون بھی بیان ہوا ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو توحید پر کاربند ہونے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ** اے انسانو! اپنے رب

چار اہم
مضامین

توحید

کی عبادت کرو۔ توحید فی العبادت وَتَحْدُثُ اپنے رب کو وحدہ لا شریک مانو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے توحید جیسی سب سے اہم انسانی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عبادت کا مفہوم یہاں لَفْعُ بَدْ میں ذکر کر دیا گیا تھا۔ کہ عبادت حقیقت میں اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنا ہے۔ اور اس خاص معنی سے اور تصور کے ساتھ کرنا ہے کہ پوری کائنات اور اُس کے تمام اسباب پر اُسی مالک الملک کا تسلط ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ عظیم کل۔ قادر مطلق اور مختار مطلق ہے۔ اس ہستی کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی ادائیگی بدن۔ زبان۔ دل۔ مال اور افعال سے ہوتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کر کے اس ہستی کی پہچان کرائی گئی ہے جس کی عبادت مطلوب ہے۔ فَرِیَا اَعْبُدُوْا رَبَّکُمْ یعنی اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور رب خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی انسان کو پالنے والا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کے تمام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ انسانی وجود سے باہر جتنی بھی نعمتیں ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خَلَقَ بیان کی گئی ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ انسان کو سب سے پہلے اور سب سے بڑی نعمت جو میسر آئی ہے، وہ اس کا وجود ہے۔ اسی لیے فرمایا اُس ذات کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ خالق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ الَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ گریا تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اور تم سے پہلے قوموں کا خالق بھی وہی ہے۔

اہم غزالی نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر معرفت الہی

کرنا استعداد سے باہر ہے۔ کیونکہ لَا فِکْرًا فِی التَّوْبَتِ رَبِّ کی ذات میں فکر نہیں ہو سکتی۔
 کہ یہاں تک عقل و شعور کی رسائی نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی پیدا کردہ اشیاء
 میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کی صفات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو اس کی ذات کی
 معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر
 کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی رحمت
 اور اس کی ربوبیت سب کچھ سمجھ میں آئے گا۔ اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل
 ہو جائے گی۔

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا: تم ایک ایسی قوم
 کے پاس جاؤ، جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا
 شَہَادَةُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنْیَی رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ
 وحدہ لا شریک ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بزرگ و رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا
 فَاِذَا هُمْ عَرَفُوْا ذٰلِكَ جب وہ اس کو پہچان لیں تو پھر انہیں نماز، روزہ اور دیگر احکام کا
 حکم دینا۔ گویا سب سے پہلے معرفت الہی اس کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اللہ باقی باتیں بعد
 میں بتاتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے: "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ" ^۱
 انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ
 اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔
 اگر اس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔
 مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ
 بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں
 پہچان کرائی ہے کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لو گے تو اس کی عبادت ہوگی۔ اور اگر اس کی معرفت

ہی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کر دے۔

فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ سے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو عبادت الہی
الَّذِي خَلَقَكُمْ وہ رب جس نے تم کو وجود کی نعمت بخشی۔ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اور جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم بچ جاؤ۔ لَعَلَّ ترس جی کے لیے ہوتا ہے
اور ترس جی کا معنی ہے امید۔ لیکن اہم جلال الہی کی سیڑھی فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک میں لَعَلَّ کا
لفظ تحقیق کے لیے آتا ہے۔ تاکہ تم بڑے انجام اور کفر شرک سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُونَ سلجی معنی متقی بن
جاؤ۔ اس رب کی پہچان کرنے کے بعد اس کی عبادت کرو۔ خَلَقَكُمْ میں صفت ایجاد کا
تذکرہ ہے۔ کہ اُس نے انسان کو عدم اور نیستی سے پیدا کیا ہے۔ جس کے متعلق فرمایا لَمْ يَكُنْ
شَيْئًا مَّا ذَكَرْتُمْ کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اُسے عدم سے وجود میں لایا۔ لہذا اپنے رب
کی عبادت کرو۔ جس نے وجود جیسی نعمت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت سے متعلق احادیث میں بہت سے احکام موجود
ہیں۔ ترمذی شریف اور منہ احمد میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر وحی
نازل فرمائی کہ لوگوں کو ان باتوں کی تبلیغ کرو۔ سب سے پہلی بات یہ کہو کہ اِنَّ تَعْبُدُوْهُ وَاَنْتُمْ كُوْ
بِدٌ شَيْئًا اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ
اس کی مثال ایسی ہے كَمْثَلِ رَجُلٍ اشْتَرَى عَبْدًا کہ کوئی شخص غلام خریدے۔ وہ یہ
یا سونا چاندی غلام خریدنے پر خرچ کرے۔ پھر اس غلام کو کام پر لگا دے۔ اور غلام مزدوری کر کے
جو معاوضہ حاصل کرے وہ اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے شخص کو دے۔ فرمایا يَتَّكِفُوْ
مِنْ يَتَّكِفُوْا عَبْدًا کڈھو اس قسم کے غلام سے کون راضی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا
مالک وہ ہے۔ اُس کی خوراک یا لباس اور رہائش کا بندہ دست دو کرتا ہے۔ مگر غلام دن بھر کی کان
مالک کی بجائے دوسروں کو دے آتا ہے۔ فرمایا مشرک کا حال بھی یہی ہے کہ تمام نعمتیں اور ان کے
اسباب اللہ تعالیٰ نے میاں کیے ہیں۔ مگر وہ تعظیم وغیرہ کرتا ہے۔ یہ مشرک اس ملک حرام غلام

کی طرح ہے۔ جو اپنی کمائی دوسروں کے گھر میں ڈال آتا ہے۔

الغرض فرمایا رب تعالیٰ کی پہچان نشانیوں سے ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک ربوبیت اور دوسری خالقیت اگر انسان غور و فکر کر کے ان صفات کو پہچان لیں گے۔ کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ تو پھر وہ عبادت بھی اُسی ہی کی کریں گے۔

ہارون الرشید نے ام الماک صاحبہ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پر کوئی دلیل بتلائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ انسان کی مختلف بولیاں، مختلف آوازیں، مختلف لہجے اور مختلف نغمے خود خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ دنیا میں چار ہزار مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں کیا یہ وجود الہی پر کچھ کم دلیل ہے۔

وجود الہی پر دلائل

اہل سنت کے چار اماموں میں سے ام ابو حنیفہ اور ام ماک بڑے ام ہیں۔ ام شافعی اور ام احمد ان کے شاگرد ہیں۔ یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ پھر ان بڑے اماموں میں سے ام ابو حنیفہ ام اعظم ہیں۔ ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً آٹھ صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ یہ سعادت کسی دوسرے امام کو حاصل نہیں۔ آپ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے قریب تر ہیں۔ آپ کی ولادت شام میں ہوئی جب کہ عیساؑ کرامؓ شام تک دنیا میں موجود ہے۔

انہیں ام اعظم کا واقعہ ملے۔ کہ دہریوں اور زندقوں کی ایک جماعت آپ کے مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان کا دعوئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود یا ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ جب انہوں نے ام صاحبہ سے گفتگو کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ مُفَكِّرٌ فِیْ اُمُورٍ مِّمَّکُمْ غُورٌ وَفُکْرٌ کَرَبَابٍ ہوں۔ اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی خود بخود دریا میں چل رہی ہے۔ اس کو چلانے والا کوئی ملاح اس میں نہیں ہے۔ مگر یہ پانی کی موجوں کو بہیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اور واپس آرہی ہے۔ وہ کہنے لگے یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ مبتلا

بہتر کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا معتدل بنایا ہے کہ انسان اپنی تمام ضروریات
 اسی سے پوری کرتا ہے۔ اسی پر چلتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مکان بناتے
 ہیں، غرض زمین کو کمال درجے کا فرش بنایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَنَخْرُجُ بِهِ مِنْ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَذَرِكُمْ لِلَّهِ أَنْتِذَاذًا وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی، جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ تاکہ تم بھی جاد (۲۱) وہی رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو محبت بنایا ہے اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔ پھر اس پانی کے ذریعے پھل سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ منہ تلوٰ کے لیے شرک اور تم جانتے ہو (۲۲)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ۖ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَرَبَّ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ هُوَ اللَّهُ ۚ عَنِ اللَّهِ يُعْنَى اللَّهُ تَعَالَى ۚ وَحْدَانِيَّتُهُ كَوْنُهُ بِغَيْرِ مِثْلِ ۚ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَرَبَّ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ هُوَ اللَّهُ ۚ عَنِ اللَّهِ يُعْنَى اللَّهُ تَعَالَى ۚ وَحْدَانِيَّتُهُ كَوْنُهُ بِغَيْرِ مِثْلِ ۚ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَرَبَّ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ هُوَ اللَّهُ ۚ عَنِ اللَّهِ يُعْنَى اللَّهُ تَعَالَى ۚ وَحْدَانِيَّتُهُ كَوْنُهُ بِغَيْرِ مِثْلِ ۚ

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں: اَعْبُدُوا رَبَّكُمُ رَحْمَةُ اللَّهِ ۚ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو، نہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی تفسیر دو طریقے پر ہے۔ وَحْدٌ وَاللَّهُ ۚ میں توحید کا لفظ پہلے بیان کیا۔ کیونکہ توحید عبادت کے لیے شرط ہے۔ اگر توحید ہوگی۔ تو عبادت بھی کارآمد ہوگی۔ ورنہ کوئی فائدہ نہیں جس طرح نماز کے لیے طہارت شرط ہے۔ یعنی طہارت کے بغیر نماز ادا نہیں ہوگی۔ اسی طرح توحید کے بغیر عبادت نہیں ہوگی۔ تفسیر کے دوسرے طریقے میں وَحْدٌ وَاللَّهُ ۚ کا معنی یہ کیا ہے۔ کہ عبادت صرف ایک خدا کے لیے کرو۔ یہ توحید فی العبادۃ ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے عبادت ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ ایسا کفر، شرک اور حرام ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے قوی دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے خدا تعالیٰ جو صالح اور قادر ہے۔ اس کی صفات کا ذکر ہے۔ کہ اس کے مشابہ کوئی چیز نہیں۔ نہ اس کا کوئی نہ یعنی مقابل یا شریک ہے اور نہ اس کی کوئی مثل ہے۔ وہ ایسی اعلیٰ ذات ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

دلائل توحید کے متعلق فرمایا کہ آسمان کی بندی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر ستون کے قائم کیا ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ رعد میں کیا گیا ہے: **بِغَيْرِ عَمَدٍ شَرْهُنَّ**۔ اے تم بغیر ستونوں کے دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں کوئی چھت بغیر ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس نے آسمان جیسی عظیم الشان چھت کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب سے اے قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آیا۔ جب تک چلبے بگا آسمان کو اسی حالت میں قائم رکھے گا۔ اور جب چلبے گا۔ اُسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اور یہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا **وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفْطًا مَّحْفُوظًا** **وَهُنَّ عَنَّا اٰیٰتُهَا مُعَبَّرٌ مِّنْهُ**۔ دیکھو! ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔ مگر لوگ ہماری ان نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

دلائل توحید کے سلسلے میں زمین کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اے کیسا ثبات بخشا ہے۔ اہم البو بحر جصاص فرماتے ہیں: کہ زمین کے اوپر بھی ہوا ہے۔ وہ نیچے بھی ہوا ہے۔ اور اے فضا میں بغیر کسی سائے کے قائم کر رکھا ہے۔ جاسوسیہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ لفظ خلق کی تشریح کل (گنہ شدہ درس میں) بیان کر دی تھی۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا **خَلَقَكُمْ** **وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** یعنی وہ ذات جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا **اَسِرْبِ** **الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الرُّمُوحَ فِرَاشًا** جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ فرش۔ بستر۔ رہی چٹائی وغیرہ کو کہتے ہیں جس پر انسان آرام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش کے ساتھ اسی طرح تعبیر کیا ہے۔

جیسا پہاڑوں کے متعلق فرمایا "وَالْجِبَالُ أَوْتَادٌ" یعنی پہاڑوں کو کیل بنایا۔ اور سورج کے متعلق آتا ہے: "وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا" سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔

اہم البرجہ جصاص فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں فرشتہ پر نہیں سوؤں گا۔ اور وہ زمین پر سو جائے۔ تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بھی فرشتہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرف عام میں فرشتہ، پارہ پائی، درہی، قالین یا چٹائی کو کہتے ہیں۔ زمین کو نہیں کہتے۔ اس لیے قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ یا نہیں پڑھوں گا اور وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھے۔ تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے چراغ کہا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عرف عام میں چراغ کا لفظ دیے بالائین پڑ بولا جاتا ہے۔ سورج پر نہیں بولا جاتا۔ لہذا سورج کی روشنی میں اس کے لیے پڑنا مباح ہوگا۔

ابو الحسین قدوری فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر وہ پھلی کھائے، تو اس کی قسم قائم ہے گی۔ حالانکہ پھلی بھی گوشت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خوردائے لَحْمًا صَرِيحًا یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ عرف عام میں گوشت کا اطلاق گائے بھینس یا بھیڑ۔ بڑی وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے۔ پھلی پر نہیں ہوتا۔

قرآن پاک کی اولین دعوت اللہ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ کی عبادت ہے۔ اس مسئلہ میں تمام آسمانی کتب متفق ہیں۔ کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جائے۔ قرآن پاک جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی عبادت سے منع بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ تو عبادت کو ربوبیت پر مرتب فرمایا۔ گو ربوبیت عبادت کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے کرو کہ وہ رب ہے۔ اگلی آیت میں ربوبیت کی تشریح بیان کر دی گئی ہے کہ اُس نے تم پر ایسے ایسے انعام کئے ہیں۔ لہذا اس کی عبادت ضروری ہے۔ ربوبیت

کے سلسلہ میں سب سے پہلے صفت خلق کا ذکر ہے۔ اور پھر ظاہری، باطنی، علمی، اور عملی ہر قسم کے انعام کا بیان ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے چار عمدہ مضامین یعنی توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت اور معاد کا ذکر ہو چکا ہے۔

عبادت کے وقت صرف
ذات باری تعالیٰ ہے

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ جب انسان اپنے باپے میں خود کرتے گا تو اُسے معلوم ہو گا کہ پہلے وہ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے آباؤ اجداد کو بھی پیدا فرمایا "وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ" تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق ہی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خالق وہ ہے باقی سب مخلوق ہیں۔ عاجز اور محتاج ہیں۔ انسان اس قدر بے بس ہے کہ اُس کے جسم کی کھال کا کوئی حصہ اتر جائے تو ساری مخلوق مل کر بھی اُسے وہ کھال دیا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں نہ جنات کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ نہ نیک انسان کسی کام آ سکتے ہیں۔ اور نہ بد انسان یا کسی دوسری مخلوق میں کوئی بھی عبادت کا ستم نہیں۔ گویا کسی چیز میں ایسی صلاحیت موجود نہیں جسکی بنا پر اس کی عبادت کی جائے۔ لہذا عبادت صرف اسی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ یعنی جس کا وجود خود بخود ہے جو خالق۔ رب، علیم کل، قادر مطلق، مختار کل اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ جو ازل و ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ موجود ہے گا۔ باقی ہر چیز حادث اور فانی ہے۔ "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" ہر چیز بافعل ہلاک ہے۔ یا فنا ہو جائے گی۔ دہم اور بقا صرف اس ذات اقدس کے لیے ہے۔ جو محسن اور منعم ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔ فرمایا عبادت کرنے کا فائدہ یہ ہو گا "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ تقویٰ بچاؤ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی عبادت کرتے رہو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ اس کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ عبادت الہی کو لازم پکڑ دے گا تو دنیا میں بُرائی سے بچ جاؤ گے۔ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہو گے۔

زمین کے فوائد

الَّذِينَ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ضَرْأً وَنَارًا هِيَ قَادِرٌ مطلق اور مہربان خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش کے طور پر بنایا۔ ایسا فرش جو نہ بچتر کی طرح سخت ہے اور نہ پانی کی طرح بالکل نرم۔ یہ ہوا کی طرح لطیف بھی نہیں بلکہ بالطبع اس کو خشک بنایا۔ تاکہ یہ

دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مفید مرکب بن سکے۔ اور لوگوں کے کاروبار ٹھیک طور پر چل سکیں۔
 اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں ودیعت کی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف
 حصوں کی زمین مختلف ہے۔ یہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے "وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَعَادِلٌ" زمین
 کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے کوئی حصہ سفید ہے۔ اور کوئی حصہ سیاہ ہے۔
 "وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُمْ" سرخ گھاٹیاں
 ہیں اور کہیں سیاہ پتھر ہیں۔ وضع قطع میں واضح اختلافات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں روئیہ گی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا
 ہے "وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدَاجِ" قسم ہے زمین کی جو بھٹ کر پودے اور نباتات کو باہر
 نکالتی ہے پانی کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھتی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی
 اتارتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا "فَسَلَّكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ" پھر اس کو زمین میں
 نالیوں اور چشموں کی شکل میں چلاتا ہے۔ ضرورت کے وقت چشمے یا نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔
 یا کنویں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان، جانور اور کھیتیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے
 ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین میں کرم و سخاوت کا وہ مادہ رکھا ہے۔ کہ اس میں ایک دانہ پھینکو
 یہ ستودنے لڑائے گی۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

زمین میں انسان ہر روز موت و حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا "وَإِنَّا
 لَهُمُ الْأَرْضُ مِنَ الْحَيٰثَةِ" اَحْيٰیہَا دیکھتے نہیں کہ زمین بالکل مردہ یعنی خشک
 ہوتی ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ لوگ ہر موسم میں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ
 کی قدرت اور قیامت کا نقشہ انسان کی نگاہ میں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین
 میں مختلف قسم کے جانور پھیل دیئے "وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ" جنہیں انسان شمار
 تک نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے پتھر رکھ
 دیے جن میں بڑے بڑے قیمتی اور معمولی سے معمولی ہر قسم کے پتھر انسانی ضروریات کے لیے موجود ہیں۔
 زمین کی افادیت کے متعلق مزید فرمایا "خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَرْضٍ جَمِيعًا"
 اے انسانو! تمہارے ہی فائدے کے لیے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ ذرا غور کرو۔ پتھروں

اَتَيْنَا تَجْعَلُونَ اِلٰى رِنْدًا وَهَلْ تَيْمَ لَدِيْ حَبِ نَبِيْدٌ
تم نبی تیم کو میرا شریک بناتے ہو، حالانکہ نبی تیم تو کسی شریف آدمی کے شریک نہیں بن سکتے
وہ تو کھینے آدمی ہیں۔

ایک مذہب ہے اور ایک شہیرہ ہے بشیر یا مشاہد اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کیفیت میں
برابر ہو جیسے گرمی، سردی، بھتی، نرمی وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز طول، عرض اور عمق میں برابر ہو۔
اُسے مشکل کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے شریک مت ٹھراؤ، کیونکہ خدا تعالیٰ
کے سوا واجب الوجود کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی عظیم کل اور قادر مطلق نہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں
جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مگر تم جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا نہ ٹھراتے ہو۔
آج دنیا میں خدا تعالیٰ کے مقابل اور شریک ٹھرانے والے بی شمار مجوسی موجود ہیں۔ شنی
مذہب والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا در سر بہی کا۔ ایک کا نام یزدان رکھا ہے۔ اور
دوسرے کا نام اہرمین۔ ان کے نزدیک ایک شر کا خدا ہے۔ اور دوسرا خیر کا۔ نور کا خدا ہے
اور ظلمات کا اور ہے۔ حالانکہ سورتہ انعام میں پڑھیں گے: حَبَلُ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرِ سَوَاءٌ
یعنی ظلمت اور نور اُسی وعدہ لا شریک لہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں
اور یہ وہی ذات ہے جس نے خود تمہیں بھی پیدا کیا ہے۔

بعض لوگ ستاروں میں مستقل تاثیر کے قائل ہیں۔ ایسے لوگ نیک بھتی اور بھتی اور ترقی و
تنزل کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ صابی فرقہ کے لوگ ہیں۔ جو ستاروں کو اللہ تعالیٰ
کا نہ ٹھراتے ہیں۔

بعض لوگ اصحاب قسور سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے خدا کا نہ
ٹھراتے ہیں۔ بعض لوگ پیروں کو ہر حالت میں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ دو کہتے ہیں۔ کہ
خدا چاہے راضی ہو یا ناراض پیر ہر حالت میں سفارش کریں گے۔ آج کل پیر پرست لوگوں کا یہی عقیدہ
ہے۔ کہ پیر کا دامن پکڑ لیا ہے۔ بس پار ہو جائیں گے۔ کسی نیکی بھی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس
قسم کی سفارش کو قرآن پاک نے جبری سفارش سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وَلَا يَشْفَعُونَ
اِلَّا لِمَنْ ارْضٰى اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی جبری سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی اجازت اُسے

ہوگی جس سے خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ اور جس کا عقیدہ خدا تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ چونکہ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود عقائد ہیں۔ لہذا کسی مشرک کی سفارش ممکن نہیں ہے۔ یہ نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرک فی اثبت بعض لوگ مشیت میں شرک کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک شخص نے کہا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتُ تَوَّابٌ نے فرمایا اَجْعَلْتُ حَتْمِي لِلّٰهِ نِدَاً کیا تم نے مجھے خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے۔ قُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ کہو، جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ تم اس وقت تک نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ البتہ بعض روایات میں یوں آتا ہے کہ کہو مَا شَاءَ اللّٰهُ تَوَّابٌ چاہے۔ اس کے بعد جو تمہارا ارادہ ہے اس کے مطابق عمل کرو، شرک سے بچ جاؤ گے۔

شرک فی العادت شاہ اسماعیل شیعہ اور دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ شرک عبادت میں بھی ہوتا ہے۔ اور عادت میں بھی ہوتا ہے۔ شرک فی العادت کی مثال زنا کا دھاگا ہے۔ جو ہندو یا نجوسی اپنے جسم کے ساتھ باندھتے ہیں۔ عیسائی صلیب باندھتے ہیں۔ یہ بھی شرک فی العادت ہے۔ حضور علیہ السلام نے صلیب کو کفر کی نشانی بتایا ہے۔ اسی لیے فرمایا اَطْرَحُ عَنْكَ هَذَا الْوُثْنُ اے اتار دو، یہ بُت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کی شکستگی اس لیے ہوگی کہ یہ کفر کی نشانی ہے۔ اور وہ بھی نبی کے نام پر۔ اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ کہ عیسائیوں نے اُسے بکری کی طرح حلال قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ کسی نبی کی شریعت میں حلال نہیں ٹھہرا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں۔ سب کی شریعتوں میں خنزیر حرام ہی رہا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵۴، اور منثور ص ۳۵، ۲۔ تقویۃ الایمان ص ۹۱، ۳۔ ترمذی ص ۴۴

۴۔ بخاری ص ۱۱۱، مسلم ص ۸۴، ۵۔ حجة اللہ بالانہ ص ۱۸

بعض لوگ بچے کے سر پر چوٹی رکھ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی فلاں بزرگ یا فلاں خواجہ کی رکھی ہے۔ اگر یہ چوٹی نہ رکھتے تو کچھ مر جاتا۔ یہ صریح اور جلی شرک ہے۔ بعض لوگ بخوسوں کے نوروز یا عیسائیوں کے بڑے دن کی تعظیم بجا کر شرک کرتے ہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جو تحفہ میں پھول، بار، ڈالی یا کوئی اور بدیہ پیش کر لیا اور تعظیم کر لیا تو شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض مشائخ نے کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر مذہب ماننے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے نذر و نیاز دیتے ہیں۔ ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ قبروں اور زیارتوں پر کس کس طرح اور کس کس نام کے عرس منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ سب بدعت اور بعض شکلوں میں شرک ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کی قسم اٹھا کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور کچھ غیر اللہ کے نام پر بچے کا نام رکھ کر شرک کرتے ہیں۔ جیسے عبدالمصطفیٰ، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ عبد اللہ یا عبد الرحمن وغیرہ نام رکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے۔

بعض لوگ استعانت طلب کرنے میں شرک کرتے ہیں معنی غائبانہ طور پر مافوق الاسباب قبروں والے بندگوں اور اولیاء سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے۔ ”وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ خدا تعالیٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اُس سے مدد طلب کر دو۔ تم غائبوں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہو۔ جن کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ چہ جائیکہ ان کے آگے دست سوال دراز کر دو۔

بعض لوگ جانور ذبح کر کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ مُحَمَّدٍ یا بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ فُلَانٍ یعنی فلاں بزرگ یا فلاں پیر کے نام پر۔ ایسی صورت میں جانور سرے سے مُردار ہو گیا۔ فقہائے کرام نے اسے بسم اللہ میں شرک قرار دیا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو شیگوں کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں جنہوں پر علیہ السلام

لے فرمایا الطَّيْرَةُ بِشْرًا شُكُونِ يَنَا شُرَكَاءُ کی بات ہے۔ بعض لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کابن، سناسی، نجومی، دست شناس یا جادو کے پاس جا کر پوچھتے ہیں۔ اور ایمان کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے دیکھ کر شرک خریدنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈے کی شکل میں شرک کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے کرنے والے اکثر غلط کار لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام یا حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پڑھ کر دم کرے یا کچھ کرے، تو جائز ہے۔ وگرنہ یہ ٹونے ٹونے جن کے ساتھ طرح طرح کی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ سب شرکیہ یا بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

بعض لوگ غیر اللہ کو غائبانہ طور پر پکار کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے یا شیخ عبد القادر جیلانی شیکھا اللہ یہ مذاکا شرک ہے۔ اور پھر ان سے حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید تقویۃ الایمان میں لکھتے ہیں کہ دیکھو! ایسے لوگ کتنی غلط بات کرتے ہیں کہ بندے کو اصل ٹھہرا دیا۔ اور خدا تعالیٰ کو واسطہ بنا دیا۔ اگر اس کا الٹ کر دیتا تو درست تھا۔ یعنی یا اللہ شیکھا للشیخ عبد القادر جیلانی۔ اے مولا کریم! شیخ عبد القادر جیلانی کے واسطے اور ان کے طفیل سے میرا یہ کام کر دے۔ مگر اس شخص نے شیخ عبد القادر جیلانی کو مستحق بنا کر اللہ تعالیٰ کو واسطہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ توہین کا بھی مرتکب ہوا۔ غیر سے امداد طلب کر کے کفر میں مبتلا ہوا۔

شرک جلی کے بعد شرک خفی کا ذکر بھی ہو جائے۔ شرک خفی ریا

شرک خفی

میں پایا جاتا ہے۔ یا بعض دوسری اعتقادی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کا شرک خفیف ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنے کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ امام ابن کثیرؒ اور امام رازنیؒ نے اس کی مثال دی ہے کہ بعض وَاللّٰهِ وَحَيَاتِكَ اللّٰہ کی قسم اور تیری زندگی کی قسم یا میری زندگی کی قسم یا بعض لوگ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اگر رات کو یہ کتا نہ ہوتا تو ہم لٹ جاتے۔ یہ بطعن

مکان میں موجود تھی جس کی وجہ ہم چوری سے بچ گئے۔ یہ شرک خفی کی مثالیں ہیں۔ عام محاورے میں یوں بھی کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب یا حکم صاحب کی مہربانی سے مریض نچ گیا۔ ورنہ مر گیا تھا۔ یہ پہرے دار یا چپڑاسی نہ ہوتا۔ تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس لیے شرک خفی کی فہرست میں آتی ہیں کہ ان چیزوں کو مؤثر سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں اثر ڈالنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جس طرح غیر اللہ کی عبادت مطلقاً کفر اور شرک ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی بالاستقلال اطاعت بھی شرک ہے اطاعت غیر کا مطلب یہ ہے کہ نبی یا کسی بزرگ کی اطاعت کرتے ہیں مگر اس کو متفق نہیں سمجھتا بلکہ سب کچھ اُسی کو سمجھ رہا ہے۔ یعنی وہ جو بھی حکم کرے گا، اُس کی بلاچون و پسرا اطاعت کی جائے گی: **اِخْذُوا حَبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ** اسی کو کہا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا لیا تھا۔ یہ شرک ہے۔ البتہ نبی کی مطلق اطاعت فرض ہے کیونکہ نبی کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور اس کی خوشنودی معلوم نہیں کر سکتا۔ مگر نبی کا حکم مستقل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ **وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ** ہم نے دنیا میں انبیاء (علیہم السلام) کو اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کی اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت فرض ہے بحیثیت رسالت کے۔ اور علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ نبی کے لفظ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی وجہ نب سے کوئی حکم نہیں دیتا۔ **بَلَا اَنْ اَسْمِعُ اِلَّا مَا يَوْحٰى اِلَيَّ** میں تو اُسی حکم کی تعمیل کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے یعنی منجانب اللہ ہوتا ہے باقی رہی یہ بات کہ علمائے کرام، مجتہدین، شیخ طریقت، بادشاہ وقت، امراء، حکام اور والدین کی اطاعت بھی کی جاتی ہے۔ نیز غلام اپنے آقا کی اطاعت بھی کرتا ہے۔ تو یہ سب اطاعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ معنیہ ہیں کہ اُس کے حکم کے خلاف کوئی بات نہ ہو، شیخ پیر، حاکم، استاد اور والدین کی اطاعت، غلام کی اطاعت وغیرہ اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا طَاعَةَ لِمَا خُلُوْقِي فِيْ**

مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خَالِق کی معصیت کرتے ہوئے، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے۔ مخلوق کی اطاعت
 دینا نہیں ہے۔ ایسا کرنا شرک کے مترادف ہے۔ ان کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ بلکہ نبی کی
 اطاعت مطلق ہے۔ کیونکہ نبی اپنی جانب سے حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی
 لوگ چونکہ اپنی طرف سے حکم دیتے ہیں، اسی لیے ان کے حکم کو جانچنا ہو گا۔ صحیح حکم کی اطاعت
 ہوگی۔ اور خلاف شرع غلط بات کو ٹھکرا دیا جائے گا۔

اسی لیے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اللہ تعالیٰ کے
 لیے بڑے بڑے ٹھکانے۔ اور تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ کوئی نافع اور ضرر
 نہیں۔ کہی جاتی اور قادر مطلق نہیں۔ جب یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ تو پھر اس کی عبادت
 اور اس کی صفات میں غیروں کو کیوں شریک مانتے ہو مسئلہ توحید قرآن پاک کا بنیادی مسئلہ ہے۔
 اللہ تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین ہوں گے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ
مِثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ﴿٢٢﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ
﴿٢٣﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ
ثَمَرَةٍ زُرِقَا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ
مُتَّابًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا
خَالِدُونَ ﴿٢٤﴾

ترجمہ: اور اگر تم اس چیز سے شک میں ہو جس کو ہم نے نازل کیا ہے پہنچے بندے
(یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپس لاؤ تم ایک سورۃ اس کے مانند اور بلاؤ اپنے
مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر
سکو گے پس پچو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کفر کرنے والوں
کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۲۴﴾ اور آپ خود بخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے
اور جنہوں نے اچھے عمل کیے کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں جن کے سامنے
نہریں بہتی ہیں جب بھی وہ ان بہتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے
تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی اور وہ اس
میں دیے جائیں گے ایک درخت کے مشابہ پھل اور ان کے لیے ان بہتوں
میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۲۵﴾

سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا جواب

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ .
 متقین کا گروہ ۔ اور اس کے اوصاف بیان فرمائے ۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً
 اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے دین اور قیامت کے منکر ہیں اس کے بعد تیسرے آیات میں منافقین
 کا حال ذکر کیا ۔ جو سب سے زیادہ خطرناک گروہ ہے ان کی علامات کارنامے اور ان کی ذہنیت کا بیان ہوا ۔
 اس کے بعد مشالوں کے ذریعے ہر دو قسم کے منافقوں کی نشاندہی کی ۔ جو کفر میں پختے ہو چکے ہیں یا پھر ابھی
 متردد ہیں ۔ اور پھر ان کے بڑے انجام کا بھی ذکر فرمایا ۔

سورۃ بقرہ دو سو چھیالیس آیات کی سب سے لمبی سورۃ ہے ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے
 مکی زندگی میں جس قدر سورتیں نازل ہوئیں اور ان میں جتنی تعلیم دی گئی ۔ سب کا خلاصہ اس سورۃ میں آگیا ہے
 اس کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام اس میں آگئے ہیں ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو مکمل
 طور پر اس میں بیان فرمادیا ہے ۔ چنانچہ سب سے پہلی بنیادی تعلیم جس پر تمام کتب آسمانی متفق ہیں اس کا حکم
 دیا کہ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ یعنی عبادت
 خالقنا اللہ تعالیٰ ہی کی کرنا ۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ اس کے بعد معرفت الہی پر
 زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے ۔ اس کے بغیر عبادت بھی کسی کی کارآمد نہیں ۔ مشرکین اور یہود و
 نصاریٰ اگرچہ خدا تعالیٰ کو مانتے تھے ۔ مگر صحیح پہچانتے نہیں تھے ۔ اسی لیے وہ ناکام ہوئے ۔ فرمایا
 اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی ذات سے نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ وہ انسانی عقل و فکر سے بلند ہے ، وہ ان تک
 کسی کی رسائی نہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو عالم جبروت سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان کا پہچانا بھی بڑا
 مشکل ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کی پہچان اس کی مخلوق اور اس کی مصنوعات میں غور کرنے سے ہوتی
 ہے ۔ جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی
 پہچان لیتا ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا ذکر کیا ”رَبُّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“
 تمہارا رب وہ ہے ۔ جس نے تمہیں پیدا کیا ۔ اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ قادر مطلق ہے اور نہ عظیم کل
 ہے ۔ عبادت کے لائق وہی ذات ہے ۔ جو ان صفات کی مالک ہے ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کو بیان کیا ۔ کہ دیکھو ! اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کو
 تمہارے لیے پھونکا اور فرش بنا دیا ۔ اور آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا ۔ آسمان سے پانی اتار کر پھلوں کے

ذریعے تمہاری روزی کا سامان مہیا کر دیا۔ لہذا عبادت صرف اسی کی کر دو۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰہِ
اَنْدَادًا کسی چیز میں بھی خدا کا شریک نہ بناؤ۔ تم جانتے ہو کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی کچھ بھی نہیں
کر سکتا۔ سائے محتج اور اس کی عاجز مخلوق ہیں، خواہ وہ انسان ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ان آیات میں چار عمدہ مضامین کا ذکر کیا۔
یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد رسالت ہے۔ کہ نبی پر ایمان لائے بغیر
اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے اوامر اور نواہی کا علم نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے یونانی حکماء محض
اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے نبیوں کی اتباع کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ قہقہے تھے کہ
یہ تو جاہل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تو بڑے عقلمند ہیں۔ قیصر مضمون خود قرآن پاک کی
صداقت ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور چوتھا مضمون قیامت
پر ایمان ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا قیامت پر منحصر ہے۔ لہذا اُس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے

ان حالات میں قرآن پاک اور پیغمبر علیہ السلام کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے وَانْ كُنْتُمْ
فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے۔ جو ہم
نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔
گویا اس کلام الہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کی تصدیق مطلوب ہے۔ نبی دعویٰ کرتا
ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں۔ تو اُس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔
احادیث میں حضور علیہ السلام کے تین ہزار سے زیادہ معجزات کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن پاک حضور
علیہ السلام کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی خصوصی معجزہ عطا
فرمایا ہے۔ پھر جس کی قسمت میں عطا ہو وہ ایمان لے آیا۔ فرمایا میرا خصوصی معجزہ وحی الہی ہے۔ جس
کے ذریعے قرآن پاک جیسا بے مثال معجزہ عطا ہوا۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْجُوا اَنْ اَكُوْنَ
اَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ
پیروکار میرے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خصوصی معجزہ پائیدار اور دائمی ہے باقی پیغمبروں کے معجزات عارضی تھے

قرآن پاک
خاص معجزہ ہے

جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مگر میرا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا لافنی کا معجزہ حضرت صلح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ عارضی معجزات تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو گئے مگر حضور علیہ السلام کا معجزہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

عبد با عزت
لفظ ہے

اس آیت میں حضور علیہ السلام کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کہ بڑا با عزت لفظ ہے نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا کسی پیغمبر کی عبدیت کا اظہار اس کی بہت بڑی صفت ہے کیونکہ کامل درجے کی عبدیت انبیاء کرام علیہم السلام میں ہوتی ہے۔ اور پھر تمام نبیوں میں حضور علیہ السلام اکمل ترین بندے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی عبد کا لفظ آیا وہاں پر خاص انعام کا ذکر ہے۔ جیسے سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ دوسری جگہ فرمایا "نَزَّلَ الْفُرْقَانُ عَلَىٰ عَبْدِهِ" ایک اور جگہ ارشاد ہے "فَأَوْسَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْسَىٰ" الغرض یہ عبد کا لفظ نہایت اعلیٰ مقام کا حامل ہے نماز میں جب تک کوئی اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ نہ کہے۔ اس کی نماز کامل ہی نہیں ہوتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ تو خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نہ اوتار ہیں اور نہ خدا نے ان میں طویل کیا ہے۔ نہ ان میں الوہیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کے عبد یعنی بندے ہیں۔ محمود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر یا انسان نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہونا فخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ خَلَقْتُ کِبْرًا مِّنْ طِیْنٍ میں تو مٹی سے انسان جیسی برگزیدہ کشتی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ بشر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عبدیت تو بہت اعلیٰ صفت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر تو عبدیت والی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ ہماری عبدیت کی حالت خراب ہے۔ ہم گندے انسان ہیں۔ جو گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جنہیں عبدیت کا مقام حاصل ہے وہ تو پاکیزہ نفوس ہیں جو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔

قرآن پاک
بطور چینیج

خود قرآن پاک اس بات کا گواہ ہے کہ مشرکین اسے خدا تعالیٰ کا کلام ماننے کے لیے

تیار نہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کے رد کے طور پر قرآن پاک میں تین قسم کی آیات نازل فرمائیں۔ اولاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن پاک کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ انسان کے بس کی بات ہے۔ بلکہ لَہِیْنِ اجْتَمَعَتْ اِلَآٰہُ وَاَلْحَزْنُ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ بِبَعْضٍ ظَہِیْرًا یعنی تمام انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا یہ ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن پاک جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام پاک کے منجانبہ ہونے میں کسی قسم کا شک ہے یعنی یہ کہ یہ انسانی کلام ہے تو فَاْتُوْا بِمِثْلِ سُوْرَةِ مِّثْلِہٖ تو اس جیسی دس سوڑیں ہی بنا کر لے آؤ خواہ چھوٹی چھوٹی ہی ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کوئی انسان بھی ایسی چیز پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اب تیسرے نمبر پر آیت پاک میں آخری چیلنج دیا جا رہا ہے کہ اگر تم کو اس کلام پاک میں شک ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِہٖ تَوَاسَّی اسی جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ چاہے وہ تین آیات کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابو بکر جصاص چوتھی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اس چیلنج کو صدیاں گزر جانے کے باوجود کسی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور اگر مسلمہ کذاب جیسے کسی شخص نے حماقت کی تو اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے ہم عصر کافروں نے اس کے منہ پر ہتھوک دیا تھا۔ کہ تم پر لعنت ہو۔ کیا تمہارا وضع کردہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو اسے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج تک کوئی ایک سورۃ بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

عام مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چیلنج قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ

سے ہے۔ اہم البوجہ جصاص بھی انہیں مفسرین میں شامل ہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ قرآن پاک ایسا فصیح و بلیغ کلام ہے کہ اس جیسی فصاحت و بلاغت آج تک کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ چیلنج فصاحت و بلاغت تک ہی محدود ہے تو پھر یہ خطہ عرب تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ چیلنج صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔ اگر اس چیلنج کو بین الاقوامی چیلنج تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نہ کوئی دوسرا کلام اس جیسا ہے نہ اس میں دیے ہوئے نظام جیسا کوئی نظام دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا دستور پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماحول جیسی اجتماعیت کوئی دوسرا قانون پیش نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ سابقہ کتب آسمانی اور صحیفے بھی ایسا اجتماعی نظام نہیں دے سکتے۔ جیسا قرآن پاک نے عطا کیا۔ اسی لیے فرمایا کوئی ایک سورۃ لا کر دکھاؤ۔ جو قرآن جیسی جامعیت پیدا کر سکے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ صرف سوڑہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ ستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور آپ سکھ مت چھوڑ کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت سندھیؒ کے دوست تھے اور آپ کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ رشتے کے لحاظ سے حضرت مولانا سندھیؒ حضرت مولانا لاہوریؒ کے خسر تھے۔ تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا بھر کی اقوام اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ جو پروگرام اور نظام عدل اسلام اور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ انہیں حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلام جیسا اہل مضبوط اور غیر تغیر پذیر قانون کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی چھٹی سی سورۃ ”وَالْعَصْرِ“ اتنی جامع سورۃ ہے کہ ساری کائنات کی ہدایت کے لیے یہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان اس

پر غور و فکر کر کے اس سے رہنمائی طلب کریں۔

الغرض! فرمایا اگر ہمارے نازل کردہ کلام میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے گواہ بھی بلاؤ۔ یعنی خود بھی آجاؤ اور اپنے دیگر مددگار اور حمایتی بھی بلاؤ۔ مگر تم اس کلام جیسی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ یہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ یہ تمہاری مادری زبان ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسی تمہارے ماحول سے عربی زبان سیکھی ہے۔ آپ مکے میں رہے ہیں۔ یاد یا رہی بخیریں۔ یہ اسی علاقے کی زبان ہے اگر حضور علیہ السلام خود کلام بنا سکتے ہیں۔ تو پھر تم بھی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عربی زبان اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد تنزل کی ہی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر کسی شاعر نے قرآن پاک کی مثل لانے کی جرأت نہیں کی۔ جو بھی قرآن پاک کی کوئی آیت سُنتا تھا۔ دم بخود رہ جاتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے بھائی حضرت امیرؓ کہتے تھے کہ میں شاعروں کا کلام بھی جانتا ہوں اور ساعروں کا بھی۔ اور کامیابوں کا بھی۔ میں نے کلام الہی کا ان سب کلاموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن پاک کا مقابل نہیں۔ خدا کا کلام تمام کلاموں سے منفرد اور ممتاز ہے۔

منعین قرآن
کی سزا

قرآن پاک نے چیلنج پیش کرنے کے بعد پھر خود ہی اس کا جواب دیا فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا پس اگر تم نہ کر سکو اور نہ کر گز نہیں کر سکو گے۔ گویا پیشگوئی بھی کر دی کہ تم اس کلام کی مثل ہرگز پیش نہیں کر سکو گے۔ تو پھر خبردار فرمایا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُكِدَتْ لِلنَّاسِ آگ سے بچو! وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ گویا دوزخ کی آگ میں اس کلام کے مکذبین خود کفار جلیں گے۔ اور پتھر جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئلے سے جلانی گئی آگ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح پتھر سے جلنے والی آگ شدید تر

ہوگی۔ یا پھر سے مراد وہ پھر کے بُت ہیں۔ جن کی پروا کی جاتی تھی۔ وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ فرمایا یہ ایسی آگ ہے اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کفار لوگ اسی آگ کا ایندھن بنیں گے۔

ایمانداروں کے
لیے بشارت

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے تہ سب و ترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کفار کا انجام کا انجام بیان کرنے کے بعد ایمانداروں کے لیے بشارت سنائی زَكَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنادیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کی رسالت پر ایمان لائے۔ کلام الہی کو سچا کلام تسلیم کیا۔ قیامت کو برحق جانا اور پھر اس کے ساتھ ثلاثہ کام بھی انجام دیے یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے فرائض پورے کئے۔ صدقہ و خیرات کیا۔ حلال و حرام میں امتیاز روا رکھا۔ کہ اِنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ عَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے باغات تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

پھلوں میں
مشابہت

فَرَايَا كُلُّكُمْ رُزْقًا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا جب وہ ان بہشتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ تو کہیں گے یہ تو وہی ہے۔ جو ہمیں اس سے پہلے دی گئی وَاتُّوا بِهِ مُتَشَابِهًا اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل۔ مقصد یہ کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ملنے جلتے پھل دیے جائیں گے، تو جنتی لوگ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو ہمیں اس سے پہلے دے گئے تھے۔ مگر جب وہ انہیں کھائیں گے۔ تو ان کا ذائقہ پہلے پھلوں سے بالکل مختلف ہو گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے۔ کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پر قیاس کریں گے۔ مگر ان دونوں قسم کے پھلوں میں ذائقے کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہو گا۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ پھلوں میں مشابہت کی ایک اور توجیہ یہ ہے۔ کہ فطرت سلیمہ رکھنے والے اس دنیا میں جب یہی اور اطاعت کے کام کرتے تھے

تو انہیں لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جب بہشت میں انہیں پھسل دیے جائیں گے تو وہ لوگ کہیں گے کہ ان میں وہی لذت پائی جاتی ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرتے وقت حاصل ہوتی تھی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جنت کی زمین خالی ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَوْلَا إِذًا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہنا اس خالی زمین میں درخت لگانے کے مترادف ہے۔ جب کوئی مومن دل کی گہرائیوں سے الْحَمْدُ لِلَّهِ کہتا ہے۔ تو جنت میں اس کے لیے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کا پھل انہیں میسر ہوگا۔ تو وہ کہیں گے کہ اس کا ذائقہ تو بالکل وہی ہے جیسا ذائقہ ہمیں دنیا میں نیکی کی توفیق پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی نیکی کے صلے میں آج ہمیں جنت میں یہ نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں آرام و راحت کا جو بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ سب جنت میں حاصل ہوگا۔ خواہ وہ لباس کی صورت میں ہو خوراک کی صورت میں ہو یا اعلیٰ مقام کی صورت میں۔ ہر چیز وہاں حاصل ہوگی اور اسی کو پھلوں کی مشابہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پاکیزہ بیویاں

جنتیوں کے ایک اور انعام کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان مادی نعمتوں کے علاوہ دوسرے مقام پر روحانی نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُیْ اَنْفُسُكُمْ اس میں تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کے لیے تمہارا جی چاہے گا۔ جنت کی نعمتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ زخم ہونے والی ہونگی۔ دنیا میں کسی چیز کے میسر آجانے کے بعد بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ کہ یہ کیسی وقت چھین بھی سکتی ہے۔ یا ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ ان کے لیے زوال کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اسی لیے فرمایا کہ جنتی لوگ کسی محدود عرصے کے لیے جنت کی نعمتوں سے مستغنیہ نہیں ہوں گے۔ بَلْكَ دَهْنُهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اور وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہی ہوتا ہے گا۔

ان آیات میں قرآن پاک پر ایمان لانے والوں کا انجام بھی بیان فرما دیا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے حشر سے بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا۔

الْم

البقرة

(آیت ۲۶ تا ۲۷)

درس سیزدهم

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا
الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ
بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاقِينَ
③ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ
هُمْ الْخَاسِرُونَ ④

ترجمہ : بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرما، اس بات سے کہ بیان کرے مثال ٹھہر
کی یا اس سے بڑی۔ بہر حال جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان
کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس وہ کہتے ہیں۔ کیا ارادہ
کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ اللہ تعالیٰ گمراہ کر رہا ہے اس کے سبب سے
بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو۔ اور نہیں گمراہ کرتا
اس کے سبب سے مگر فاسقوں کو ⑤ وہ جو توڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
کے عہد کو اس کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو
اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ
نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ⑥

گذشتہ سے پیوستہ پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت، صداقت اور اس کے منزل
من اللہ ہونے اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے پہلے توحید اور رد شرک
کے متعلق بیان تھا۔ لوگوں کے اس خیال کی تردید تھی کہ یہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام نہیں۔
بلکہ بغیر علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ ہے۔ اور پھر اس ضمن قرآن پاک کے چیلنج کا ذکر تھا۔ کہ اگر

تمیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لاؤ۔ اس کے ساتھ پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ کہ قیامت تک تم اس قرآن کی مثل نہیں لاسکو گے لہذا یاد رکھو کہ جب ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو پھر اس کلام سے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تم ایسی دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان والوں کو شدت بخشی۔ کہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ اور ان کا انجام نہایت اچھا ہوگا۔

حقیر چیزوں
کی مثالیں

کفار قرآن پاک کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے۔ کہ اس میں بعض چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے شایان شان نہیں۔ کہیں مکھی کا ذکر ہے۔ اور کیس مکڑی کا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اُس کا کلام بھی بہت اعلیٰ باتوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک عام محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلِمِ یعنی بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اس میں مکھی۔ بچھر جیسی ادنیٰ چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيُ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کے یہ ہرگز منافی نہیں کہ وہ بچھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں انسانوں کے سمجھانے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ تو بعض لوگوں کی عقل یا انکے عرف کی کمزوری کی دلیل ہے۔ کہ وہ بعض حقیر چیزوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر حکمت کے اصول کے تحت ایسی چیزوں کے بیان کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر یا کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی چیز کا بیان روکا جاسکتا ہے۔ حقیر چیزوں میں بڑے مفید پہلو بھی ہوتے ہیں قرآن پاک میں مکھیوں اور مکڑی کا ذکر ہے۔ اور ان کی مثال سے کر بڑی مفید باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ لہذا ایسی مثالوں کے ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اس قسم کی مثالیں اکثر علماء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ خود عرب کہتے ہیں مَا الْبَقُوعُ وَشَعْمُهُ یعنی کیا بچھر اور اس کی چربی۔ اسی طرح مَا الْجُرَادُ وَطَعْمُهُ یعنی کیا

نہی اور کیا اس کا گوشت وغیرہ حضور علیہ السلام نے بھی تغسیم حقیقت کے لیے مثال بیان فرمائی ہے۔
مسند احمد۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں لَوْ كَانَتِ السَّمَاوَاتُ زُنُجُودًا لَّكَانَ اللَّهُ
جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا قَطْرَةً أَبَدًا يَعْنِي أَلَا تَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى كَيْفَ هُوَ
قد و قیمت ایک پھر کے پر کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک ٹھونٹ پانی بھی عطا نہ دیتے۔
کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ یہ پھر کی مثال آپ نے اس لیے بیان فرمائی کہ ساری دنیا کی قیمت
اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں جتنی پھر کے ایک پر کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کفار اس دنیا
میں آرام و عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ نہیں۔ آخرت میں جب ان
کا حساب کتاب پیش ہوگا۔ تو سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اُمّ سلیمؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت
کیا اور تمبیہ کے طور پر عرض کیا إِنَّ اللَّهَ لَا يَكْتُمُ خَيْرًا مِنْ الْحَقِّ يَعْنِي اللَّهُ تَعَالَى تَوَحُّدًا
نہیں شہرتے۔ میں آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا عورت کو بدخوابی ہو جائے تو اس پر
غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا نَعَمْ يَا أُمُّ سُلَيْمٍ إِذَا رَأَيْتِ
الْمَاءَ مَا لَمْ يَجِبْ مَادَهُ خَارِجٌ يَجِبُ غَسْلُهَا تَابَ۔ جس طرح مرد کو احتلام ہوتا ہے
اسی طرح عورت کو بھی بدخوابی ہوتی ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
حق بات کو ظاہر کرنے سے نہیں شرماتا۔

حیا کی مختلف قسمیں

حیا انسان کی اُس انحراری اور شکنجی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص قبیح امور سے
باز آجاتا ہے۔ حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی
شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ چھپ کر کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے انسانوں سے حیا آتی ہے کہ اگر
وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہوگا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اُس کی نظر سے
کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے۔ تو پھر ذرہ بھر بھی خوف خدا رکھنے والا شخص فعل قبیح کے ارتکاب کے
وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا۔ اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔

حیا کی ایک قسم حیا عبودیت ہے۔ ایک عابد و زاہد اپنی تمام قوی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر حسبہ انعامات کئے ہیں۔ اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فہم عطا کرے اور بعد سے میں گر جائے اور ساری عمر اسی ایک سجدہ میں گزار دے۔ اور وہیں اس کی موت آجائے۔ تو وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرے گا کہ مولا کریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیا عبودیت اسی چیز کا نام ہے۔

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اُسے کوئی شخص دیکھنے والا نہ ہو تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کیڑا باہوں اور کبے دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیا کرم ہے۔ خود حضور بنی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرتی۔ مگر آپ نے حیا کرم کی وجہ سے انہیں زبان مبارک سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ مگر وہ بیٹھے بے لود باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ کہ جب بنی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گزارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیا کرم کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا۔ مگر تم خود ہی احساس کرو۔ اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

ہدایت و گمراہی

فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی مثالیں بیان فرماتے ہیں تو مومن اور کافر پر ان کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ایماندار لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کا بیان کرنا حکمت کے منافی نہیں۔ لہٰذا وہ اس سے بڑا نہیں مناتے وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا جن لوگوں نے کفر کیا فَيَقُولُونَ پس وہ کہتے ہیں مَا ذَا الَّذِي أَدَّ اللہ بھلا أَمْ شَاءَ اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ وہ لوگ طعن کرتے ہیں۔

اور بطور استنہاد اور تحقیر کے کہتے ہیں کہ ایسی معمولی چیزوں کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مہل ہوا۔ اگر مثال ہی بیان کرنا سہی تو کسی اعلیٰ چیز کی بیان کی ہوتی۔ مکھی اور بھڑکی مثال کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مثال کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ کیونکہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں ٹٹ نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ وَيُفْسِدُنَّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پہانتے ہیں۔ لہذا ہدایت پاتے ہو جاتے ہیں۔ فرمایا أَهْمُ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ یعنی گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو فاسق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔ کوئی ایمانداروں منصف مزاج اور حق کا طالب گمراہ نہیں ہوتا۔

فاسق کا معنی

فاسق کا معنی خروج یا باہر نکلنا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں فَسَقَ الرُّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا اصل اپنے پھلکے سے باہر آگیا یا کہتے ہیں فَسَقَتِ النَّوَّةُ مِنَ الشَّعْصَعَةِ ٹھٹھلی کھجور سے باہر نکل گئی۔ اسی اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے۔ شریعت کے عرف میں فاسق دو محنوں میں استعمال ہوتا ہے پہلے معنی میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کے دل میں ایمان موجود ہے۔ مگر وہ اطاعت کی بجائے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسا شخص ممکن ہے۔ اور اس کے متعلق امید ہے کہ اُسے آخرت میں شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ اور وہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ بہر حال وہ مسلمان ہے۔ مگر نافرمان ہے وہ نماز کو فرض سمجھتا ہے مگر پڑھتا نہیں۔ زکوٰۃ کو فرض جان کر ادا نہیں کرتا۔ گویا نیکی کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ شریعت کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے۔ دوسری قسم کا فاسق وہ ہے۔ جو کفر میں مد سے بڑھ جائے۔ سرکش ہو جائے۔ جیسا کہ اعتقادی منافقوں یا سخت کافروں کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ان یہودیوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ جو بڑے سرکش، ضدی

اور نافرمان ہیں اور کفر میں بڑے پختے ہیں۔ فاسق کے یہ دونوں معنی قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس مقام پر بطور تشریح یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاسق وہ ہیں جو قرآن پاک کی بیان کردہ مثالوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ جو شخص قرآن کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ فاسق ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے کہ: **الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾** وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾“ نیز قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ظَنُّوا أَنَّهُ قَائِمٌ**“ مگر جو شخص اس کے خلاف کرے گا۔ وہ فاسقوں کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

یہودی منافقین
کی عمدگی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کی تین بڑی خصلتوں کا ذکر کیا ہے پہلی بات یہ ہے کہ **الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ**۔ فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اگر وہ اٹھاس منافق ہیں تو وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ: **أَمْسَا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ** ہم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ عہد کو پورا نہیں کرتے۔ عملی طور پر ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ اور اگر فاسقوں سے مراد یہود ہیں۔ تو ان سے تو پہلی کتابوں میں عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ اور خاص طور پر نبی محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے۔ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو ہدایت نازل فرمائی ہے۔ اُسے چھپائیں گے نہیں۔ بلکہ ظاہر کریں گے۔ مگر ان لوگوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ گویا فاسقوں کی پہلی خصلت یہ بیان فرمائی کہ وہ عہد کرنے کے بعد اُس کو توڑتے ہیں۔ عمدگی لوگوں کا دوسرا گروہ معاند کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا: **سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اُس عہد کو توڑا۔ جو نازل میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پرچھا تھا: **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا: **بَلَىٰ** اے مولا کریم! کیوں نہیں بیشک تو ہمارا رب ہے۔ اس عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے۔

کتاب میں نازل کیں۔ مگر انہوں نے اس بچتہ عمدہ کو توڑ دیا۔ لہذا یہ بھی عمدہ سکون کی صفت میں شامل ہوئے ایک عام مومن جب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَقَّقُ رَسُولُ اللَّهِ کہتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عمدہ کرتا ہے۔ ان کے احکام کو تسلیم کرنے اور اللہ پر کاربند ہونے کا عمدہ کرتا ہے۔ مگر جب وہ اُس کے خلاف چلتا ہے۔ گویا عمدہ شکنی کرتا ہے۔ ایسا شخص بھی فاسق یا منافق کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ عمدہ کی خلاف ورزی کرنا منافق کی واضح نشانی ہے۔

قطع رحمی

فاسقوں کی دوسری خصلت یہ بیان فرمائی وَ يَقْطَعُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوْصَلَ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اُسے قطع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرابتوں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ اس کے برخلاف قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں جیسے کافروں کے متعلق فرمایا کہ وہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ اور کسی مومن کے بارہ میں نہ تو عمدہ و پیمان کا خیال رکھتے ہیں اور نہ قرابت داری کو خاطر میں لاتے ہیں۔ بلکہ انہیں ہر طرح سے ایذا پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ قطع رحمی بہت بڑا جرم ہے۔ حدیث شریف میں آگے ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ میں بھی اُس کو جوڑوں گا۔ اور جو قطع کرتا ہے۔ میں بھی اس کو کاٹ دوں گا۔

صلہ رحمی

اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ رحم معنی قرابت داری کو اپنے نام رحم سے نکالا ہے۔ اور رحم کا معنی بے حد مہربان ہے۔ لہذا ہر انسان کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ فرمایا وَ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْضَ حَاكِمُ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور قرابت داری کا خیال رکھو۔ صلہ رحمی بہت بڑا عمل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اس میں انسان کے تمام حقوق آجاتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا اَبِ كُلِّ ذِي حَقٍّ حَقًّا ہر حد تک کا حق ادا کرو۔ یہی صلہ رحمی ہے۔

فلانی الارض

منافقین کی تیسری خصلت یہ بیان فرمائی وَ يَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ دوزخ میں فساد پھیلاتے ہیں۔ فساد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور کافر لوگوں کو ایمان سے

متغیر بندے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اسی لیے تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ کیونکہ اس میں مکھی اور چھڑ جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ پڑ پگینڈا ہے جس کی بدولت وہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شریع کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے اس میں الجھاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں۔ شرک، بدعت، مانج گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جمی کی بجائے اُس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ الغرض عمدہ شکنی، قطع رحمی، اور فساد فی الارض یہ تین بڑی خصلتیں ہیں جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فاسقوں کی علامات بیان کرنے کے بعد فرمایا أُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ فاسقین کی پہلی یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ ناکام دنیا دار ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خصلتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ کیونکہ فساد فی الارض کی بدولت دنیا میں امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا خَسِرَالْ دُنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ یہ دنیا اور آخرت بڑے جگہ کی ناکامی ہے۔ اور یہی بہت بڑی ناکامی ہے۔ ابتدائے سورۃ میں متقین کے متعلق فرمایا تھا أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ یعنی یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ اس مقام پر فاسقین کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ یہی لوگ ناکام ہیں۔

الہ

درس چہارم ۱۴

البقرة ۲

(آیت ۲۸ تا ۲۹)

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ
 يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾
 هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ
 اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ
 بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

۲

ترجمہ : کس طرح تم کفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان
 پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ پھر وہ تم کو دوبارہ
 زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹنے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے
 جس نے پیدا کیا ہے۔ تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب۔ پھر وہ متوجہ ہوا آسمان
 کی طرف۔ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا رد فرمایا۔ جو قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا
 انکار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کلام میں کچھ مکمل جیسی حقیر چیزوں کا بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ
 کی ذات اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ یا اس سے
 بھی کم تر چیز کی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ کیونکہ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں
 ہوتی۔ بعض اوقات ادنیٰ چیزوں میں بھی اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی کسی چیز کے بیان سے
 اجتناب کرنا خلاف حکمت ہوتا ہے۔ معترضین کا اس قسم کا اعتراض ان کی نا سمجھی کی دلیل
 ہے۔ البتہ ایمان والے خوب سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔
 نا سمجھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے فرمایا ایسی ہی مثال کے ذریعے وہ بہتوں کو ہدایت سے نواز رہا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے
 مگر گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو منافقان ہوتے ہیں۔

گزشتہ صفحہ پر

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تین خصلتیں بیان فرمائیں۔ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑتے ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں توڑتے ہیں۔ اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ فرمایا یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ گویا قرآن کریم کا انکار، معاد کا انکار، راستہ کا انکار یا خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اور اس کی صفات کا انکار سب کا مالِ رانجام کا ایک ہی ہے۔ ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو مخاطب فرماتے ہیں، کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ یہ انعام پانے کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیسے انکار کرتے ہو۔ تمہارا انکار محض جہالت، ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر ہے ورنہ اس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا دَمَنْ يَتَذَعُ مَعَ اللّٰهِ الْاٰخِرُ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے۔ یعنی شرک کرتا ہے۔ اُس کے پاس ایسا کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کا حساب تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی بات یہاں پر بیان کی گئی ہے کہ تمہارے پاس کفر کرنے کی کون سی دلیل ہے کیفَ تَكْفُرُونَ تمہارے لیے کفر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں نہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کا بیان ہے بلکہ اس میں ایمان لانے کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں یعنی تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اس کے کلام کا کیسے انکار کرتے ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو کیوں نہیں مانتے۔ اور معاد پر تمہارا ایمان کیوں نہیں ہے۔ گویا کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا کفار انکار کرتے تھے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ کا تعلق گزشتہ آیت یَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ کے ساتھ ہے

وہں پر بھی بعض انعامات کا تذکرہ فرمایا۔ کہ اے لوگو! اُس پر وہ دغا کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارے لیے زمین و آسمان کو پیدا کیا، پھر آسمان سے بھی پانی نازل کر کے زمین کو سیراب کیا اور تمہارے لیے پھل پیدا کیے۔ اس مقام پر موت و حیات اور زمین سے پیدا ہونے والی نعمتوں کا ذکر کر کے ایک دوسرے انداز سے بیان ہو رہا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو۔

بر خلاف اس کے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہے۔ اور اُسی کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے سامنے معرفت الہی کی لاکھوں کروڑوں عقلی اور عقلی دلیلیں موجود ہیں۔ اُس کے اُس پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انسان کے ذمے فرض ہے۔ حضورِ علیہ السلام نے فرمایا: **حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا** یعنی اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ الہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو نہ کریں۔

اہم البرصیفۃ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص سپاڑ کی چوٹی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و شعور عطا فرمایا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کفر کرتا ہے۔ تو پھر اگلے گا۔ اُسے معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ مشاہدات قدرت کو دیکھنے کے باوجود اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا تو اس کی نصیبی ہے۔ گویا عقلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کو پہچانا واجب ہے۔ ایک شخص عملاً نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان ہے۔ تو اُس کی بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر کفر کرنے کی صورت میں وہ قابلِ گرفت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہیں عقل دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ تمہارے ارد گرد نشانیاں پھیلادیں۔ اس کے باوجود تم نے ایمان کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لہٰذا تمہارا معاملہ ناقابلِ معافی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ تم ان تمام دلائل کے باوجود کیف تکفروا؟ یا اللہ تم اللہ تعالیٰ

موت و حیات
الہی میں ہے

کیا تم کیے کفر کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ أَمْوَئًا عَالًا تَمُوتُ بے جان تھے۔ فَاحْيَاكُمْ ہا پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ مطلب یہ کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں بالکل بے جان چیز تھے۔ پھر اس نے تمہیں آدمیوں کے رمموں میں قطرہ آب یا لطف کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی بخشی اور تمہیں وجود جیسی نعمت عطا کی۔ مگر یا تمہیں جیسی سستی سے سستی میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آیا آئے گا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا۔ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ دیکھو یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ جو پیدا کرتا ہے، موت بھی دہی طاری کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی مستغرق نہیں۔ نہ کوئی کچھ دے سکتا ہے۔ نہ کوئی پھین سکتا ہے۔ اسی بات کو سورۃ واقعہ میں اس طرح بیان فرمایا کہ دیکھو تم کیسے بے بس ہو۔ جب ہمارے کارندے آتے ہیں۔ تو کون ہے جو انہیں روک سکے بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے طاقتور عاجز آجاتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا تصرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مستغرق فی الامور وہی ہے۔ اور ایک ایسا نذر کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جاندار بنایا۔ وہی موت طاری کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔

فرمایا موت و حیات کی اس کشمکش کے بعد انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ وہ انسانی اعمال کا محاسبہ بھی کرے گا۔ اَلَيْسَ تَرْجَعُونَ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگی اور تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو وجود کی نعمت دی۔ تمہاری پرورش کی اور تمہاری ضروریات و آسائش کے تمام سامان مہیا کیے۔ تمہارے جسم میں ہدایت کی مثیری نصب کی۔ علم حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہرہ باطنہ سے نوازا۔ قوت متخیلہ عطا کی۔ غور و فکر کے ذرائع بخشے۔ قوت حافظہ دی۔ جوڑ توڑ کرنے کی طاقت بخشی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی مہربانی یہ فرمائی کہ راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ انہیں بشیر اور منذر بنایا اور دوسری جگہ فرمایا وَرَاسَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ ان کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں۔ وحی نازل کی شریعت دے کر بھیجا لیقوم الناس بالقسط تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ یہ شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔ اور کفر سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ سب سے

بڑے ظالم تو کافر ہیں۔ یہ تمام ہدایت ہے کہ محبت پوری کر دی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ انہیں کوئی سمجھانے والا نہیں آیا: لَيْسَ أَنْ يَكُونَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

میت دفن کرنے
کے آداب

مشکوٰۃ میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ، یعنی جو چیز جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے بچانے والی ہے وہ سب میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ اب تمہارے پاس انکار کی کیا دلیل ہے۔ موت و حیات اور تصرفات کے بنیادی عقائد بیان ہو گئے ہیں جن کی قرآن پاک میں تعلیم دی گئی ہے

فرمایا میت کو دفن کرتے وقت یوں کہو بِسْمِ اللّٰهِ وَحَلٰی مِلْكَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اور اسی طرح قبر پر مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنی چاہیے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُفِئُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ قَارَةَ اُخْرٰی مگر لوگ اس کی بجائے زور زور سے کلمہ شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ کلمہ طیبہ بے شک افضل الذکر ہے۔ مگر اس مقام پر وہی کچھ کہنا چاہے جسکی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی میں اس کو لوٹائیں گے۔ اور پھر اسی میں سے دوبارہ زندہ کر گئے ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔

تمام چیزیں انسان
کے لیے ہیں

انسان کی موت و حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجماعی خاکہ پیش کیا ہوا الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ رَافِعًا اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ فدا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کماں حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتیٰ کہ موزی جانور بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہم بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان کچھوں سے

تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں، انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں۔ کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی تفسیق والی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا۔ اور جمعہ کے روز نماز عصر کے بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب چیزیں پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ نوع انسانی کی مصلحت فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام اور ملائکہ اعلیٰ کے دو سر فرشتے ہیں۔ ان میں مقرب فرشتے بھی ہیں ان میں ملائکہ سافل کے فرشتے اور فضائی اور ہوائی فرشتے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں تاکہ انسان درجہ کمال تک پہنچ سکے۔

موت انسان
عبرت ہے

اللہ تعالیٰ نے موت کو پیدا کیا اور یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے۔ مگر اس میں بھی انسان کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔ ————— بادشاہ نذیر
خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بادشاہ کہنے لگا۔ کاش کہ اگر میں موت نہ بولے، چہ خوش بودے، یعنی اگر یہ موت نہ ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری بادشاہت ہمیشہ قائم رہتی۔ نہ موت وارد ہوتی اور نہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا۔ وزیر بڑا دانا آدمی تھا، کہنے لگا، اگر موت نہ بولے اس سلطنت تیرا کسے کیسے یعنی اگر موت نہ ہوتی، تو یہ سلطنت تم تک کیسے پہنچتی۔ یہ موت ہی ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہت تم تک پہنچی ہے۔ ورنہ یہ تمہارے آباؤ اجداد تک ہی محدود رہتی۔ آگے نہ چلتی۔ مقصد یہ کہ موت جیسی چیز بھی انسان کے لیے مفید ہے۔ کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر فقہائے کرام اور محدثین ایک اور مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اشیاء میں اصل چیز اباحت ہے۔ خَلَقَ نَكْمَةً مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے

لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب جائز بھی جائز رہے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں۔ مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مردار حرام ہے۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرر کوئی روحانی یا جسمانی قباحیت ہوگی۔ جس کی وجہ سے اُسے ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ سب چیزیں مباح ہیں۔

میاں پر ایک دوسرے سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر اباحت کے اس اصول کو من و عن تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز ہر حالت میں مباح قرار پائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر چیز کا ہر شخص مالک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قبضہ اور ملک کا قانون مقرر کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی حدود میں رہ کر کسی چیز کا قبضہ یا مالک ہو گا۔ کسی صاحب جائیداد کی موت کے بعد ہر شخص اس کی جائیداد کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اس جائیداد پر قبضہ کس کا ہے۔ وراثت کے طور پر اس کا کون حقدار ہے۔ عطیہ کے طور پر کسی کو ملی ہے یا نہیں۔ یا کسی اور قانون کے تحت اس کا کون حقدار ہے یہ سب قانون شریعت میں موجود ہیں۔ اور انہیں کے مطابق حقوق کا تعین ہو گا۔ ہر شخص حقدار نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک عورت صرف ایک آدمی کے نکاح میں آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ خاوند کی وفات یا طلاق کی صورت میں وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے لہذا اباحت کے اس کلیے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

آسمانوں کی تخلیق

زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ پھر اللہ تعالیٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کئے ہیں۔ یونانی فطیات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد نو بتاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات

آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں تو فوج جاتے ہیں۔ کیونکہ عرش الہی ہے۔ اور کرسی الہی ہے۔ وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں اور ذات خداوندی ان تمام چیزوں سے ورزاوار ہے۔

سبح تعالیٰ کی تجلی عرش پر واقع ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ اُسے تجلی عظیم نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس تجلی سے اول سائر عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر تمام کائنات رنگین ہوتی ہے اس کے نیچے تمام اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد وہ تجلی اس پلٹ جاتی ہے۔

فرمایا: ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ یعنی وہ ہر چیز کو جانتے والا ہے۔ اُس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لہذا عبادت بھی اُسی کی کرنی چاہیے۔ جو عظیم کل اور قادر مطلق ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ جو قادر ہے۔ جو خالق اور رب ہے۔ اُس کے عہدہ الہ بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ فتنے کو جنت والا وہی ہے نہ جہنم علم صرف نہ تعالیٰ کہتے نہ جبرائیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبود برحق بھی صرف نہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے۔ اور نہ کوئی جرمی بنا سکتا ہے۔ نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے۔ کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے۔ کیونکہ عظیم کل صرف ذات خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

”كَيْفَ تَكْفُرُونَ“ سے لے کر ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ تک دو آیات کا تعلق ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا“ کے ساتھ ہے۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ کہ یہ تمہارے لیے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت بخشی۔ زندہ کی زندگی پر موت کا طاری کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر اُس نے تمہیں زمین کی تمام نعمتیں مہیا کیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ زمین کی تمام ہنریاں اور پھل پیدا کئے۔

النَّانَ مَتَّاءَ لَكُمْ وَلَا فَاكِهَكُمْ" یہ سب چیزیں تمہارے اور تمہارے دوستوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ موشی بھی تمہاری ہی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر سواری کرتے ہو۔ ان سے کھیتی باڑی میں مدد لیتے ہو۔ اور پھر ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے: خَلَقَ الدُّنْيَا... لَكُمْ وَخُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ لے انسان! یہ ساری دنیا ترے لیے پیدا کی ہے۔ اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اس کی معرفت حاصل کرو۔ اور اُسی کی عبادت کرو۔ وَمَخْلَقَتُ الْجَزَدَ وَالْإِنْسَانَ الَّذِي يُعْبُدُنِي" قرآن پاک شاہد ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق محض عبادت الہی کے لیے ہوئی۔

قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا۔ آسمان و خان (دھول) کی شکل میں تھا۔ پھر اس کو برابر کر دیا۔ زمین کا پھیلاؤ اس کے بعد عمل میں آیا۔ وَأَرْضٌ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا" زمین کا مادہ کثیف ہے۔ امام شاہ ولی اللہ تعفیات الیہ میں فرماتے ہیں: کہ جس طرح زمین مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آسمان بھی کئی عناصر پر مشتمل ہے مگر آسمان کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ اسی لیے وہاں شفافیت نظر آ رہی ہے۔ اور کوئی چیز جس قدر لطیف ہوگی، اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دیکھئے روح لطیف چیز ہے۔ اس لیے اس میں قوت بھی زیادہ ہے۔ اور مقنی کوئی چیز کثیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ الْغَرَضُ فَرَايَا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہذا عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔

الْبَقَرَةُ

البقرة

درس پانزدہم

(آیت ۲۰)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةًۭ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَیَنْحُكُ النَّسِیْمَ بِحِمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

توجہ دے اور اس وقت کو خیال میں لاؤ جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا کیا زمین میں ایسوں کو بنائے گا جو اس میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیری تعریف کے ساتھ اور تیری تزیین کرتے

ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۝۳۰

اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے چار بنیادی مسائل یعنی توحید، رسالت ایمان بالقرآن اور معاد (قیامت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد قرآن و رسالت میں شک کرنے والے لوگوں کا رد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن بے شمار انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا۔ جو اُس نے بنی نوع انسان پر کئے۔ ان میں خصوصاً مادی انعامات کا بیان تھا۔ جس میں انسان کا اپنا وجود، زمین و آسمان کی تخلیق، زمین میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ بالخصوص زمین سے نکلنے والے پانی کا ذکر تھا۔ جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں ایسی سے نباتت پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی روزی کا ذریعہ ہے۔

مادی انعامات کے تذکرہ کے بعد اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم علیہ السلام کو عطا کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ مگر اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔

قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی کے بعد حشر و نشر کی منزل طے کر کے جنت میں پہنچیں گے، ان میں سے ہر شخص بادشاہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو بادشاہی کروڑوں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر جنت کے ہر باشندے کا اعزاز دنیا کے بادشاہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہر جنتی کو آرام و راحت کے لیے الے الے سامان میسر ہوں گے۔ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں جنت میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہو جائے۔

تخلیق الہی سے
قبل کے ادوار

اس رکوع میں تخلیق آدم کا ذکر ہے، مگر پہلے کے ادوار کو ہم نہیں جانتے۔ کسی کو خواب میں بھی معلوم نہیں ہوا کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "تغیبات الیہ" میں بیان کیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل شہید

نے بھی اپنی کتاب "بعثات" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی حکیم انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف آدم علیہ السلام کے دور ہی کو ابتداء سے انتہا تک سمجھ لے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص اس دور سے پہلے کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ حضرت مجتہد دالغ ثانی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے بعد امجد خود شاہ ولی اللہ اس امت کے آخری دور کے حکمہ میں سے ہیں۔ البتہ ان پہلے بڑے بڑے حکماء گزے ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفاسیر اور تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں امام ابن کثیر، بڑے پائے کے محدث، مفسر اور تاریخ دان ہوئے ہیں۔ آپ امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی تفسیر کی مشہور کتاب ابن کثیر ہے آپ نے بخاری شریف کی شرح اور اصول حدیث پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تاریخ کی کتب "البدایہ والنہایہ" نہایت مستند کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ابتداء سے لے کر اپنے دور تک تمام زمانوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب آپ نے روایت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے۔ صحیح اور غلط روایت کی پڑتال کی ہے۔ اگرچہ ابن خلدون اور ابن جریر جیسے بڑے مؤرخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں تاریخ کی کتب موجود ہیں۔ مگر ان سے مستند ترین کتاب امام ابن کثیر کی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے

اس زمین پر کسی دور گزر چکے تھے۔ مثلاً ایک قوم یا افراد کو جن کئے تھے، اس کے بعد جن کا دور گزرا۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل اس دنیا میں جنات کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے۔ جس طرح آج کل کی دنیا میں قتل و غارت گری ایک عام معمول ہے اس طرح اُس دور کے جنات میں بھی جنگ و جدل عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے جنات کو مار مار کر پیٹڑوں اور جزیروں میں بھگا دیا اور اس زمین کو صاف کیا۔ اس واقعہ کے دو ہزار سال بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

جنات کا ذکر تو قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ مہم جن اور جن کے ادوار کا علم تاریخی روایات سے ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ حکماء نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی کتابوں میں ان ادوار کا تذکرہ کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں کا مادہ تخلیق اللہ تعالیٰ نے انسانوں، فرشتوں، جنات اور شیاطین کو مختلف مادوں سے پیدا فرمایا۔ پھر ان مادوں کے عناصر بھی مختلف ہیں۔ فرشتے ایک خاص نوری مادے سے پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ان فرشتوں کے مختلف درجات ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ فرشتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ ملا اعلیٰ کا ہے۔ یہ عالمین عرش فرشتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر حَافِظِ حَوْلِ الْعَرْشِ والے فرشتے ہیں۔ یہ سب خطیرۃ القدس کے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے فرشتے پھر فضائی فرشتے، اس کے بعد ہوائی فرشتے اور ارضی فرشتے ہیں جو زمین پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ مائیکل کے فرشتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول درجے کے فرشتوں کا مادہ تخلیق اُس آگ کی مانند ہے جو دوران سفر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں ساتھ تھیں۔ رات کا اندھیرا تھا۔ بیوی حاملہ تھی۔ ان کو دردِ ذرہ شروع ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کو دُور سے آگ نظر آئی۔ آپ اُس طرف گئے۔ تو وہ آگ ایک درخت سے نکل رہی

تھی۔ جو درخت کے پتوں کو جلانے کی بجائے انہیں سرسبز و شاداب کر رہی تھی۔ آگ جس قدر بھڑکتی تھی وہ درخت کی شاخوں اور پتوں میں شادابی آتی تھی۔ یہ واقعہ کس قدر قرآن پاک میں موجود ہے۔ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ نہیں تھی بلکہ حجاب نوری یا ماری تھا۔ الغرض! فرشتوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مادے سے کی۔ پھر اس میں مقدس روہیں ڈالیں۔ جس طرح انسانوں اور جنوں میں روہیں موجود ہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی روہیں ہیں۔

جنات اور شیاطین

جنات کے مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے: وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارٍ یعنی جنات کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شیاطین کا مادہ تخلیق سنایت گند اور فلیظ ہوتا ہے۔ بالکل سنڈ اس کی مانند کہ جب وہ زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ تو اس سے بخار اور بواٹھتی ہے۔ تو گویا جنات اور شیاطین کا مادہ آگ اور ہوا ہے۔ اس میں گیس برقی ہے۔ اور تپش کا مادہ بھی ہوتا ہے۔

انسان کا مادہ تخلیق

انسان کا مادہ تخلیق خاک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ سب آدم کے وجود میں موجود ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن پاک میں آتے ہیں خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ الْإِنْسَانِ كَالْعَصْرِ والی مٹی سے پیدا کیا۔ دو سکر مقامات پر تراب اور طین کا لفظ بھی آتا ہے۔ الغرض انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق باقی تخلیقات کی نسبت پیچیدہ ہے۔ اس میں تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس مقام پر تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا کہ تحقیق میں میں میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اُسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جائے۔ لہذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا: يٰۤاٰدُوۡدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ یعنی اے داؤد! ہم نے آپ کو دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
خلیفۃ اللہ میں

قرآن پاک میں خلیفہ دومعانی میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ خَلَفَ يَخْلُفُ دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔

خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا۔ انسان کے علاوہ باقی بے شمار مخلوقات بھی اس زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آدم علیہ السلام کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے۔ گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہو گا۔ اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہی خلافت ہے: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

منہ خلافت معنوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام، نظم خلافت ہے۔ دین میں ملوکیت اور ڈکٹیشن کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اُسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے۔ صرف ایک خارجی درندہ ایسا ہے۔ جو کہتا ہے کہ حکومت اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے۔ یہ انارکسٹ لوگ ہیں۔ جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیروکار خلیفہ یا حاکم (دام) کو محسوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو

منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں۔ اور وہی اُسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو مخصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرامؓ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دُفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ خود حضور علیہ السلام کے دُفن کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کا جہد اطہر بیت المقدس لے جایا جائے۔ کوئی مکہ معظمہ لے جانے کے حق میں تھا۔ تو اس کا فیصلہ بھی حضور علیہ السلام کے جلسہ شہین حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا۔ انہوں نے کہا اے کہ اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ جس جگہ پر آپ کا وصال مبارک ہوا۔ اُسی جگہ پر آپ کو دُفن کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اہم معاملہ طے ہو گیا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم علیہ السلام نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی علیہ السلام نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی **يَا أَيُّهَا النَّاسُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِنَّمَا أَبَا بَكْرٍ** یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہیے۔

انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انتخاب ہوا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملتے ہیں مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے اپنے آخری ایام میں حضرت عمرؓ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا۔ آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔ یہ گریبا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمرؓ

۱۔ شامل ترمذی ص ۶۰ ۲۔ شامل مع ترمذی ص ۶۰، مطبع نور محمد کراچی

۳۔ مسلم ص ۲۴۳ ۴۔ البدایہ والنہایہ ص ۱۸

امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شورعی قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔

خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پا کر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے۔ ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اس کے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔
الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو "قَالَ لَا اتَّخِذُ فِيهَا مَنْ يَفْسِدُ فِيهَا وَيُفْسِدُ الْبَرِّ مَكَانًا"۔ یعنی فرشتوں نے کھائے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ جواب کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اولیٰ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات انیس الہام کی ہو جس کی بنا پر انہوں نے یہ رائے دی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے جنات کے حالات پر قیاس کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جنات نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ آدم کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتوں نے خلیفہ کے لفظ سے یہ قیاس کیا کہ خلیفہ جب زمین پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ تو وہاں پر لازماً فتنہ و فساد اور خونریزی بھی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دیا۔ تاہم زیادہ تر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ گمان جنات کے حالات کی بنا پر تھا۔

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا وَخَرَجُوا

نَسَبُ مُحَمَّدٍ مَوْلَا رِیْم: اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ وَنُقَدِّسُ لَكَ اَدْرِیْ پائیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔

تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقصان والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شہریوں سے پاک ہے۔

فرشتوں کا یہ جواب سُن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَالَ اِلٰی اٰھْلِکُمْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف و ولایت کیا ہے۔

الْعَمَّ

البقرة

درس شانزدہم ۱۲

(آیت ۲۱ تا ۲۴)

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَكِ
فَقَالَ أَتَوْنُنِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾
قَالُوا سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ
الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ فَلَمَّا
أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ
غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سائے نام سکھائیے۔ پھر پیش کیا ان
کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انہوں نے
کہا پاک ہے تیری ذات، نہیں ہے ہمارے پاس علم مگر وہ جو تو نے ہم کو سکھایا ہے۔
بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم!
بتلائیے ان کو ان چیزوں کے نام پس جب اُس نے ان کو ان چیزوں کے نام
بتلا دیے تو فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں
کی پوشیدہ چیزوں کو۔ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جس کو
تم چھپاتے ہو۔ ﴿۳۳﴾

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع ان کو مددیت اختیار کرنے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے
کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی پہچان کے سلسلے میں اُس کی صفات و کمالات کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ
نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اُس نے نسل انسانی پر کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام
کی تخلیق کا ذکر کیا "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَكِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً"۔
اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تذکرہ کیا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں

نے جواب میں کہا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا؟ کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو بنائے گا جو فساد کریگی اور خون بہائے گی۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تیری حمد کے ساتھ۔ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی بیشک میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔"

خلافت کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کو بطور خلیفہ یا فریادہ بنا دیا ہے۔ تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض انجام دے سکیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر شرعی قانون انسان کے ذریعے نافذ فرمایا ہے۔ اور انکو اپنی احکام یعنی وہ احکام جو انسانوں سے متعلق نہیں ہیں وہ قدرت کے مقرر کردہ دوسرے کارندے انجام دیتے ہیں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا گمان کرنا کہ یہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ فرشتوں نے خیال کیا کہ خلیفہ کی ضرورت ہی ایسی جگہ پڑتی ہے۔ جہاں قتل و غارت اور خوریزی ہوگی۔ لہذا انہوں نے ایسا گمان کیا۔ یا پھر یہ وجہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کو جنوں پر قیاس کیا۔ جو اس نسل سے پہلے اس زمین پر فتنہ و فساد برپا کر چکے تھے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان سوال و جواب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کی حکمت کے اظہار کے لیے فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب نام سکھائیے۔" ان ناموں سے کیا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کون سے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ تفسیر البسود اور مذک عربی زبان کی چار چار جلدوں کی مختصر تفسیریں ہیں۔ ان کے مؤلفین حنفی اہم تھے۔ وہ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ: عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ سے مراد تمام انواع و اجناس کے نام ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سکھائے۔ اس سے مراد ہر فرد کا نام سکھانا نہیں۔ کیونکہ ہر فرد اور جزو کا تعلق غیب سے ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ انواع و اجناس

آدم علیہ السلام کو
کئی چیزوں کے
نام سکھائے گئے

کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انسان ایک نوعی نام ہے۔ اس طرح اجناس میں سے جو ان ایک جنس ہے۔ اور پھر آگے اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً گھوڑے، بھینس، گائے بھیڑ بکریاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔

بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ عَلَّمَ اَدْعَاہُ اَلْاَسْمَاءُ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے نام بتلا دیے۔ برخلاف اس کے شیخ ابن عربی فرماتے ہیں کہ اسمائے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ ہیں۔ نہ کہ بعض دوسری چیزوں کے نام بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اسماء سے مراد جزئیات ہیں۔ مگر تمام کی تمام اور ہر قسم کی جزئیات نہیں۔ بلکہ صرف وہ جزئیات مراد ہیں جن کی ضرورت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صرف انسانی ضروریات کی تمام چیزوں کے نام بتلا دیے۔ جو چیزیں انسانی ضرورت سے باہر ہیں۔ ان کے بتانے کا نہ کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ ہی وہ بتائیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال سورۃ نمل میں آتی ہے کہ مَلِكًا بَاكُوۡنَ۟ وَ اُنۡتِیۡتَ مِنْۢ كُلِّ شَیْءٍ ۝ ہر چیز دی گئی تھی۔ تو یہاں پر ہر چیز سے مراد اس کی سلطنت کی ضروریات ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس زمانے میں ملک با کے پاس فنیٹیم طیارے اور راکٹ بھی موجود تھے۔ بلکہ ضرورت کی تمام اشیاء سے متبرک تھیں۔ تو یہاں پر بھی اَلْاَسْمَاءُ کُلُّهَا سے مراد انہی چیزوں کے نام ہیں جو انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔ اسی طرح سورۃ نمل میں شہد کی مکھیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّہٗ لَمِنْۢ كُلِّ فَاۡرٍ ۝ ہر قسم کی شہد کی مکھیوں سے کھاؤ اور شہد پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ایک پاکیزہ چیز رکھ دی ہے۔ اور اس کے بیٹ میں ایک لطیف قسم کا مادہ پیدا کر دیا ہے جس سے شہد بنتا ہے۔ تو یہاں پر تمام قسم کے پھل کھانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا جہاں کا ہر اچھا بُرا کھانا کھلا پھیل کھائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور رسائی کے مطابق جتنے پھل میں مکھی اُن پر میٹھتی ہے۔ اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ شہد جیسی مفید چیز پیدا کرتا ہے۔ باوام اور

آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام کھلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا يٰۤاٰنٰبِلُوْنٰی بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعوے یہ ہے کہ انہی مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم میری تسبیح و تہلیل بیان کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ مخلوق تو دنیا میں خویزی کرے گی مگر تم نہیں جانتے کہ انسان کون سے کمالات کا حامل ہو گا۔ مجھ ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے۔ جو اے دیا گیا ہے۔ اور خلیفہ کے لیے ان چیزوں کی مابیت اور حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جن پر اُس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے۔ مثلاً اگر خلیفہ کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو مآوٹ کرتی ہے۔ اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الحماضٹ کسلائی ہے۔ تو خلیفہ شراب کے ریا کو سزا کیسے دے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام ان کی حقیقت اور مابیت سے آدم علیہ السلام کو آگاہ کر دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ كُنْے لَگے اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے لَاۤ اَعْلَمُ لَنَآ اِلَآ مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے اسماء ان کی خاصیت اور مابیت کا علم نہیں ہے۔ ہم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتلادیا تھا کہ آدم میں ہمیت اور ملکیت دونوں خواص ہوں گے۔ مگر فرشتوں کی نگاہ صرف ہمیت تک ہی پہنچی۔ آدم کی ملکیت تک نہ گئی۔ چنانچہ اس کمال کو واضح کرنے کے لیے علمی صلاحیت پیش کی۔ تب فرشتوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ کہ ہمارے پاس یہ کمال نہیں ہے۔

ہیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے عطا کیا۔ ہاں جس ہستی کے پاس علم و فہم کا یہ خزانہ ہو گا۔ خلافت کے لائق وہی ہوگی۔ اور وہی ہستی قانون خداوندی کو نافذ کر سکے گی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علم فرشتوں کو عطا ہی نہیں کیا تو ان کے امتحان کا کیا مطلب؟ اگر آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں کو بھی وہ علم سکھلایا جاتا تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ اس کے جواب میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اسما کی تعلیم فرشتوں کی موجودگی میں ہی دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے ان کے نام ذہن میں محفوظ کر لیے مگر فرشتوں کو چونکہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی لہذا انہوں نے یہ نام ذہن نشین رکھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی استاد پورے کلاس کے سامنے پچھلے سبق کی پوری پوری وضاحت کر دے۔ مگر بتا دیتا ہے کہ امتحان کے وقت بعض طالب علم ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں۔ مگر بعض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ حالانکہ استاد نے سب کو بیک وقت ایک ہی پچھر دیا تھا۔ یہی حال آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ہوا۔ آدم علیہ السلام نے حسب حال ہونے کی بناء پر ان چیزوں کے نام یاد کر لیے اور بوقت امتحان بتا دیے مگر فرشتے اس سبق کو ضبط نہ کر سکے لہذا انہوں نے امتحان کے وقت عاجزی کا اظہار کر دیا۔

الفرض! جب فرشتے اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فرمائیے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتا دے۔ چنانچہ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ جب آدم علیہ السلام نے ان کو ان چیزوں کے نام بتا دیے۔ کہ یہ بٹریا ہے۔ اس میں سالن پکایا جاتا ہے۔ یہ تو اسے اس پر روٹی پکائی جاتی ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر امتحانی سوال کیے۔ آدم علیہ السلام نے فر فر جواب دے دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ كَيْدِي لَا يَمْلِكُ لَكُمْ شَيْءٌ وَلَا يَنْصُرُكُمْ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ كَيْدِي لَا يَمْلِكُ لَكُمْ شَيْءٌ وَلَا يَنْصُرُكُمْ اللہ تعالیٰ نے تم کو جاننے والا ہوں۔

یہاں آسمان و زمین کے غیوب کا تعلق مخلوق کے اعتبار سے ہے۔ ذکر اللہ تعالیٰ کے لیے
 بھی کوئی چیز غائب ہے۔ اس کے لیے کہ کوئی چیز بھی پس پردہ نہیں۔ البتہ مخلوق کے لیے
 بعض چیزیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور بعض پوشیدہ۔ دوسری جگہ ہے ”وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ
 مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ“ تیرے رب کے تو ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پر تو ہر چیز عیاں ہے۔
 اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم الغیب والشہادۃ اس لیے بولا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو جانتا
 ہے۔ جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے۔ یہاں پر بھی اِنِّیْ عَلَّمَ غَيْبِکَ
 السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین و آسمان کی تمام
 چیزوں کو جانتا ہوں، جو مخلوق یعنی انسان، جن اور فرشتوں کے اعتبار سے خواہ پوشیدہ ہیں یا
 ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام کی صلاحیت اور ان کے کمال کو بھی جانتا ہوں۔ اے فرشتو! تمہاری
 نظر تو آدم علیہ السلام کی ہیئت تک ہی پہنچی ہے اور اسی سے تم نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ یہ
 فتنہ دفا د بپا کرے گا۔ اور خوزیری کا مرتکب ہو گا۔ یا تم نے جنات پر قیاس کر کے کہہ دیا ہے
 کہ آدم زمین میں لڑائی کھجھوٹے کا موجب بنے گا۔ تمہاری نظر اس کے کمال تک پہنچ جاتی تو یہ
 گمان نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ اے مولا کریم! ہم تیری تسبیح و تقدیس
 بیان کرنے والے ہیں لہذا اگر زمین میں نیابت کی ضرورت ہے۔ تو ہم حاضر ہیں۔
 اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہر اُس چیز کو جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے
 ہو۔ اے فرشتو! شاید تمہارا خیال ہو کہ جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی ہے۔ وہ آدم میں نہ پائی جاتی ہو۔
 مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے آدم میں وہ کمال رکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔
 لہذا نیابت کا حقدار آدم علیہ السلام ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا ”وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
 تَكْتُمُونَ“ اے فرشتو! میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔
 اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بزرگی اور فضیلت کو عملی طور پر فرشتوں کے سامنے پیش
 کیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا بیان ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ
اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۝۳۴ وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ
اَسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَکُوْنَا مِنَ الصّٰمِیْنَ
۝۳۵ فَازْلٰهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا
فِیْهِ س وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَکُمْ
فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حَیْنٍ ۝۳۶

ترجمہ: اور اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب کہا ہم نے فرشتوں سے
سجدہ کرو آدم کے لیے پس سجدہ کیا انہوں نے۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر
کیا اور وہ کفر کرنے والوں میں سے تھا ۝۳۴ اور ہم نے کھائے آدم تم اور تمہاری
بیوی جنت میں رہو۔ اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کشادگی سے کھاؤ۔
جہاں سے بھی چاہو۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، پس ہو جاؤ گے
تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ۝۳۵ پس پھلایا اُن دونوں کو شیطن نے
اُس سے۔ پس اُن کو اُس نعمت سے نکالاجس کے اندر وہ تھے اور ہم نے کہا اتر
جاؤ بعض تمہارے بعض کے لیے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا

ہے۔ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے ۝۳۶

فرشتوں کی سجدہ ریزی
حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا کرنے پر فرشتوں کو آپ کی نصیحت کا علم ہو
میا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم کرائی۔ تاکہ ان کی نیابت واضح ہو جائے۔
تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ کہ آدم علیہ السلام کے
لیے سجدہ کرو اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ مگر ابلیس نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

مفسرین کرام نے اس مسئلہ میں بڑی بحث کی ہے کہ جو سجدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے
 آدم علیہ السلام کے لیے کرایا وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ انتہائی درجے کی عاجزی و تذلل اور تواضع
 کے ساتھ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے۔ اور اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اگر پیشانی
 معنوی برحق کے حق کو ادا کرنے کے لیے جھکا کر ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کرنا ہر دور اور ہر
 شریعت میں حرام، باطل، کفر اور شرک رہا ہے۔ اور ایسے سجدہ کو سجدہ عبادت کہتے ہیں۔ البتہ
 سجدہ تحیہ و تحکیم جو محض عزت و اعزاز کے لیے کیا جائے۔ یا جو سلام کے وقت کیا جائے۔ یا
 سجدہ پہلی شریعتوں میں رواجاً۔ مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ سجدہ
 کرنا بھی عوام قرار دیا گیا ہے۔ جو سجدہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام سے رو برد کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا
 یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جو ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی کے درمیان فرق صرف نیت سے ہی
 ممکن ہے۔ اگر بوقت سجدہ نیت یہ ہے کہ یہ وہی سجدہ ہے جو حق تعالیٰ کے سامنے ہوا ہے
 تو پھر ایسا سجدہ غیر اللہ کے سامنے کفر اور شرک ہوگا۔ اور اگر سجدہ محض تعظیم و تحریک کے لیے ہے
 تو یہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ یا فرشتوں
 کا آدم علیہ السلام کو سجدہ۔ مگر ہماری شریعت میں ہر قسم کا سجدہ ناجائز ہے۔ خواہ وہ تعظیمی ہو یا عبادتی
 ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سجدہ منع ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں حضور
 علیہ السلام کا فرمان ہے لَوْ كُنْتُ أَهْرَاحِدًا لَرَأَيْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا
 یعنی اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے
 کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے عَجَّ لَا يَصْلَحُ
 لِبَشَرٍ أَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ یعنی کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو
 سجدہ کرے۔ ایک صحابی نے حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! ہم باہر

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱۱، تفسیر ابن کثیر ص ۱۱، ۲۔ حجة اللہ البالغہ ص ۱۱

۳۔ ترمذی ص ۱۸۷، ۴۔ منہاج احمد ص ۱۵۹

خدا تعالیٰ کے
 اس کو اب ہر قسم
 سجدہ حرام ہے

جا کر دیکھتے ہیں کہ دہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو کجہہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم آپ کے سامنے کیوں کجہہ نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے منع فرما دیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تو کیا تم میری قبر پر کجہہ کر دو گے۔ تو اس شخص نے کہا حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر کجہہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے کجہہ گونا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے قبر کو کجہہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس کجہے مراد وہی کجہہ ہے جو بندہ اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو تمام صحیحہ کرام، ائمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

فرشتوں کے کجہہ
کی بعض توجیہات

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو کجہہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حقیقت میں کجہہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض جہت تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے کجہہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور کجہہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو کجہہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کجہہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ کجہہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ لا اِلهَ اِلَّا اللهُ سبھی ہے۔ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو کجہہ کرو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ اور سبب سے۔ اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس کجہہ میں دونوں باتیں

۱۔ بوداورد ۲۹۱ ۲۔ بیان القرآن ۳۔ ابن کثیر ۴۔ دہ مشرق ۵۔

۶۔ تفسیر مظہری ۷۔ ابن کثیر ۸۔ معالم التنزیل ۹۔

پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم و تکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی۔
گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

سجدہ خلافت یا سجدہ تعظیمی میں سجود الیہ عرضی یا مجازی ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نوتوی فرماتے ہیں: کہ سجدہ عبادت میں سجود الیہ بالذات ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھی مفسر قرآن کی ترجمہ یہ ہے۔ کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی اس زبردست تجلی کو سجدہ کیا تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ یہی ترجمہ مولانا نوتوی نے خانہ کعبہ کے متعلق اس وقت کی تھی جب ایک ہندو دیانند سرسوتی نے اعتراض پیش کیا تھا۔ اس کا کنایہ تھا کہ اگر ہندو پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ تو مسلمان بھی پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں والے مکان یعنی خانہ کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر ہندو اور مسلمان میں فرق کیا ہوا؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نوتوی نے فرمایا تھا کہ مسلمان اس مکان کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس تجلی الہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو اس گھر پر پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تجلی عظیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا مسلمان پتھر کی دیواروں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی وقت خدا نخواستہ بیت اللہ شریف کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں اور بظاہر دہاں کوئی چیز باقی نہ رہے تو بھی مسلمان اسی جہت میں سجدہ ریز ہوں گے۔ برخلاف اس کے ہندو اسی طرف سجدہ کریں گے۔ جس طرف ان کا بت رکھا ہوا ہوگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

ابن کثیر کا ترجمہ

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو فَسَجَدُوا سب نے سجدہ کیا اِلَّا ابلیسَ سوائے ابلیس کے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔ وَادْقُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدْ وَاٰمُرُ ابلیس کے انکار کا کیا مطلب؟ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سجدے کا حکم نہ صرف ملائکہ کو تھا، بلکہ جنات کو بھی تھا۔ اور ابلیس جنات میں سے ہے۔ بلکہ ابوالجنات تھا۔ اور جب کسی بڑے کو کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو

اس کے ماتحت والے خود بخود اس حکم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق آتا ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ جب میں نے تمہیں حکم دیا تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے کا حکم ابلیس کو بھی ہوا تھا۔ اور نسلی طور پر یہ جنات میں سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِ وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ مقصد یہ کہ سجدہ کا حکم فرشتوں اور جنات دونوں انواع کو ہوا تھا۔ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس اور اس کی قوم نے انکار کیا۔

حضرت یحییٰٰ مینیریؒ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ مگر ایک حکم کی سربانی پر مردود ہو گیا۔ اور اتنے لمبے عرصے کی عبادت برباد ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ محدث ابن ابی الدنیل نے اپنی کتاب مکایہ الشیطان میں ایک ہدایت بیان کی ہے۔ مکایہ الشیطان کا مطلب ہے۔ شیطان کی مکاریاں۔ تردہ فرماتے ہیں کہ کسی موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہو گئی۔ ابلیس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری سفارش کریں۔ وہ میری توبہ قبول کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ اُدھر سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا کہ میں ابلیس کی توبہ اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوں کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو یہ شرط پیش کی تو کہنے لگا کہ زندگی میں تو میں نے آدم کو سجدہ کیا اب اُس کی قبر کو سجدہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ابلیس اپنی بات پر پکا تھا۔ اس نے انکار کیا۔ اَبٰی وَاَسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ نہ صرف انکار کیا بلکہ تکبر بھی کیا۔ اور تھا انکار کرنے والوں میں۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آجکل کے بعض

مرد پست پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مشرک کا فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ بھی تھی، محض تعظیم مقصود تھی۔ تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہیے۔

حسد ولین
کنا مہ

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ابن منذر نے عبادۃ بن ابی امیہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ اس کائنات میں سب سے پیدا گناہ حسد تھا۔ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام پر کیا۔ اور کہا "أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں۔ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا مردود ٹھہرا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام
اور حضرت حوا جنت میں

انکار ابلیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا "آدم علیہ السلام کی دشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کی پسلیوں سے اُن کا جوڑا پیدا فرمایا۔ اور آپ نہت حوا سے مانوس ہو گئے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ وَكَانَ مِنْهَا رَعْدٌ حَيْثُ شِئْتُمَا اور تم اس میں سے کٹ دگی کے ساتھ کھاؤ۔ جہاں سے چاہو۔

اس جنت کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو بسنے کا حکم ہوا۔ ۶۰ عالم بالا میں جَنَّةُ الْعَاوَى ہے جس کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ النجم

میں موجود ہے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی جو کہ سدۃ المنتہی کے قریب ہے عِنْدَ هَاجَتِهِ
الْمَاوٰی یہ عالم بالا ہی کے متعلق ہے۔

شجر ممنوعہ

جنت میں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو یہ حکم بھی دیا۔
کہ جہاں سے جتنا جی چاہے کھاؤ مگر وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے قریب
نہ جانا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِیْنَ تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ
گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔

یہ کون سا درخت تھا۔ جس کی مقاربت سے منع فرمایا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے
کئی اقوال ہیں۔ بعض اسے کھجور کا درخت بتاتے ہیں بعض انجیر کا اور بعض انجور کا۔ بائبل کی
روایت کے مطابق یہ نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت تھا۔ اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ
آدم علیہ السلام اور حوا کے ملاپ یعنی مباشرت کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ
سے پیدا ہونے والی اولاد کو پھیل کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ شجر ممنوعہ گندم کا درخت تھا۔ مگر یہاں یہ اعتراض وارد
ہوتا ہے کہ گندم کا درخت نہیں بلکہ چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس اعتراض کا جواب بھی
دیا ہے، فرماتے ہیں کہ شاعر لوگ لطفے کی زبان میں کہتے ہیں۔

۔ بخور نان جواری گر جوار اللہ می خواہی کہ گندم کرد آدم را بیرون از جنت الماوانی
اگر اللہ نعلے کا قرب چاہتے ہو۔ تو جوار کی روٹی کھاؤ۔ جو قد سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گندم گرم
ہوتی ہے۔ اگر اس کی روٹی کھاؤ گے تو اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ مولانا رومی
بھی فرماتے ہیں ۔ این عشق نیست این فساد گندم است۔ یہ عشق نہیں ہے
بلکہ گندم کی گرمی کا اثر ہے۔ اور یہ اسی کا برپا کردہ فساد ہے۔ غرضیکہ گندم کے اس درخت
کو دنیا کے گندم کے درخت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

ابن ابی ذر نے خود اپنا مشابہہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں آنا بڑے شکرہ دیکھا۔ جسے

دو بکڑے کر کے بڑی شکل سے اونٹ پر لاد گیا۔ اگر اس دنیا میں آنا بڑا سنگڑہ ہو سکتا ہے۔ تو جنت میں گندم کا درخت آنا بڑا کیوں نہیں ہو سکتا۔ ام ابو داؤد نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے دین بالست لبا کھیرا دیکھا ہے۔ یہ ترکی قسم کا کھیر جو موسم گرما میں ہوتا ہے۔ اور بڑے شوق سے ٹھیا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزل کے وقت امار کے دانے نئے بڑے بڑے ہوں گے۔ کہ ایک دانے کے نصف خول سے آنا بڑا خیمہ بن سکیگا۔ جس کے نیچے دس بیس آدمی ٹھہر سکیں۔ بہر حال یہ اعتراض معقول نہیں ہے۔ کہ گندم کا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں گندم کا بہت بڑا درخت ہو۔ جس کے قریب جانے یا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔

شیطانی دوسرے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام اور حضرت عوا جنت میں رہنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ ابھی ان میں بہیمیت کا مادہ نہیں ابھرا تھا۔ کہ شیطان نے آہستہ آہستہ دوسرے ڈان شروع کیا۔ فَازَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا۔ دوسری جگہ آتا ہے ۱۱ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ شَيْطَانُ نے دونوں میں دوسرے ڈالا۔ کس چیز کے متعلق دوسرے ڈالا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق دوسرے ڈان۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ شیطان نے کہا کہ اس کو کھا لو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو گا۔

بعض کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دوسرے دل کے اندر ہی ڈالا جائے۔ کوئی فعل سرزد کرنے سے بھی دوسرے انداز ہی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان ایک جبریہ کو پکڑ کر لیا۔ اور جنت کے دروازے پر اس سے مباشرت کی جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ تو ان کے دل میں بھی ویسا ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت حوا کے ساتھ مقاربت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا لباس اڑ گیا۔ اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔

شیطان کی دوسری اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوسری اندازی نے فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ
 ان دونوں کو اس جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوا
 ہم نے کہا اتر جاؤ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا
 دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مَسَقَرٌ اور زمین میں تمہاری
 لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ اور ایک مدت
 تمہارا متاع اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ
 کر کہیں فضاؤں یا مہندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے
 آج کے دور میں جو پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم زمین پر مستقل طور پر نہیں رہیں گے۔ بد چاند،
 مریخ یا دوسری سیاروں میں چلے جائیں گے۔ تو یہ محض شیطانی پراپیگنڈا ہے۔ چاند ہماری زمین سے
 قریب ترین سیارہ ہے۔ اور اس کا فاصلہ اڑھائی لاکھ میل ہے۔ مریخ تو یہاں سے پچاس کروڑ
 میل دور ہے۔ اور دوسری سیارے اس سے بھی دور ہیں۔ فرض کر لیا کہ چاند پر رہائش کا بندوبست
 ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں۔ تو سائنسدانوں کا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ایک پونڈ
 غذا کو چاند پر پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ وہاں پہنچنے کا خصوصی لباس چار لاکھ
 روپے میں تیار ہوگا۔ یہ لباس تو راستے میں ہی جل جائے گا۔

زمین ہی اصل
 ٹھکانا ہے

چاند پر تو ایسی ہی لباس پہنا ہوگا۔ وہاں کی گرمی
 کی مقدار تقریباً چالیس ہزار سنی ڈگری ہے۔ جہاں پر پانی تو کھاتا نہ بھی پھٹنے لگتا ہے۔ پتہ کے
 ایک طرف گرمی ہے۔ اور دوسری طرف اتنی سردی ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔
 لہذا ایسی جگہ پر رہنے کے لیے اتنا قیمتی لباس تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ خوراک اور لباس
 پر اتنی رقم کون خرچ کر کے رہائش پذیر ہوگا۔ اگر کوئی وہاں پہنچے گا بھی۔ تو اس کا قیام
 بالکل عارضی ہوگا۔ آخر کار اُسے زمین پر ہی آنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین
 ہی ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيدُكُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخِرٰی اے انسان! ہم نے تمہیں اسی
 زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں

گئے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ۔ ایک خاص
 مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

البقرة

آیت ۲۹، ۳۰

درس شہر و مہم

فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ۝ (۳۷) قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ
مِنْهُ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝ (۳۸) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۳۹)

۱۷۲

ترجمہ: پس آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ

نے رجوع کیا آدم کی طرف مہربانی کے ساتھ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا ہے وہ

مہربان ہے ۝ (۳۷) ہم نے کہا تم سب زمین پر اتر جاؤ۔ پس جب میری طرف سے

تمہارے پاس ہدایت آئی پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ اُن پر کوئی خوف

نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے ۝ (۳۸) اور جنہوں نے کفر کیا۔ اور جاری آیتوں کو

جھٹلایا۔ وہ دوزخ واس ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝ (۳۹)

کثرت پختہ

جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔

تو ان سے انعام و اکرام لے لئے گئے۔ اور انہیں حکم ہوا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ بعض تمہارے بعض کے

دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور تمہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب

آدم علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ انہیں زمین پر اترنے کا حکم مل گیا ہے۔ بعض روایتوں میں یہ

بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے اور آدم علیہ السلام کے

سر سے تلج اتار لیا۔ اور اُن کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اتار لیا اور انہیں رہنہ کر دیا۔ چنانچہ انہوں

نے مہمانی کے لیے جنت کے درخت کے پتے استعمال کیے۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے

ستر کا کھنڈ خلاف فطرت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
کی توبہ

اس کے بعد کیا ہوا۔ فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ پس آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے
چند کلمات سیکھے۔ تعلق کا معنی پانا یا سیکھنا ہے۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا یا آدم علیہ السلام
کے دل میں ڈالا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف
میں آتا ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سَاءً وَإِنْ لَمْ نَغْفِرْ لَكَ وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ یعنی اے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں بخش
نہیں کرے گا۔ اور ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اس کے
علامہ حدیث میں ان دعائے کلمات کا ذکر ہے۔ جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی
نتیجہ یہ ہوا کہ فَتَابَ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم علیہ السلام کی طرف مہربانی کے ساتھ
تَابَ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا
مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا اپنی مہربانی کے ساتھ۔ اور جب اس لفظ کو بندے
کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بندے نے رجوع کیا اپنی عاجزی کے
اعتراف کے ساتھ اور بُرائی کے ترک کرنے کے ساتھ۔ گویا توبہ کی صفت کا تعلق فائق اور مخلوق
دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں تَوَلَّوْا إِلَى اللَّهِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ
گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر دو۔ اس سے معافی مانگو۔
إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ
نے اُن کی لغزش کو معاف کر دیا۔

اہم بیہقی نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے کہ اپنی لغزش
پر آدم علیہ السلام اس قدر رنے کہ لَوْ رَزَنَ دُمُوعُ اَدَمَ بِجَمِيعِ دُمُوعِ وَلَدِهِ لَرَجَحَ
دُمُوعُهُ عَلَى جَمِيعِ دُمُوعِ وَلَدِهِ یعنی آدم علیہ السلام نے جس قدر آنسو بہائے اگر ان کا
مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے
آنسو غالب آجائیں۔ اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت بھی مروی ہے۔

سزا دی۔ کہ گوشت کھانا شروع ہو گیا۔ آج کل گرمی کے موسم میں تو ایک دو دن سے زیادہ گوشت نہیں رہ سکتا۔ بدبو آنے لگتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے۔ گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے تو یہ بھی خراب نہ ہوتا۔ خواہ کتنا ہی عرصہ پڑا رہتا۔

”دوسری بات آپ نے فرمائی کہ لَوْ لَا حَوَّاءُ لَمْ تَخْذُلْ نُحْشِ زَرْجَهَا۔ یعنی اگر حوا اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ خائن نہ ہوتی۔ حوا کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بہر حال جب آدم علیہ السلام نے پھل کھالیا۔ اور برہنہ ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ثُمَّ سَبَّ يَمِينُ پر اتر جاؤ۔ یہ حکم شیطان، آدم علیہ السلام اور حوا سب کے لیے تھے۔ تو بہتر قبول ہو گئی۔ مگر زمین پر اتر جانے کا حکم صادر ہو گیا۔

بائبل اور بعض تاریخی روایات میں مور اور سانپ کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلانے میں معاون ہوئے تھے۔ اور یہ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر یہ روایت درست نہیں میں مجموعہ بات یہی ہے کہ شیطان نے جنت کے باہر دوسرا انداز ہی کی تھی۔ اس نے دروازے سے باہر جہنم سے مباشرت کی تھی۔ جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی بات بھی سُن رہے تھے۔ اسی بات سے آپ کو دوسرا پیدا ہوا۔ اور آپ نے وہ کام کر لیا۔ جس سے منع کیا گیا تھا۔ لہذا آپ کو زمین پر اترنے کا حکم ہو گیا۔

آدم علیہ السلام نے چل کھایا ہوا تھا۔ اُوچھڑ زمین پر اتار گیا۔ آپ کو بول و براز کی حاجت ہوئی۔ پیٹ میں درد پیدا ہوا۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اس سے پہلے یہ تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو بتایا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طریقے سے فراغت حاصل کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو براز سے بدبو آنے لگی۔ آپ کو اور پریشانی ہوئی۔ رونے لگے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ

آدم علیہ السلام
اور حضرت حوا
کی مصائب

سترون تک ملتے ہے۔ اس واقعہ کو ابن ابی الدنیاء نے روایت کیا ہے۔ اور امام دارقطنی نے بھی کتاب الافراد میں حضرت عمرؓ سے یہ بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس وقت بھیجا جب حضرت حوا کو حیض کی حاجت ہوئی جنت میں تو ہر طرح کی پاکیزگی حاصل تھی۔ زمین پر اگر یہ پریشانی لاحق ہوگئی۔ مائی حوا نے جبرائیل علیہ السلام کو آواز دی۔ کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے مجھے وقفہ وقفہ سے خون آرہا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ اے حوا! یہ بات تم پر اور تمہاری بیٹا پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہے گی۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایام حج میں حیض کی حالت لاحق ہوگئی۔ آپ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حیض آنے پر سخت اندر دھو ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ هَذَا شَيْءٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَى بَنَاتِ اٰدَمَ يَ اِیْ اِیْ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں پر لازم کر دیا ہے۔

الغرض! جبرائیل علیہ السلام نے حوا کو یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹیوں پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بنتے گا۔ اور تمہارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عورت جسمانی طور پر نعمت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر نیک بخت ہے۔ تو باطنی طور پر بھی اس کو طہارت نصیب ہوگی۔

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے۔ تو بعض روایات کے مطابق قیس قسم کے پھلوں کے بیج ان کے ساتھ آئے۔ بعض دوسری روایات میں ہزار قسم کا ذکر آتا ہے بعض روایات میں خوشبو کا ذکر ملتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خوشبو جنت کا تختہ ہے اگر کوئی پھول یا گلہری پیش کرے۔ تو اس کو دوزخ میں کرنا پڑے۔ فَإِنَّهُ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ کیونکہ یہ جنت سے آئی ہوئی ہے۔

جنت کے تختے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ نہ ن چمنا در جستجو بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا تاکہ دنیا میں کام کاج کر سکیں۔ حجر اسود بھی جنت سے اترتا تھا۔ پتے اسل کو جبل ابوقیس پر رکھا گیا۔ یہ دودھ کی طرح سفید تھا۔ اور رات کو سو ج کی طرح چمکتا تھا۔ اہمتر اہمتر انسانوں کے گناہوں کی تار کیوں نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام
در وقت نزول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین شرق السنہ میں اترے تھے۔ چنانچہ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کے مصنف لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نزول شرق السنہ میں اور حضرت حوا کا نزول جدو میں ہوا۔ جدو یعنی داری یا نانی ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے اس مقام کا نام جدو مشہور ہو گیا۔ صاحب سبحۃ المرجان بڑے پائے کے محدث اور عالم تھے۔ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر تھے۔

بعض علماء
جبرائیلؑ سے
پیتے

حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور کپڑے بننے کا کام بھی آپ ہی سے شروع ہوا۔ دراجم اور اشرفیاں بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائیں۔ دیگر انبیاء عیسیم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام بخاری عینی بڑھتی ہوا کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود اور صالح علیہما السلام تاجور تھے۔ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام مویشی پالتے تھے۔ اور ان کا دودھ اور اون وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیشہ گھربانی تھا۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام روئے زمین کی فطرت سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی گذر اوقات کے لیے لڑکیاں اور زبیلیں بناتے تھے۔

توہم کی قبولیت

اہم بیعتی نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے عرش سرزد ہوئی تو وہ بہت نادم ہوئے۔ انہوں نے عرش پر نگاہ کی۔ تو وہاں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا پایا۔ آپ نے خیال کیا کہ جس شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا

ہوا ہے۔ یہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی۔
 اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا عَفَرْتَ لِي۔ اے اللہ! میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 کے طفیل سے دعا کرتا ہوں کہ میری لغزش کو معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تمہیں
 کیا علم کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ مولا کریم! میں اس سے زیادہ
 کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نام لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
 اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے۔ اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت کو کوئی
 نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ یہ روایات ضعیف ہیں بعض نے ان کو موضوع بھی کہا ہے۔ تاہم تشریح کی
 خاطر ان کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی لغزش کو معاف کر دیا۔
 بیہقی کے علاوہ یہ روایات طبرانی، حاکم اور البرقع میں بھی موجود ہیں۔ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے
 کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں ابوالبشر کی کنیت سے پکارا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن حضور صلی اللہ
 کی طرف نسبت کرتے ہو ابوالمحمد کی کنیت سے پکارا جائے گا۔ گویا آپ کو ابوالبشر اور ابوالمحمد دونوں
 اعزاز حاصل ہیں۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز جب لوگ آدم علیہ السلام
 کے پاس جائیں گے تو کہیں گے کہ اے آدم! انت ابوالبشر آپ تمام نسل انسانی کے جد امجد
 ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام انکار کر دیں گے
 اور کہیں گے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ حضرت ابوذر غفاری کی
 روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ کیا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ
 کے نبی تھے۔ فرمایا ہاں۔ نَبِيًّا رَّسُولًا كَلَّمَهُ اللَّهُ اَبْنِي تَحِيًّا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ
 سے کلام کیا۔ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اَدَمُ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ
 صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تو ہر ایک ایسا عمل ہے۔ جس سے انسان کی سابقہ کوتاہیوں کی معافی ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ

تو ہر ایک ایسا عمل ہے۔

کافران ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ مگر توبہ کی قبولیت کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ اگر ان شرائط کے ساتھ توبہ کی ہے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں۔ توبہ میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی علم حال اور عمل۔

علم سے مراد یہ ہے کہ آدمی جانتا ہے کہ میں نے واقعی یہ غلط کام کیا ہے۔ اور اس کے ارتکاب پر گناہ اور اس کے ضرر کا احساس ہوتا ہے۔ حال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس غلط کام کو ترک کر دے۔ اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے یہ عمل ہے۔ اس ضمن میں مذمت کا ذکر بھی آتا ہے التَّوَّابُ الشَّدِيدُ اور اگر کچھ فرائض روئے ہوں تو ان کو ادا کیا جائے۔ کوئی حقوق تلف ہوئے ہوں۔ تو ان کو پورا کیا جائے۔ تب انسان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے جس میں آدم علیہ السلام سے متعلق مختلف باتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مسجد خیمت میں (جو کہ مٹی میں واقع ہے) حضرت آدمؑ پر جنازہ پڑھی اور چار تجسیریں کیں۔ فرشتوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو لحد میں دفن کیا گیا۔ اور ان کی قبر کو بان دار بنائی گئی۔ جیسا کہ عام طور پر آج کل بنائی جاتی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان کی سرزمین سے چلیں حج پیدل کیے۔

زمین پر اتارنے
کی حکمت

ان آیات میں اِهْبِطُوا یعنی اتر جاؤ کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اتر جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جب اس حکم کی فوری تعمیل نہ ہوئی۔ تو دوبارہ سخت آڑ ڈر ہوا۔ کہ فوراً زمین میں اتر جاؤ۔

یہاں پر یہ ختمہ قابل غور ہے کہ زمین پر اترنے کا حکم کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس

۱۔ ابن ماجہ ص ۲۸۵ فیض القدیر، شرح جامع صغیر ص ۲۸۵

۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۶، ۳۔ درمنثور ص ۵۶ تفسیر عزیزی ص ۱۹۶، ۴۔ ابن کثیر ص ۸۲

میں بھی نسبت خداوندی تھی۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ چنانچہ اس ارادے کی تعمیل یعنی خلافت ارضی کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا۔ آپ نے نیابت کے کام کی ابتداء کی۔ اور پھر یہ فرض آپ کی آنے والی اور دین میں منتقل ہو گیا۔ گویا زمین پر اترنے کا حکم نہ انہیں بدلہ ایک اعزاز تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے حصے میں آیا کہ انہیں نیابت الہی کا فریضہ سونپا گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید حکم یہ دیا کہ فَإِنَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى جِبْئِيلُ بْنُ مَعْقِلٍ سَاسُ الْبَيْتِ آتَىٰ جِبْئِيلُ بْنُ مَعْقِلٍ هُدًى لِّمَنْ يَشَاءُ وَأَمَّا الْأَرْضُ الْمَوْتَىٰ فَأُولَٰئِكَ فِيهَا عَمَزَجٌ لِّمَنْ يَخِفُّ عَلَيْهَا لِحْظٌ أَوْ يَخْتَفِفُ عَلَيْهِمْ لَظْمُ يَوْمٍ دُجُومٍ۔

خوفِ محشر
کی حقیقت

یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن تو بہت زیادہ خوف ہوگا۔ عام انسانوں کا تو کیا حال ہوگا۔ خود نبیوں کے متعلق آتا ہے کہ رَدُّ فَنَفْسِي فَنَفْسِي پائیں گے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ظاہری طور پر تو یہ واقعی خوف ہوگا۔ مگر انجام کے اعتبار سے بالکل خوف نہیں ہوگا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی قہری صفات کا لہو ہوگا۔ تو خوف و ہراس طاری ہوگا۔ جیسے کسی مقدمہ میں ملزم بڑا گھبراتا ہے۔ مگر وکیل مدافع کی مثل دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تسلی رکھو۔ آخر کار انجام بخیر ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمد و ہدایت کی پیروی کریں گے۔ انہیں اگرچہ قیامت کے دن وقتی طور پر خوف پیدا ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آخر کار انہیں خوف نہیں ہوگا۔ ہدایت اصل میں دین کی روح اور حکمت کو کہا جاتا ہے۔ اور دین حق دائمی قانون کا نام ہے جو انانیت کے اصلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی ہدایت کے مفصلات میں نبی، رسول، جنات، معجزات، کتب کا دیہ اور شریعت وغیرہ آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اتباع ہی ہدایت

ہدایت کے
متبعین

ہا اتباع ہے۔ قرآن پاک میں بینات کا لفظ لاتعداد مقامات پر آیا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ بھی آیا ہے۔ ہدایت وہ ہوتے ہیں جو بالکل واضح اور ہدایت ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت کو ماننا۔ بینات میں سے ہے۔ اسی طرح صبر و شکر کرنا اور اللہ تعالیٰ کو ذکر کرنا بینات میں۔ ہدایت وہ چیز ہوتی ہے جس کی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً شعار اللہ تعالیٰ العظیم احکام شرع میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ چیزیں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کتابیں انبیاء علیہم السلام وغیرہ ہدایت میں شامل ہیں۔ اسی لیے فرمایا جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ نہ ان پر عذاب ہوگا۔ اور نہ وہ عذبین ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا اور جنہوں نے کفر کیا۔ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اور ہماری آیات کو جھٹلایا۔ الْبَلَدُ اصْعَبُ الشَّارِ وہ دوزخ والے ہیں هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ میں کے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسان کی سعادت اور شقاوت کا دار و مدار ایمان اور کفر پر ہے۔ یہ ہدایت و نہایت پر ہے۔ اور پھر یہ بت کہ اِنَّمَا رُزُومَالُ بِالْاَعْمَالِ تسمیہ اعمال کا دار و مدار غلتے پر ہے۔ جس کا ایمان پر خاتمہ ہو گیا یعنی جو ایمان کی دولت ساتھ لے گیا۔ وہ نجات ہے۔ اور جس کا خاتمہ کفر پر ہوا۔ وہ کافر ہو گیا۔ اب تو ان یہ بت۔ اے یہ دفعہ جنت سے نکلنے کے بعد اب دوبارہ داخلہ ایمان اور نیکی کی بناء پر ہوگا۔ اس کے اخیر جنت میں دوبارہ داخلے کی کوئی صورت نہیں۔

نم

درس نوزدهم ۱۹

النقد

(آیت ۴۰ تا ۴۴)

يٰبَنِي إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوا
بِعَهْدِيْ اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَايَ فَاَرْهَبُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَا
اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرٍ بِهٖ
وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّرَآيَا فَاَلْتَقُوْنَ ﴿٣١﴾ وَلَا
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾

قر مجہد : اے بنی اسرائیل یاد کرو میری ان نعمتوں کو — — جو میں نے

تم پر انعام کیس۔ اور پورا کرو میرے عہد کو۔ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو۔ اور

اور خاص مجبہ ہی سے ڈرو ﴿۴۰﴾ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو میں نے نازل کیا ہے

اور وہ ان (اصل غیر محرف شدہ) کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جو تمہائے پاس

ہیں۔ اور نہ ہو تم پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ۔ اور مت خریہ میری آیاتوں

کے بدلے تھوڑی قیمت اور خاص مجبہ سی سے پس ڈرتے رہو ﴿۴۶﴾ اور نہ ملاؤ

حق کو باطل کے ساتھ۔ اور تم حق کو چھپاتے ہو۔ اور تم جانتے ہو ﴿۴۲﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا اللَّهَ كُلٌّ مِنْكُمْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّهِ ۚ وَإِنَّ الْأَوَّلِينَ

قاری محمد بن اسماعیل

مہتا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کا ذکر تھا۔ اس کے بعد

وَإِذَا قَالَ رَبِّكَ لِلْمَلِكَةِ: مِثْلُ نِعْمَتِكَ كَإِذْ هِيَ، جَوَّضْتَ أَرْوَاحَ

علیہ السلام کے ذریعے تمام انسانوں کو حاصل ہوئی۔ اب یہاں سے بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب

ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ اور ان معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان میں

ظاہر ہوئے۔ یہی اسرائیل کے باطل حیل و تدبیرات کا ازالہ بھی کیا ہے۔ اور اس قوم میں جو غریب

پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا لقب بل سے ذکر کیا ہے۔ یہ بیان یہاں سے شروع ہو کر واذا ابتلیٰ

اِبرہم رِبِّہٖ یُکَلِّمُہٗ اَکْثَرَ مِیْلَیْنِ مَآءِ۔

خلافتِ ارضی عمومی نعمت ہے۔ جو آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کو نصیب ہوئی۔ یہ خلافت
بنی اسرائیل میں غسے تک قائم رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت چھین لی اور بنی اسرائیل
کو حاصل ہو گئی۔ یہاں پر بنی اسرائیل کی ان غالیوں کا ذکر ہو گا۔ جن کی وجہ سے اس عزت و شرافت اور
فضیلت وہ محروم ہو گئے۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ ان دونوں خاندانوں یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل
کے بعد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جن کا وطن مالوت موجودہ بغداد سے ستر میل دور بابل
شہر تھا۔ آپ کی پیدائش کے وقت بابل بہت بڑا شہر اور تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ چالیس مربع
میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں سے ہجرت کی جیسا کہ فرمایا: *يَا زَانِي هَاهَا كَجَزْءٍ إِلَى رَبِّكَ*، وہ مصر کے
رستے شام پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ اور پھر حجاز گئے اور مکہ مکرمہ بھی گئے۔ آپ، اسلام
عزائی تھے۔ پھر شامی پھر حجازی ہوئے۔ ان دنوں میں فلسطین کو کنعان کہتے تھے۔ اور یہ شام ہی کے
ماتحت تھا۔ بعد میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے۔ آپ کے
بارہ فرزند تھے۔ پھر ان کے آگے بے شمار قبیلے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی
آپ کی چچا زاد حضرت سارہ بنہ تھیں۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ آپ کے بطن سے
حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور پھر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے
عظیم نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی بشارت سنادی
تھی: *وَمَنْ وَدَّاهُ اسْحَقَ يَعْقُوبَ* یعنی مٹائے فرزند اسحاق علیہ السلام سے ان کے بیٹے
یعقوب علیہ السلام ہوں گے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے: *اِسْتَشْنٰی*
عَشْرَةَ اسْبَاطًا اُمَمًا سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تیسری بیوی قنطورا بھی تھی جس کی اولاد بنی قنطورا کہلاتی ہے

مگر انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے نہ ہوتی۔

واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کے دو بیٹے یعنی عیص اور یعقوب جبرائیل نے
 تھے۔ البتہ عیص ذرا پہلے پیدا ہوئے اور یعقوب علیہ السلام بعد میں۔ یعقوب کا لفظی معنی پیچھے آنے
 والے کے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اسحق علیہ السلام کو عیص کے ساتھ زیادہ محبت تھی۔ اور ان کی بیوی کو
 یعقوب علیہ السلام زیادہ پیارے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام زیادہ صحت مند اور مضبوط جسم کے
 مالک تھے اور حضرت اسحق علیہ السلام نے انہیں یہ فریضہ سونپ رکھا تھا کہ وہ دروازے پر
 موجود رہیں۔ جب تک میں عبادت میں مصروف رہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں
 تاکہ عبادت میں فصل واقع نہ ہو۔ ایک موقع پر انسانی شکل میں فرشتہ آیا اور اندر جانا چاہا مگر
 یعقوب علیہ السلام نے روکا۔ جب اسحاق علیہ السلام باہر آئے تو دیکھ کر یعقوب علیہ السلام فرشتے
 کے ساتھ الجھ رہے ہیں۔ تو انہوں نے تحسین فرمائی کہ واقعی تم نے اپنی ڈیوٹی پوری پوری داک
 ہے۔ فرشتے نے آپ کا نام دریافت کیا تو انہیں یعقوب بتایا گیا۔ اس نے کہا اس کا نام اسرائیل
 ہے۔ سریانی یا عبرانی زبان میں اسرائیل کا معنی بندہ اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ گویا فرشتے نے
 یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ رکھا۔ جو کہ عبد اللہ کے مترادف ہے
 یہی آپ کا نام اسرائیل مشہور ہوا۔ اور آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ چونکہ حضرت
 اسحق علیہ السلام کی محبت عیص کے ساتھ زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے عیص سے فرمایا۔
 کہ میں آخری وقت میں تیرے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ جب ماں کو پتا چلا تو اس نے چاہا
 کہ یہ دعا یعقوب علیہ السلام کے حق میں ہو۔ چنانچہ اس نے یعقوب علیہ السلام کو عیص کا پاس
 پنا کر ان کے باپ کے پاس بھیج دیا۔ اور ساتھ نصیحت کی کہ باپ کے سامنے آہستہ بولن
 تاکہ وہ تمہیں پہچان نہ سکیں۔ چونکہ اس وقت حسد اسحق علیہ السلام کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔
 وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عیص سمجھے اور ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری
 اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ یہ خصوصی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام

سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ تعالیٰ نے چار بہار نبی اور رسول اس خاندان میں مبعوث فرمائے۔
 کچھ عرصہ بعد عیسیٰ نے باب کو یاد دلایا کہ آپ نے میرے حق میں دعا کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ دعا تو میں نے کر دی ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ وہ دعا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کے
 کے حق میں فرمائی ہے۔ تو انہوں نے کہا۔ اجماعاً وہ تو اس کے لیے ہو گئی۔ مگر اس لیے دعا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ قبائے خاندان میں بادشاہت قائم رکھے۔ چنانچہ آپ کی دعا سے بادشاہت کا
 زیادہ تر سلسلہ عیسیٰ کی اولاد میں ہی رہا۔

جب حضرت اسحاق علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو ان کے سارے مال و باب
 پر عیسیٰ نے قبضہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو کچھ نہ ملا۔ اسی مال و دولت کی وجہ سے لوگوں کا
 جوع بھی عیسیٰ کی طرف ہو گیا۔ اور یعقوب علیہ السلام نادار ہونے کی وجہ سے کسی شمار میں نہ آتے
 تھے۔ ان کے ماموں کسی دوسری تہذیب سے تھے۔ اور بڑے مالدار تھے۔ مال نے مشورہ دیا۔ کہ
 ان کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ اور اس کی بیٹی بھی ہے جس کے
 ساتھ وہ تمہارا نکاح بھی کر دے گا۔ چنانچہ آپ اپنے لایان نامی ماموں کے پاس پہنچے۔ وہ
 آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہو۔ اور کہا کہ اپنے جانی کی بہنوں سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ میں تمہاری
 ہر طرح سے مدد کروں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے سارے مال و باب کا مقدمہ حضرت یعقوب علیہ السلام
 کو بنا دیا۔ اور اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

اس بیوی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیار بیٹے عطا کئے۔ اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو
 گیا۔ ماموں نے آپ پر مزید احسان کیا۔ کہ دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا۔ اس سے دو فرزند پیدا ہوئے
 اور وہ بیسی فرسے ہو گئے۔ اس کے بعد ماموں نے تیسری لڑکی آپ کے نکاح میں شے دی۔ اس
 سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئی۔ پھر
 ماموں نے اپنی چوتھی لڑکی انیس کا نکاح کر دیا۔ اس وقت تک حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر
 چالیس برس ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ اور حکم دیا کہ اس مقدمہ کو چھوڑ

کہ کنعان چلے جاؤ۔ اور وہاں پر تبلیغ کا فریضہ انجام دو۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے کہا کہ تمہاری جدائی سے تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے بھوشی حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ اور اُن کی خدمت کے طور پر پانچ سو گھوڑے، پانچ سو اونٹ، پانچ سو گائے پانچ سو بچر، پانچ سو بھیڑیں اور بہت سا دیگر سامان ہمراہ کر دیا۔

کنعان پہنچ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ وہاں پر آپ کی چوتھی بیوی راحیل کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے۔ یوسف علیہ السلام ابھی دو سال کے تھے۔ کہ راحیل بھی فوت ہو گئی۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے اپنی پانچویں بیٹی بھی نکاح میں دے دی۔ اور اسے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بھیج دیا۔ تاکہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے ہوئے۔ جن سے آگے بارہ خاندان نمودار ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے عیص کو بھی اس فضیلت سے محروم نہ رکھا۔ جیسا حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان کی طرف آئے تھے۔ تو راستہ میں عیص نے بھی آپ کا استقبال کیا۔ اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ذریعے مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے خاندان میں بھی نبوت جاری فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ تو وحی نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ عیص کے خاندان میں ایک بنی الوب علیہ السلام کو پیدا فرمائے گا۔ اور ایک عظیم المرتبت بادشاہ ذوالقرنین بھی آپ کے ہی خاندان میں ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔

ان آیات میں اُن انعامات کا تذکرہ ہے جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر کیے۔ يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِیْل اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ لَے بنی اسرائیل! میرے ان انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے۔ ان میں سے دو بنیادی انعام تھے۔ یعنی اس قوم میں انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے اور بادشاہت بھی عطا کی۔ سورۃ مائدہ

بنی اسرائیل پر
انعامات

میں موجود ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاً وَجَعَلَكُمْ مَّلُوْكَاً اللہ تعالیٰ نے
 کتنا عظیم احسان اس قوم پر کیا۔ اُس وقت اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہیں
 تھی۔ ان کو عزت اور شہرت حاصل تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگا جتنی
 کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے تک ان کی ذلت انتہاء کو پہنچ گئی۔ انجیل اور تورات میں ان کی کتابوں
 سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں سال گزرنے
 کے بعد جب نزول قرآن کا زمانہ آیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالیٰ
 کا آخری پیغام اور شریعت نازل ہوئے۔ اس وقت بھی بے شمار خرابیوں کے باوجود یہی لوگ
 صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس مقام پر بنی اسرائیل کو ہی دعوتِ فخر
 دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جنہیں تم اپنی غرابی کی وجہ سے کھو چکے ہو۔ لہذا اب
 یہی راہِ راست پر آ جاؤ۔ بنی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ اور خدا تعالیٰ کے آخری پیغام کو
 تسلیم کر لو۔ تو تمہاری جہنمی ہوئی غلت واپس آ سکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کر دگے۔ اپنی بٹھمنی
 پر قائم رہو گے۔ تو تمہارے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگلے رکوع
 میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انعامات کا تذکرہ کر دیا ہے بعد فرمایا وَ اَوْفُواْ بِعَهْدِيْ اَے
 بنی اسرائیل میرے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ عہد تو لیا تھا۔ کہ میری اطاعت
 کرنا۔ انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنا۔ اور فرمانِ حق کو پورا کرنا۔ فرمایا اس کے بعد میں اَوْفُواْ
 بِعَهْدِيْكُمْ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تمہارا عہد یہ ہے۔ کہ تمہارے کناہ معاف کر کے
 تمہیں بخش دوں گا۔ اور جنت تک پہنچا دوں گا۔ تمام بنی فرع انسان نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے
 کیا ہوا ہے۔ آگے اُس کے مطالبے یعنی میثاق کا ذکر بھی آئے گا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ
 میثاق بھی پورا کرو۔ الَّذِيْ وَاَقَمَكُمْ بِهٖ عٰوَمَ لَمْ يَخْشَ عَمَ كَيْ هُوَ اَبَی۔ اللہ تعالیٰ نے
 بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ صحیح دین اور سچی بات کو مست چھپانا۔ مکرانوں نے کیا کیا۔ فَتَبَدُّوْا
 وَرَاَوْ ظُهُوْرِهِمْ اِس عَمَ کو پس پشت ڈال دیا۔ نزول قرآن کے وقت تک بنی اسرائیل
 میں تباہی اور کتمانِ حق کی بیماری اپنے عروج پر تھی۔ یہ لوگ توراہ، انجیل اور دیگر کتب میں موجود

آخری نبی علیہ السلام کے متعلق پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اور اس حد میں مبتلا تھے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل کی بجائے بنی امیہ میں کیوں آیا ہے۔ یہ لوگ صاحب علم ہونے کے باوجود مقصوب تھے۔ مشرکین نے تو ایمان قبول کر لیا مگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ **مِیَاکَ وَلَکِزْ کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فِیْ قُلُوْبٍ**۔ یعنی ان کی اکثریت، منافرانوں کی ہے۔ جب کہ نہایت ہی قلیل تعداد راہِ راست پر آئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضرت عبداللہ بن سلام جیسے چند حق پرستوں نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ الغرض فرمایا تم میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ **وَإِنَّا یَٰ فَارِھُبُوْنِ** اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ میں ہی تمہارا خالق اور مالک ہوں۔ میں نے تم پر پست بھی انعام کیے۔ آئندہ بھی کروں گا۔ بشرطیکہ تم مجھ سے ڈر کر یہ عہدے رستے پر آ جاؤ۔

ایمان بالقرآن

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ **وَأَمِنُوا بِمَا آتٰکُمْ** اور جو چیزیں میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیزیں **مُصَدِّقَاتِ لِّمَا مَعَكُمْ** اس چیز کی تصدیق کرتی ہیں۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ یعنی تورات اور دیگر سابقہ کتب میں یہ خبریں دی گئی ہیں۔ کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے۔ مگر اس کی شریعت اور احکام کی من و عن تصدیق نہیں کرتا۔ کیونکہ سابقہ دوسری پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم اس قرآن پاک کو کثیثت کلام الہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ **وَلَا تَكُوْنُوْا دُوْنَ کَافِرٍ مُّبِیْنٍ** اور نہ مومن قرآن پاک کے اولین منکرین بن جاؤ۔

قرآن پاک کا نزول مکہ مکرمہ میں شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے انکار کرنے والے تکفار مہم تھے۔ پھر جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں جو دہنے اس کا انکار کیا۔ اس لحاظ سے قرآن پاک کے اولین منکرین کفار مکہ میں رہ کر یہود مدینہ۔ مگر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے کہ تم اولین منکرین بن جاؤ۔ مفسرین کرام اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں

مٹنے والوں کے پاس تو کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتاب یعنی تورات تو مدینے کے یودس کے پاس تھی۔ لہذا اہل کتاب میں سے اولین کافرین یہی لوگ تھے۔ اسی لیے ان کو کہا گیا کہ تم اولین مسخرین میں سے نہ ہو جانا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسرائیلی بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے کما گیا کہ اگر تم موجودہ نسل والے نہ ہو کر دوسرے آئے تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہاری روش پر عمل کرنا شروع کر دیں گی۔ اس میں یہ بھی آئے والی نسلوں کی گمراہی کے ذمہ دار بھی تم ہی تھے۔ اس لیے اولین مسخرین نہ بن جاؤ۔

پھر فرمایا وَلَا تَكُونُوا بَالِيسِيْنَ نَمَتًا قَلِيلَةً اور مت خرید و میری آیتوں کے بدلے تمہاری قیمت۔ تمہاری قیمت سے مراد دنیا کا حق مال ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا پینا اور نکاح کرنا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا، بنیم کنگی اور پینے کا انجام بول ہے۔ اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد بھٹ جاتا ہے۔ اور اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رہا نکاح۔ تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان حشرِ اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔

فرمایا وَ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آخرت کی خبر لو۔ دنیا کے پیچھے مت پڑو۔ آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب و کتاب ہو گا۔ اور پھر تمہیں اپنے کئے کی جزا یا سزا بھگتنی ہو گی۔ لہذا مجھ سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تَكْفُرُوا بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ بِالْبَاطِلِ اور حق کو باطل کے ساتھ غلط طعنہ نہ کرو۔ وَ تَكْفُرُوا بِالْحَقِّ اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔ آگے آئے گا کہ یہ لوگ قرآن پاک اور بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہنچاتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہنچاتے تھے مگر پھر بھی انکار کر دیتے تھے۔ یہ

یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں ٹٹے ہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریضیں چھپی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل آزمایا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور جس کتاب کے ساتھ سلوک ہوا ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہوگا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہوا، اسی طرح آپ کی امت میں بھی پیدا ہوگا۔ آج کے دور میں دیکھ لیں کہ بہ قماش قسم کے علماء محض دنیوی مفاد کی خاطر کس طرح غلط فتوے جاری کرتے ہیں۔ یہ چیز کتمان حق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ امراء اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں۔ مقصد ہوتا ہے کہ عالم وقت راضی ہو جائے۔ تو اپنی عیش ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم بادشاہ اور فاسق امراء آخرت سے بے خوف ہو کر کھنڈرِ طغی پر ظلم و جور کے پیار توڑتے ہیں۔ یہ لوگ علماء کو کے فتوے کی آڑ لے کر اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی حال وزیروں اور دیگر دفتری اہلکاروں کا ہے۔ قانون کی آڑ میں غلام کے حق غصب کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: **وَكَيْدٌ لِّمَنْ لَا يَنْفَكُ وَحِدَقٌ مِّنَ الْوَيْلِ** جو کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے ایک بار ہلاکت ہے مگر وکیل لِمَنْ يَنْفَكُ وَلَا يَفْعَلُ سَبْعَ مِّنَ الْوَيْلِ جو جاننے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس پر سات بار ہلاکت ہے۔ مقصد یہ کہ کتمان حق کرنے والے دنیا پرست لوگ حق بات کو جاننے کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ اور حق پر عمل نہیں کرتے۔ لہذا یہ سات گنا سزا کے مستحق ہیں۔

پیردوں، گمراہی نشینوں اور علمائے سوراہا حال دیکھ لیں۔ انہیں ذرا نفس کا کوئی خیال نہیں کہ پورے ہوسے ہیں یا نہیں۔ مگر مستحبات اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سینے سے لگائے

بیٹھے ہیں۔ جنہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ ملک پہ وہ فر کی حکومت، برداشت کر لیں گے
جیسا کہ پیروں اور علماء سورسے انگریز کی حمایت کی۔ مگر یہ اپنے خود ساختہ عقیدے کے خلاف
کوئی چیز برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ کمان حق کے مرتجب
ہو رہے ہیں۔

آج کل دین کے ساتھ کیا سوچ ہو رہا ہے۔ نہ کسی کو فرائض کی پروا ہے۔ اور نہ واجبات
کی معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تسمیر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی
کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر کالی گلوچ تک نسبت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ بنی اسرائیل
کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو بیماریاں بنی اسرائیل میں پائی باقی
تھیں۔ اے میری امت۔ تم میں بھی وہی بیماریاں نمود کر آئیں گی حَذُّوَالنَّعِلَ بِالنَّعْلِ
جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل
کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔

فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اور تم جانتے
ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے۔ اگلے
رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ
دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا
جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ
دعوت الی القرآن ہے کہ ”إِهْنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ“ جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے
یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی
تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخری نوشتہ اور صحیفہ ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے
پیش کردہ پروگرام پر عمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

وَأَقِمْو الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَبُوا مَعَ الرَّاكِبِينَ ﴿۲۳﴾
 اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ
 لَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۵﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ
 وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۲۶﴾
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ وَإِنَّهُمْ إِلَيْهِ
 رَاجِعُونَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ۲۳۔ اور قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے
 ساتھ (۲۳) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو
 حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے (۲۴) اور مدد طلب کرو صبر اور نماز
 کے ساتھ۔ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے۔ مگر ان لوگوں پر جو عاجزی
 کرنے والے ہیں (۲۵) وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار
 سے ملنے والے ہیں۔ اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے
 والے ہیں (۲۶)

گزشتہ صفحہ پر
 اس رکوع کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر فرمایا۔
 پھر زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ اور ہدایت و رہنمائی کا وہ اصول ہی بتلادیا۔ جس پر جنت میں دوبارہ
 داخلے کا دار مدار ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب ہوا۔ دوسری قوموں کے مقابلے
 میں بنی اسرائیل کو ہمت و رازتہم فضیلت حاصل رہی۔ نبوت اور حکومت ان میں رہی۔ ان
 میں بڑے بڑے عابد و زاہد لوگ پیدا ہوئے۔ مگر ایک طویل عرصہ کے بعد اس قوم میں ضلالت
 پیدا ہو گئی۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں
 منتقل کر دی۔

گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن پر کیے گئے انعامات یاد دلانے گئے اور انہیں قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اور انہیں نصیحت کی گئی کہ وہ بنی اسرائیل میں اولین کافر نہ بنیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آئندہ نسلیں بھی انہی کے قدموں پر چلیں گی۔ اور اس طرح اُن کا وبال بھی کفر میں پل کرنے والوں پر پڑے گا۔ انہیں حق و باطل کی تبلیغ سے اور کتمان حق سے منع کیا گیا اور ترغیب دی گئی کہ تمہاری اپنی کتابوں میں قرآن پاک اور عام البیتین کے متعلق جو پیشین گوئیاں موجود ہیں انہیں ظاہر کریں۔

مدینہ طیبہ کے اطراف میں بسنے والے اہل کتاب یعنی یہود نسی بدتری کے زعم میں مبتلا تھے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری اقوام کو کم تر سمجھتے تھے، عربوں کو وہ جاہل، اُن پر ہمدردی اور اُمّی خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے اشارات گئے اسی سورۃ میں، سورۃ ال عمران میں اور دیگر سورتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دوسرا باطل زعم یہ تھا کہ نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہی کے خاندان میں جاری رہے گی۔ مگر جب بنی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں آگئے تو ان کی ساری برتری ختم ہو گئی اور وہ حسد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان کے قبول حق سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں جوہل اور منصفی برتری حاصل تھی۔ ایمان لانے سے وہ ضائع ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور انہیں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ایسی ہی چیزیں اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: کہ یہود کو ثبت مال و ثروت بہت تھی اور انہیں بیماریاں لاحق تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دُریاویوں میں مبتلا ہو کر غیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ثبت مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَرَشَدًا لِّلْغَيْبِ تُكْدِرُ**۔ مال کی محبت انسان

میں فطرۃ بڑی شدید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبَّاجَتُمْ تَمَّ جَبْرُكُمْ
سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع
ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔

ان بیماریوں
کا علاج

ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز کیا: وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا دِينَ
وَآتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی حب جاہ کی بیماری کے لیے نماز شافی ہے۔ کیونکہ اس
میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب
سمجھے گا۔ وہ حب جاہ کی بیماری سے شفا یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حب مال کی بیماری کا
علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً ان کے نخل دُور کرنا بھی ہے۔ چنانچہ
جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ نخل کی لعنت پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے
کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا
مِمَّا تَحِبُّونَ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو
یہی وہ جذبہ ہے۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے نخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ
حب جاہ اور حب مال کی بیماری کا علاج ہے۔

نماز جامع
عبادت ہے

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ
میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادات کی جامع ہے۔
نماز میں روحانی، نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادات جمع ہیں مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے۔ اور
طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے
اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر لپٹنی تو ہر حالت میں لازم ہے۔ مگر نماز
کے دوران تو اور زیادہ مہم ہے۔ انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت
کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے تو گرا نماز میں الفاظ جیسی عبادت بھی شامل
ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رُخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان
معلق ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں عکوف بھی شامل ہے

نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور
 اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز میں شیطان
 کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔
 اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان تہمتیں
 کا تکلم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جس کی انسان گواہی دیتا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے
 سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض اہم بیضاوی فرماتے ہیں۔
 کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔
 نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ اور
 رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ مل کر نماز ادا
 کرو۔ اسی لیے تو نماز باجماعت جمائے مذہب میں تقریباً وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حضور علیہ السلام
 کی ایسی سنت مؤکدہ ہے۔ کہ اگر بلا عذر ترک کرے تو انسان منافقوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔
 حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں ہے کہ اگر تم بلا عذر نماز سے تخلف کرو گے تو پیغمبر علیہ السلام
 کی سنت کو چھوٹنے والے بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو نَضَلْتُمْ گمراہ ہو جاؤ گے۔ صرف
 معذور افراد کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ وگرنہ تندرست آدمی کو بغیر جماعت کے نماز
 پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جماعت میں شریک ہوتے تھے
 اور جماعت سے پیچھے وہی رہتا تھا۔ جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ معذور رہتا تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ صرف سجدہ ہی ہوتا
 تھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ رکوع بھی کرو۔ اگرچہ یہ سجدہ سے کم درجے کا رکوع ہے۔ مگر بڑی اہمیت
 کا حامل ہے۔ جس نماز میں رکوع نہ ہو، وہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے
 ہیں کہ بیشک رکوع نماز کا ایک اہم رکن ہے۔ مگر مَعَ الرَّاكِعِينَ سے صاف واضح ہے

۱۔ مسلم ص ۲۲۲ ۲۔ مسلم ص ۲۲۲ ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۳ ۴۔ معالم التنزیل ص ۲۱۳

۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۳ ۶۔ تفسیر ابن کثیر ص ۸۵

اس سے مراد ناز و جماعت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اسی سے اجتماعیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سبست ہی بیماریوں کا علاج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو الغامات یا دوائے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کھڑی پیغام پر ایمان لانے کی تلقین کی۔ پھر ان کی خامیاں ظہر کر کے انہیں تلبیس اور کتمان حق سے منع فرمایا۔ ان بیماریوں کا علاج ناز اور زکوٰۃ بتلایا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی سبب بڑی کھڑی کی طرف توجہ دلائی۔ اور فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کَمَا تَمْلُکُوْنَ کُفْرًا وَلَا تَتْلُوْهُ سُبْحًا وَلَا شَیْئًا وَلَا تَنْسَوْنَ کُفْرًا اور اپنی جانوں کو فراموش کر دیتے ہو۔ وَاَنْتُمْ سَتَمْلُکُوْنَ الْکِتٰبَ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ مقصد یہ کہ جس نبی کی طرف تم دوسروں کو دعوت دیتے ہو۔ خود جانتے بوجھتے بھی اس پر عمل نہیں کرتے ظاہر ہے۔ کہ یہودی تورات کے عالم تھے اور وہ لوگوں کو تورات کے حقائق سے روشناس کراتے تھے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے آخری کلام قرآن پاک اور آخری نبی محمد رسول اللہ کے متعلق پیش گوئیاں بھی موجود تھیں۔ جو انسانوں نے لوگوں کو بتائی تھیں۔ مگر جب یہ حقائق سامنے آ گئے تو دوسروں کو غلط کرنے والے یہودی علماء خود ان حقائق سے منحرف ہو گئے۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہودی عالم اپنے مسلمان رشتہ داروں کو کما کرتے تھے۔ کہ تم جس شخص پر ایمان لائے ہو۔ وہ بلاشبہ سچا اور آخری نبی ہے۔ اس کا دامن نہ چھوڑنا۔ مگر خود اس پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ ایمان لانے سے ان کے مالی فوائد ضائع ہوتے تھے۔ ان کے اسی دیر کے متعلق فرمایا کہ دوسروں کو تلقین کرنے میں اور خود کو فراموش کرتے ہیں۔ بعض دنیوی شاہی کے بے جہنم کے کدہ نازش بھٹتے ہیں۔ آگے سورۃ ال عمران میں ذکر آئے گا۔ کہ نصاریٰ ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا تھا۔ حضرت دنیا کے مال کی خاطر لیان سے محروم رہا سیرت کی۔ اور دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ اس وفد کے لوگوں نے کہا۔ کہ اگر ہم ایمان قبول کر لیں۔ تو تمہارے وطن میں اور تمہاری بند ہو جائیں گی۔ لہذا ہم ایمان لانے کے

یہ تیار نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم دوسروں کو تویشی کی طرف دعوت دیتے ہو۔ مگر خود اس سے بچتے ہو یہ کہاں کا انصاف اور عقلمندی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ معراج کی رات میرا گھر ایسے لوگوں پر ہوا۔ جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کاٹے ہوئے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بتایا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو امر بالمعروف یعنی نیکی کا حکم کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے۔ اہم روایت میں بھی ایک روایت بیان کی ہے۔ کہ جہنم میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی بدلہ سے جہنم والے بھی بیزار ہوں گے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ حضور! ایسا بہ بخت شخص کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ صاحب علم شخص جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے۔ کہ جو شخص دوسروں کو نیکی سکھاتا ہے۔ اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چراغ جو دوسروں کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ مگر خود جلتا رہتا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا۔ اور اسے اس حالت میں جہنم رسید کیا جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں پیٹ سے نکل کر نیچے کی طرف ٹھک رہی ہوں گی۔ وہ شخص آنتوں کو اس طرح کھینچے گا۔ جیسا کہ حاکم اس کو کھینچتا ہے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ اے فلاں! تجھے یہ مصیبت کس طرح پہنچی۔ حالانکہ تو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا۔ اور برائیوں سے منع کرتا تھا۔ وہ کہے گا۔ ہاں میں تم کو نیکی کا حکم کرتا تھا۔ مگر خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا۔ مگر خود باز نہیں آتا تھا۔ اس لیے آج مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

تو فرمایا اے بنی اسرائیل! تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو۔ بڑے مسئلے بیان کرتے ہو۔ قرآن پاک کی حقانیت کا اقرار کرتے ہو۔ بنی آخر الزمان کے اوصاف حمیدہ بھی بتاتے

۱۔ تفسیر کبیرہ ۴۷، ۲۔ بن کثیر ۱۱۱، ۳۔ تفسیر کبیرہ ۴۷، ۴۔ بن کثیر ۱۱۱

۵۔ مسلم ۱۱۱، ۶۔ بخاری ص ۱۱۱، ۷۔ تفسیر غازی ۵۵، ۸۔ مشورہ ۱۱۱

ہو۔ مگر خود ایمان نہیں لاتے۔ اپنے آپ کو فراموش کیے بیٹھے ہو اَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم میں عقل و شعور کا مادہ نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

صبر و صلوٰۃ کی
برکات

فرمایا وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ صبر و صلوٰۃ کو اختیار کرو گے۔ تو برائیاں دور ہو جائیں گی۔ حُبِّ مالِ مجاہد کا علاج بھی تم صبر کے ذریعے کر سکتے ہو۔ نماز پڑھو گے تو عجز و انکاری پیدا ہوگی اور اس میں مختلف بیماریوں کی شفا ہے۔ پھر فرمایا وَارْتَقُوا الْكِبْرِيَا اور یہ نماز بے شک بڑی بھل اور بھاری ہے۔ اِنَّكَ عَلَى الْخَشِيِّ مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے یہی نماز رحمت کا سامان بنتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اِذَا حَزَبَهُ اَمْرٌ فَنَزَعَ اِلَى الصَّلَاةِ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی۔ تو نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ کیونکہ نماز سے تعلق باللہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ بقدر مضبوط ہوگا۔ اسی قدر مشکلات کم ہو جائیں گی۔ انسان کو مصائب کا احساس اسی وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق باللہ کمزور ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ نماز کئی ظاہری بیماریوں کی شفا کا سبب بھی بنتی ہے۔ اہم ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک دفعہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شدت درد کی وجہ سے آپ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا آپ پر گزر ہوا۔ تو فارسی لہجہ میں فرمایا اَشْكَمُ درد کیا تھا پیٹ میں درد ہو رہا ہے شکم فارسی میں پیٹ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا فَعَسَا کہ حضور ایا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ قَدْ فَصَلْ فَإِنَّ الصَّلَاةَ شِفَاءٌ اَمْطُوا اور نماز پڑھو کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی۔ تو پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا کر دی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔

تو فرمایا یہ نماز بوجہل ہے۔ مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔ اور وہ کون لوگ ہیں الَّذِينَ

رجعوا الى الله

يُظَنُّونَ جَوَاقِينِ کرتے ہیں اَنَّهُمْ قُلُوبًا رَاقِبِينَ کہ وہ اپنے پروردگار کے ملاقات کرنے والے ہیں لفظ ظن اصناد معانی میں استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ اس کا معنی گمان بھی ہوتا ہے۔ اور یقین بھی۔ مگر یہاں یہ ظن کا معنی یقین ہے۔ عربی زبان میں بعض دوسرے کئی الفاظ بھی متضاد معانی رکھتے ہیں۔ جیسے خون کا معنی سیاہ بھی اور سفید بھی۔ اسی طرح حمیم کا معنی گرم اور سرد دونوں طرح ہوتا ہے۔

فرمایا یہ نماز ان لوگوں پر جو جہل نہیں ہے جنہیں یقین ہے کہ انہیں ایک دن اللہ تعالیٰ کی بدگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ وہاں اعمال کی باز پرس ہوگی۔ اور نماز جیسی نعمت کی قدر وہاں جا کر معلوم ہوگی۔ اور انہیں یہ بھی یقین ہے اَنَّهُمْ اَنْبِيَاءُ رَاجِعُونَ کہ انہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ اَلْاُمُورُ "تمام چیزوں کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔" وَاَنَّ اِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی اور ہر چیز کی انتہا بھی وہیں ہوگی۔ چونکہ عاجزی کرنے والوں کا ان باتوں پر یقین ہے۔ اس لیے وہ نہایت خوشی اور ذوق و شوق کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ان پر یہ بھاری نہیں ہوتی۔

الہ

البقرة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آیت ۴۰، ۴۱

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرْ وَاِنْعِمْتِىْ اَلَّتِىْ اَنْعَمْتُ عَلٰىكُمْ
وَ اَلِىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۰ وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزٰى
نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَ لَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝۴۱ وَ اذْكُرْ اَنَّا جَعَلْنَاكُمْ
اٰلَ فِرْعَوْنَ يَكُوْمُونَ نِسَاءَكُمْ سُوًى الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ اَبْنَاءَكُمْ
وَ يُسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَ فِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۝۴۲ وَ اذْكُرْ اَنَّا فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَاَجْمَعْنَاكُمْ
وَ اَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝۴۳

ترجمہ : اے اسرائیل کی اولاد! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر

انعام کی اور یہ کہ میں نے تم کو فضیلت بخشی جہاں والوں کے مقابلے میں ۴۰

اور ڈرو اس دن سے کہ نہیں بچائے گا کوئی نفس دوسرے نفس سے کچھ بھی، اور

نہ قبروں کی جائے گی اس سے سفارش اور نہ لیائے گا اس سے فدیہ۔ اور نہ ان کی

مدد کی جائے گی۔ ۴۱ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو نجات دی فرعون

والوں سے۔ وہ چمکتے تھے۔ تم کو بہت بُری نثر۔ وہ ذبح کرتے تھے تمہارے

بیٹوں کو، اور زندہ چھوڑتے تھے۔ تمہاری عورتوں کو اور اس بات میں آزمائش

تھی تمہارے رب کی طرف نسبت بڑی ۴۲ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے

تمہارے لیے دریا کو بچا دیا تھا۔ ورنہ تمہیں نجات دی اور اہل فرعون کو غرق کیا۔

اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۴۳

پسے رکوع میں اجمال تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل

ربط آیات

کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں وہ انعامات و معجزات یاد دلانے ہیں جو ان پر ظاہر کیے گئے تھے۔

نزدک قرآن کے زمانے کے بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایمان قبول کر لیں۔ نیز اس

قوم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ بل ایمان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روش سے بچتے رہیں۔ کہیں ان کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرعون کی خلائی میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بے شمار خرابیاں اور سرکشی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد شیہار بنیاد عہد شریف لائے۔ سرکشی کا جو مادہ اس قوم میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ بے قرار رہا۔ یہ سب باتیں ان آیات سے واضح ہوں گی۔

اسرائیل کا معنی امت کا بندہ ہے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
 لِيَبْنِيَ سُرَّاكُم بِأَيْدِيهِمْ فَرِزْدَانِ يَعْقُوبَ ذُكُرًا وَمَعْتَقِي آلِيهِ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں بنی اسرائیل کی غلامی سے
 آزادی بحیثیت قوم انیس برتری دینا اور ان میں کثرت سے نبی بھیجنا وغیرہ شامل ہیں اور دوسری بات
 یہ کہ وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ میں جہاں والوں پر فضیلت بخشی۔ سورۃ مائدہ
 میں آتا ہے۔ إِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا یاد کرو اس
 احسان کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر بڑے بڑے بادشاہ پیدا کیے۔ اور کثرت سے انبیاء مبعوث
 فرمائے۔ اور تم کو وہ چیز عطا کی جو جہاں والوں میں سے کسی دوسری قوم کو عطا نہیں کی۔

یہاں پر بنی اسرائیل کی جہاں والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں تصور کرو
 علی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں وضاحت سے بیان
 کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت
 کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم
 ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دور میں دینی اور دنیوی ہر دولہانہ
 سے باقی تمام عالم پر برتری حاصل تھی۔ اُس زمانے میں اس قوم میں صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔
 اور اُن کی علمی حیثیت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے
 کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل
 پر مشتمل ہے۔ برخلاف اس کے ہندو قوم ہزاروں برس تک ہر سراقہ مار رہی ہے بھڑکھڑاتے
 چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے بند ڈوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ غامی خود بند و بھی

بنی اسرائیل
 کی فضیلت

تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں، ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ
کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی۔ تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنے زریں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبری، قیسری، صدی بخاری میں ہوئے ہیں: ابن خلدون اور ابن کثیر، آٹھویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیر، جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مؤرخ بھی ہیں۔ اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہمیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ مستفید نہیں ہو پتے جبکہ انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اسے محفوظ کرنے کی جگہ دے دی جاتی ہے۔

امت مسلمہ
کی برتری

بہر حال یہ چیز بنی اسرائیل کے خصائل میں سے ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت بخشی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت بخشی۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ عالمین سے مراد اقوام عالم ہیں۔ اور اس سے صرف انسان مراد ہیں۔ کیونکہ دنیا کی باقی اشیاء تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں: **خَلَقَ لَكُمْ** **مَعَا فِي الْأَرْضِ مِنْ جَمِيعِ شَيْءٍ** زمین کی ہر چیز تمہارے لیے پیدا کی۔ لہذا برتری صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ میں اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ فضیلت مطلقاً ہر زمانے کے لیے نہیں تھی حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ میری امت سب امتوں سے

بعد میں آنے والی ہے۔ ہر قیامت کے دن سب آگے ہوگی۔ ان کا حساب و کتاب بھی ذاتی امتوں سے پہلے ہوگا۔ اور جنت میں بھی سب سے پہلے جائیں گے۔ انہیں باقی تمام امتوں پر برتری حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان پر کیے گئے انعامات یاد دلانے کے بعد فرمایا: **وَالْقَوُّمُ** **يَوْمَئِذٍ لَا يَجْزِي نَفْسًا عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا** اور اس دن سے دُور جس دن کوئی نفس نہ بچائے گا۔ دوسرے نفس سے کچھ نہیں۔ بہت ہی خوفناک اور خطرناک دن آنے والا ہے۔ ہر نفس کو اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق سبقتنا پڑے گا۔ یہ درکھو اس دن انسان کی برتری تقوٰے کے اعتبار سے ظاہر ہوگی۔ تقوٰے کی تشریح میں شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی تھی: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْعُقُوبَىٰ** یہ ہے کہ انسان عدل و احسان کا دامن تھام لے۔ قربت و اردوں کے حق ادا کرے اور غش اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہے۔ غصہ سے اور عمل میں اپنوں اور بیگانوں سے عدل لازم ہے۔ اور احسان تو بڑی منزل ہے۔ بحقوق کی ادائیگی — اس سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام چیزیں تقوٰے میں شامل ہیں۔

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی۔ **مَشْفَعَةً** شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش برحق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سفارش ہوگی۔ اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ کسی کافر کے حق میں سفارش معنی نہیں ہوگی کسی کافر سے سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ جسو علیہ السلام نے فرمایا: میری سفارش برحق ہے۔ اور یہ میری امت کے ہر اُس شخص کو پہنچے گی **مَنْ رَزَقْنَاهُ شَيْئًا** جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شہید نہیں بناتا۔ مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی جیسے وہ صحیح ہوگا۔ مشرک اور کافر نہیں ہوگا۔ تو سفارش معنی ہوگی **مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ**

بِإِذْنِ اللَّهِ تَعَالَى كِى اجازت کے بغیر بھی کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی دوسری شرط یہ ہے
 "وَرَضَى لَهُ قَوْلُهُ" سفارش اس کے حق میں ہوگی جس کا عقیدہ اور بات اللہ تعالیٰ کو پسند
 ہوگی۔ فاسد عقیدہ انسان کے ہاتھ میں سفارش کا کوئی مکان نہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ جس وقت ہل
 کوئی چیز مضیہ نہیں ہوگی۔ حشر میں بڑی بڑی چیزیں آئیں گی۔ جب قمری تجلی دوسرے نازل ہو رہی
 ہوگی۔ تو بغیر غلیسہ السلام بنی تمبھر جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نفسی نفسی پکاریں گے اس
 موقع پر سفارش کہاں ہوگی۔ ہاں جنس دوست مواقع پر دو شرائط کے ساتھ سفارش ہوگی کہ اللہ
 تعلقے کی اجازت ہو اور جس کے حق میں سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

فرمایا اُس دن سے ڈرو جس دن سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ وَلَا يُؤْخَذُ
 مِنْهَا عَدْلٌ اور جس دن فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنی
 جان چھڑا سکے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ صاف موجود ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کی
 بھری ہوئی پوری زمین بھی فدیہ دیکر اپنی جان بچانا چاہے گا۔ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو اتنا
 دل و دولت، سونا، چاندی، مسیا ہونا ہی ناممکن ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے۔ تو اتنا بڑا
 فدیہ بھی کسی کا رنہ آئے گا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ اور نہ کسی طرف سے ان کی مدد ہوگی۔ دنیا
 میں کسی کو چھڑانے کے یہی طریقے ہیں۔ کیس سفارش چل گئی۔ کیس فدیہ یا نذرانہ دے دیا یا کیس جتنا بھاری
 کرنی۔ مگر میدان حشر میں ان میں سے کوئی چیز بھی کارگر نہیں ہوگی۔

بعض لوگوں نے سفارش کا عقیدہ بالکل ایسا بنایا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے کفارے
 کا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ سفارش حقیقت میں انسان کے عقیدے اور اعمال
 کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہودیوں نے بھی غلط امید لگا رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
 دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی ختمہ کے ہوئے اسرائیلی کو دوزخ میں
 نہیں گرنے دیں گے۔ ہم جو چاہیں کرتے رہیں، دوزخ میں نہیں جاسکتے۔ آگے آ رہا ہے کہتے

تھے "وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ النَّارُ إِلَّا يَأْمُرُكُمْ وَذَرُّهُمُ الرَّجْمُ رَدِّمْ فِيهِمْ كَيْفَ تَحْكُمُ"۔
 ہم نئے دن کے لیے جتنے دن ہمارے ہوں گے پھرے کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "لَنْ
 يَدْخُلَ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فُتُورًا"۔ نصیری یعنی جنت کے دروازے
 یہودی اور عیسائی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ امر غلط عقیدہ
 سفارش کے متعلق ہیں جو کہ ان کے عقیدہ بنیاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ماضی ہو یا ماضی بعید
 درست ہو یا باطل اعمال کا کوئی حصہ ہو یا نہ ہو ہمارے سفارشی میں بچا لیں گے۔ انہوں کی شرعی
 باتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے۔ مکلف نہیں ہوتا ہے۔ اس سے باز نہیں
 ہوتا ہے۔ عقیدے اور اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا۔ قرآن پاک میں صاف موجود ہے: "ثُمَّ
 كَلَّمْنَا نَحَارًا عَنْ نَفْسِهَا بِرُفْسِهَا"۔ یعنی اپنے طرف سے دفع کرتے گا۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ دو دن بھی آئے نہ رہے جس دن اللہ تعالیٰ
 انسان سے براہِ راست خطاب کرے گا۔ وَلَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُاجًا جب
 خدا تعالیٰ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ براہِ راست سوال و جواب ہوں گے۔
 انسان سوال ہے اور جس سفارش کے عیسائی یا مشرک یہودی قائل ہیں۔ ایسی سفارش کا اسرار میں
 کوئی مقام نہیں ہے

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ارشاد ہوتا ہے: "وَإِذْ جَعَلْنَاكَ مِنْ
 ذُرِّيَةِ إِسْرَءِيلَ إِذْ قُلْنَا لِمُوسَىٰ إِنَّكَ أَهْلٌ لِّرَبِّكَ فَقُلِ لِيْهِمْ عِلْمٌ"۔ فرعون نے
 بنی اسرائیل پر غور کیا کہ کیا وہ توڑ پھوٹے تھے۔ اس کے حورن بھی اس کی بیویاں ملے تھے۔
 اور غلام دیکھ میں فرعون کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ تمہارے ساتھ کیا سوچ کرے تھے۔
 "يَوْمَ مَوْنَكُمْ مَوْنًا"۔ وہ تمہیں زلت ناک ہت میں مرسہ تھے۔ "يَذْخَبُونَ
 عَنْكُمْ"۔ تمہارے بچوں کو دیکھ کر کہتے تھے۔ "وَيَسْتَحْيُونَكُمْ"۔ گھبراہٹ اور ہراسہ
 کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

مردوں کے قتل اور عورتوں کے زندہ رکھنے کا نمل بنی اسرائیل کے ساتھ دودھ پیش آیا۔ پہلی دفعہ یہ ظلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ڈھایا گیا۔ جب بچہ میوں نے پیش گوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اُس وقت فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو۔ اُسے ذبح کر دیا جائے اور اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں ہی اُن کی پرورش کی۔ اور وہ سارے واقعات پیش آئے جو سورۃ قصص میں مذکور ہیں۔

ظلم کی اس چکی میں کتنے بچے پسے۔ اسکے متعلق مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُس وقت نوے ہزار بچے ذبح کئے گئے۔ ظلم و جبر کی یہ انتہا تھی۔ اُن والدین کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ جن کے سامنے ان کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ ایسے والدین کی پریشانی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اُس احسان کو یاد کرو۔ جب میں نے تمہیں اس ظلم سے نجات دی۔

بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا دوسری دفعہ حکم فرعون نے اُس زمانے میں دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بن کر آئے اور تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ اس وقت فرعون کو دوبارہ خطرہ پیدا ہوا۔ کہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے کسی طرح کم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا۔ کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو۔ اُسے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ لڑکیاں ہماری خدمت گزاری کے کام آسکیں گی۔

فرمایا وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے واقعی یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ کہ اپنے سامنے بچوں کو ذبح کرنا اور وہ کس طرح اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہت اور حوصلہ نہ چھوڑا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے نجات دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دوسرا بڑا احسان یہ بتلایا "وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَبْنَا فِرْعَوْنَ" اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا اور تم کو نجات دی بنی اسرائیل جب ہجرت کر کے مصر آئے تھے۔ تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے بہتر آدمی تھے۔ چار پانچ صدیوں کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرے ان بندوں کو لے کر یہاں سے نکل چلیں۔ آپ نے اپنی قوم سے مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ بغیر اطلاع یہاں سے نکلنا درست نہیں بلکہ فرعون سے اجازت حاصل کر لینی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون سے اجازت طلب کی کہ مجھ بائیس تقریب میں جانا چاہتے ہیں۔ اجازت مل گئی۔ انہوں نے فرعونوں سے زیورات وغیرہ بھی حاصل کر لیے۔ کہ ایک خاص تقریب میں شامل ہونا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا دن گزر گیا۔ اگلی رات فرعونوں کو احساس ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل بالکل ہی نہ چلے جائیں۔ ان کا پتا کرنا چاہیے۔ فرعون نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ ایک دن لشکر کی تیاری میں گزر گیا۔ اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ بنی اسرائیل مسلسل چلتے رہے۔ مگر سے شرق کی جانب بیکہ قلمزم آتا ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد صحرائے سینا آتا ہے۔ یہ بارہ کوس کی مسافت ہے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ فرعون کا لشکر بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ لشکر اور بازاری لوگ ملا کر کل نفری ساٹھ لاکھ کے قریب تھی۔ اور جب بنی اسرائیل بیکہ قلمزم کے کنارے پر پہنچے تو پتا چلا کہ پیچھے فرعون لشکر لے کر آ رہا ہے بڑے گھبرائے کہ اب تو ہم بچنے کے چاہیں گے۔ اور ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت۔ اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِي۔ بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور راہنمائی کرے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا "اَنْ اَصْرِبُ بَعْضًا الْبَحْرَ" یعنی اے موسیٰ اپنی راہی سے سمندر میں بارہ جگہ ضرب لگاؤ۔ بنی اسرائیل کے بارہ

قبیلے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ مقامات پر ضرب مکانی اور بارہ
 رستے کمند میں بن گئے۔ بارہ کوس کے لیے رستے میں پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ گونہ پانی
 منجم ہو گیا۔ اور ان بارہ راستوں کی درمیانی دیواروں میں کھڑکیاں بھی بن گئیں۔ تاکہ دریاں مغرب
 قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے والوں کو بھیج سکیں۔ یہ سب کچھ عجیبہ طور پر ہوا جس کی تفسیر قرآن
 پاک اور تفسیر میں موجود ہے۔ مگر سیرت اور پوچھنی فرق اس کا احاطہ کرتے ہیں۔

بہر حال تمام قبیلے اپنے اپنے رستوں پر روانہ ہوئے۔ نتیجے سے فرعون کا لشکر بھی ان
 پہنچا۔ انہوں نے دیکھ کر پانی میں رستے بنے ہوئے ہیں۔ اور بنی اسرائیل ان راستوں پر بادل
 رواں میں۔ فرعون کی کھوڑوں پر سوار تھے۔ لکن ان کے گھوڑے پانی میں نہانے کے لیے تیار نہ
 تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو کھوڑی پر سوار کر کے بھیجا۔ آپ آگے چلے۔ کھوڑی
 کی بوسنچ کر فرعون کا کھوڑا بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میکائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کے
 سارے لشکر کو پیچھے روک چنانچہ انہوں نے کہا کہ تمہاری اسرائیل تمہارے ہاتھوں سے نکلے
 جاتے ہیں۔ حاقب کر کے ان کو چڑھو۔ چنانچہ سارا لشکر پانی میں بنے ہوئے راستوں پر چل نکلا
 بنی اسرائیل بارہ کوس مسافت طے کر کے کمند سے پار ہو گئے۔ اور فرعون کا سارا لشکر پانی میں
 بنے ہوئے رستوں کے درمیان آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: **فَغَشَّيْهُمْ مِنَ اللَّيْلِ**
مَا غَشَّيْهُمْ پھر پانی کی موجوں نے انہیں اس طرح گھیر کر ان میں سے ایک بھی زندہ نہ
 بچا۔ صرف فرعون کی ریش کو پانی نے عبرت کے لیے باہر بھینک دیا اسی واقعہ کو یاد دہاتے
 ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَأَعْرَضْنَا عَنْ فِرْعَوْنَ بِمَنْ تَقَامِرُ فِرْعَوْنُ وَارْتَمَتْهُ**
الْمَغْرِبُ اور یہ سب چوتھائی آنکھوں کے سامنے جو میرے اس احسان کو یاد کرو۔ جب تمہارا
 لیے کمند میں۔ رستے بنائے بن کے ذریعے تم نے کمند کو جو کرنا در فرعونوں سے نجات پال۔
 مگر اس پانی میں فرعون کے سارے لشکر کو تمہارے سامنے غرق کر دیا۔ ان احسانات کو یاد دلانے کا مقصد
 یہ تھا کہ اب بھی اپنی برائیوں سے باز جاؤ۔ اور اس دن سے ڈر جاؤ۔ جس دن نہ کوئی سفارش کام آئے گی
 اور نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تمہارے اُپر نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ أَخَذْنَا الْعِجْلَ مِنْ
 بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ حَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ
 ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ
 لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَارَأَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقْرَأُ أَنْكُمْ
 ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ
 فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ
 فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس
 رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔ اور تم ظلم کرنے والے
 تھے ﴿٥١﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو اس کے بعد تاکہ تم شکر یہ ادا کرو ﴿٥٢﴾ اور
 اس بات کو یاد کرو جب ہم نے دی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت
 پا جاؤ ﴿٥٣﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔
 اے میری قوم کے لوگ! بے شک تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ بوجہ بنائے کے
 بچھڑے کو معبود۔ پس توبہ کرو اپنے پیہ کرنے والے کے سامنے۔ پس قتل کرو
 ایک دوسرے کو۔ یہ ہر جتنا ہے پیہ کرنے والے کے پاس۔ پس اُنہی نے رجوع
 کیا تمہارے اوپر بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿٥٤﴾

نزل توراۃ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو انعامات فرمائے ان کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ فرعون کی غلامی
 سے نجات دلانے، دریا کو بچاڑ کر معجزانہ طور پر پانی میں راستے بنانا اور بنی اسرائیل کو بچانا اور پھر
 فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت وغیرہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس درس میں بعض مزید انعامات کا تذکرہ
 ہے۔ منجملہ ان کے بنی اسرائیل کو کتاب اور شریعت عطا کرنا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَدْنَا مَوْسَىٰ رَٰبِعِينَ لَيْلَةً ۚ اِس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ کوہ طور پر چالیس رات تک تنہائی میں اعتکاف کریں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اصل وعدہ ایک مہینہ کا تھا۔ مگر بعد میں بڑھا کر چالیس رات کر دیا گیا۔ وعدہ یہ تھا کہ مسلسل چالیس رات کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جائے گی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے تھے۔

وَعَدْنَا بَابِ مَنْعِلِهِ كَاصِيفَةٍ ۚ اور اس کا معنی بھی وَعَدْنَا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنی رسول اور صاحب شریعت تھے۔ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جسے عربی میں دھال یا گیا ہے۔ عبرانی زبان کا اصل لفظ مِیث تھا۔ مِی کا معنی پانی اور شَا کا معنی درخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں پانی میں بہتے چلے آئے تھے۔ جب انہیں اٹھایا گیا وہاں درخت بھی موجود تھے۔ اس بنا پر آپ کا نام میثا اور پھر عربی میں موسیٰ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سولہ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک یک سو تیس سال تھی۔ اسی عمر میں یہ سائے واقعات پیش آئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ آپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے موسیٰ بن عمران بن بصیر بن فاہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم لاوی بن یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور عرف عام میں بڑا بیٹا بن ریاست اور نیابت کا وارث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو دروز حیثیت حاصل تھیں۔ حقیقی ریاست یعنی نبوت بھی ان کو حاصل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول بنایا۔ اور عام ریاست یعنی نیابت بھی بڑا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہی حاصل تھی۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو احساس ہوا کہ وہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہذا ان کے پاس اپنا قانون ہونا چاہیے۔ جس سے وہ رہنمائی حاصل

کریں۔ اور اس کے مطابق زندہ کی بسر کریں۔ چنانچہ قوم کی خواہش پر موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں کوئی قانون عطا کیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ طور پر آکر چالیس دن کا اعتکاف کرو۔ تو تمہیں کتاب دی جائے گی جو تمہارے لیے مکمل قانون ہوگی۔

تفسیر معالم التنزیل اور بعض دیگر تفاسیر میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں وارد ہوئے اور انہوں نے چالیس سال میدان تیرہ میں گزارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ ہارون علیہ السلام بھی اسی مقام پر فوت ہوئے۔ تاریخ سے بھی یہ چیز ثابت ہے کہ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ہی صحرائے نوردی کرتے رہے۔ یہ لوگ مہر کی طرف نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ارض مقدس پر حملہ کرو۔ وہاں پر تمہیں قبضہ دلایا جائے گا۔ مگر یہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چالیس سال بعد بنی نسل نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ارض مقدس پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے، اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تو ان کے زمانے میں شام اور فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہوئے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں قوم عمالقتہ کی حکومت تھی۔

معالم التنزیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر قلزم کو پار کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کے کچھ آدمیوں کو مصر کی طرف بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کا انتظام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ چور، ڈاکو، قزاق، مفسد وغیرہ ملک میں بد امنی پھیلادیں۔ یہ بات اگرچہ عام روایتوں کے خلاف ہے تاہم اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعض لوگوں کو وہاں بھیجا ہو مگر آپ خود وہاں نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کوہ طور پر اعتکاف ہوئے تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن ملی۔

حمل قرار پاتا ہے تو چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے۔ اس کے بعد علقہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے چالیس دن بعد گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ پچھ چالیس دن بعد اس میں روح انسانی ڈالی جاتی ہے۔ اس سے پٹہ روح حیوانی ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام عام طور پر چالیس دن کا پندرہ گنت ہیں چالیس دن روزہ بھی رکھواتے ہیں۔ اور عبادت بھی کر دیتے ہیں جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک خوبصورت عورت باجماعت نماز پڑھا کرتی تھی۔ کسی نوجوان کی نظر پڑی تو اُس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ کہ یہ شخص فتنے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ عورت کامل الایمان تھی۔ کئے لگی کہ میں تجھے ملاقات کا موقع اس شرط پر دیتے کہ تیار ہوں۔ کہ تم حضرت عمرؓ کے پیچھے چالیس دن تک نماز ادا کرو۔ اور یہ اس حالت میں ہو کہ تمہاری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو۔ اس شخص نے اُسے نہایت آسان کام سمجھتے ہوئے نماز باجماعت شروع کر دی۔ ابھی ۱۰ روز ہی گزرے تھے کہ اس میں تغیر آنا شروع ہو گیا۔ جب چالیس دن مکمل ہوئے تو اس شخص کی کایا ہی پٹ چکی تھی۔ اب اُس عورت نے پیغام بھیجا کہ تمہاری شرط پوری ہو چکی ہے۔ تم اگر ملاقات کر سکتے ہو۔ نوجوان نے جواب بھیجا کہ اب میری ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو چکی ہے۔ تمہاری ملاقات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چالیس دن کے چلنے کا اُس نوجوان پر یہ اثر ہوا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ اور اُس نے سارا واقعہ حضرت عمرؓ کو سنا دیا۔ آپؓ فرمایا صَدَقَ اللہُ تَعَالٰی اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا اِنَّ لَکُمْ فَاوِیَۃً تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بڑے کاموں سے روکتی ہے۔ اور پھر نماز بھی ایسی جو امیر المؤمنینؓ کے پیچھے ادا کی گئی ہو۔ سُبْحَنَ اللہِ اس کا کیا ہی اثر ہو گا۔ بہر حال چالیس کے عدد کا یہ خاص اثر ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لیے کوہ طور پر متعین ہو گئے تھو اَتَّخَذْنٰمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ثُمَّ نَبَاۤیَا۔ وَأَنْتُمْ ظَلِمُوْنَ

بنی اسرائیل کی گمراہی پرستی

اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔
 مگر اس کے وجود تم کو سالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ "اِنَّ
 الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَالْكَافِرُوْنَ
 هُمُ الظَّالِمُوْنَ" کفر کرنے والے بہت بڑے ظلم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل انداز
 کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک بٹھراتے ہیں۔
 سورۃ طہ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے
 ہیں۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔
 شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ گوسالہ پرستی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ مت
 سمجھو کہ صرف بچھڑے کی پوجا ہی شرکانہ فعل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی پوجا کی جائے
 گی۔ وہ شرک ہی ہوگا۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ "فَعَسَىٰ عِبَادُ الْبَنَاتِ
 تَبَادُوهُنَّ دِينَارًا كَابَدَهُنَّ تَبَاهُ يَوْمَ كَيْلٍ كَابَدَهُ"۔ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَمْ يُعْطَ سَخِطَ
 اگر اے دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ یہ دراصل
 درہم و دینار کی عبادت ہی تو ہے۔ اس کو بھی گوسالہ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک عام معمول
 ہے کہ جو چیز تجھے نہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتی ہے۔ وہ تیرا طاغوت ہے۔
 اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام جیسے نبی کی موجودگی میں
 بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کی غالب وجہ
 یہ ہے کہ مصر میں صدیوں تک بڑے بڑے بنی اسرائیل نے مصریوں کے اثرات قبول کر لیے
 تھے۔ مسرن لوگ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ لگائے کی پوجا کرتے تھے۔ اور سورج کی پوجا
 کرتے تھے۔ فرعون کا معنی ہی بڑا دیوتا ہے۔ اور یہ سورج کے نام پر بنایا ہوا تھا۔ اس کے
 علاوہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ یہی چیز بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ لہذا
 انہوں نے بھی بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

مختلف قوموں کے
 ایک اور بڑے
 اثرات

اقوام عالم کے ایک دوسرے پر اثرات تاہم طوری ثابت ہیں۔ برصغیر کے شلمان ہندوؤں کے آثار سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی بہت سی دھرمیں سکندروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مرنے والے کاتیجا۔ ساتواں۔ پالیسواں وغیرہ ہندو دھرم میں۔ درختوں کی لکڑیوں کو ان دھرموں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل چونکہ مصریوں کے غلام تھے۔ لہذا انہوں نے ان کے اثرات بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر گئے۔ موجودہ زمانے میں دیکھ لیں جو قومیں انگریزوں غلامی میں رہی ہیں۔ وہ سب ان کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہیں۔ مشرقی ممالک میں سے ایرانیوں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے ان کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال عربوں مصریوں اور شامیوں کا ہے۔ بعینہ مصریوں کی عادات بنی اسرائیل میں سرایت کر چکی تھیں۔ لہذا موقع ملے ہی انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

بعض اسرائیلی علوی عقیدہ کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کر جاتا ہے۔ اور اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ یا فلاں جہم میں اس نے ظہور کر لیا ہے۔ تو اسی قسم کے غلط عقیدہ کی بنا پر سامری بہت انہیں ٹمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ سامری نے کہا: هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ ذِي الْقُرْبَىٰ یعنی تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا الہ یہی ہے اللہ تعالیٰ اس بچھڑے میں صول کر آیا ہے۔ لہذا اس کی پوجا شروع کر دو۔ بچھڑے نے بولنا تو شروع کر ہی دیا تھا۔ جنمال قسم کے بنی اسرائیل سامری کی باتوں میں آگے۔ اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

باقی رہا یہ سوال کہ سامری نے یہ کدھم کیسے ظاہر کر دیا۔ تو یہ شخص میسک، مسٹر یا مداری یا جادوگر تھا۔ وہ مختلف قسم کے بڑک جانتا تھا، چنانچہ اس نے چال بازی سے کام لیا۔ جب فرعون کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بحیرہ قلزم پر پہنچا اور ان کے گھوڑے سمندر میں اترنے سے ہچکچائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کر کے ہیبی جو لشکر فرعون کے آگے آگے چل رہی تھی۔ سامری نے دیکھا کہ جس جگہ پر جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کا پاؤں لگتا ہے وہاں فوراً سبزہ اُگ آتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی کدھم ہے، اس نے گھوڑی کے پاؤں کی جگہ کی گھوڑی کی مٹی نمونہ کر لی۔ وہ سارے تو تھا ہی۔ اس نے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور اس کے منہ

میں وہ مٹی رکھ دی۔ جس کی وجہ سے بچہ پڑے نے بولنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے مشہور کر دیا۔
کہ خدا تعالیٰ اس میں حلول کر آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام
کی واپسی

موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ اعتکاف کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر واپس آئے
تو دیکھا کہ کئی لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ سخت ناراض ہوئے۔ مشرکین کو زجر کیا۔
اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے بھی بڑے ناراض ہوئے کہ آپ نے قوم کو شرک میں مبتلا ہونے
سے کیوں نہ روکا۔ بھائی نے عذر پیش کیا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو انہیں ہر چند شرک
سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تو میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ "وَكَادُذًا يَقْتُلُونَنِي"
یہ سارا واقعہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات
نہیں مانتے تھے۔ تو آپ ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام
نے کہا کہ میں نے تفریق کو پسند نہ کیا۔ کہ آپ واپس آکر اعتراض کرتے کہ قوم کو دو ٹکڑوں
میں کیوں تقسیم کر دیا۔ ان میں پارٹی بازی پیدا کر دی ہے۔ لہذا میں نے انہیں کے درمیان بہتے
ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان بدبختوں نے میری بات نہ مانی۔

بچہ پڑے کے
بجاریوں کا
قتل عام

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ
انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کا ازالہ کس
طرح ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَتُوبُ عَنْكُمْ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ تمہاری توبہ قبول کر لی مگر بڑے
سخت طریقے سے جیسا کہ آیت میں آتا ہے۔ "وَإِذْ آمَنَّا مَوْسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ
جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور فرقان یعنی فیصلہ کن طاقت یا معجزات عطا کیے
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُعْظِمُ اِسْمَكُمْ
ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔
بِاِخْتِاٰذِكُمُ الْيَحْدُكُہ ایک بچہ پڑے کو معبود بنالیا ہے، فتوبوا الی بار پر
پس توبہ کر دینے پر آمادہ رہو کہ اس نے اسے توبہ صدق دل سے ہونی چاہیے۔ محض زبان

توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا طریق کار یہ متعین فرمایا کہ فَاَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ اپنی ہی جانوں کو قتل کرو۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ مشرکوں کو قتل کر دیں۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا یہ بظاہر بہت بڑا امتحان ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کو قتل کرو مگر یاد رکھو ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ یہ بات تمہارے پیہ کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔

الغرض حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ان بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر آگئے جنہوں نے پھڑے کی پوجا سے اجتناب کیا تھا۔ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ ہارون علیہ السلام ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا يَا مَعْشَرَ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ اِنَّ اِخْوَانَكُمْ اَتَوْكُمْ شَاهِرِيْنَ سَيْوِفَهُمْ يُرِيدُوْنَ اَنْ يَّقَتُلُوْكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْبِرُوْا یعنی اے بنی اسرائیل کے گروہ۔ یہ تمہارے بھائی برہنہ تلواریں لیے تمہارے قتل کے لیے آئے ہیں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اپنے قتل میں مزاحمت نہ ہونا۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کے ہمراہیوں نے تلواریں چلانا شروع کر دیں ان کے اپنے ہی عزیز واقارب مائے گئے۔ بیشمار لوگ قتل ہوئے۔

فرمایا جب یہ شرط پوری ہوگئی تو فَتَابَ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے توبہ کی قبولیت کا فائدہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل قتل ہو کر آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے۔

الْقَافِ
درس بہت در

البقرة
(آیت ۲۵۵، ۲۵۶)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَلَخَذْنَاكَ
الصُّعَيْتَ ۚ رَأَيْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ٥٥ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَيْنِ
مَوْتِكَمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ٥٦ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ
الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالتَّلْوِيَّ كَأَوْامِرٍ
طَيِّبَاتٍ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ۝ ٥٧

ترجمہ: اور جب تم نے کہاے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے بیک

تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر پس پھر یہ تم کو کھلی نے اور تم دیکھ رہے تھے ۵۵

پھر اٹھایا ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر ادا کرو ۵۶ اور ہم نے تمہارے

اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔ اور تمہارے اوپر من اور سونے امارا لکھا۔ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے

تمہیں روزی دی ہیں۔ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۵۷

بنی اسرائیل کی غریبوں اور ان کی سرکشی کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر جو

رابط آیات

انعامات کیے ان کا ذکر بھی ہو گیا ہے۔ گذشتہ درس میں بیان ہوا تھا: وَإِذْ أَلَيْنَا مُوسَىٰ

الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ یعنی اس وقت کو دھیان میں لاؤ۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب

اور فیصلہ کن بات عنایت کی۔ اس کے لیے خود بنی اسرائیل کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی

تھی کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور

پر اعطاف جیٹنے کی ہدایت کی۔ اور تکمیل اعطاف پر اللہ تعالیٰ نے توراہ عطا فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کتاب توراہ لے کر قوم کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے

روایت بنی
کی خواہش

تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات دیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنا دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے

کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دئی ہے۔ یا آپ خود بنا لائے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کئے
 بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ وَإِذْ قُلْتُمْ لِمُوسَىٰ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب تم نے
 کہا اے موسیٰ۔ تَنَزَّلُ عَلَيْنَا سُنَّةٌ ہم ہر گز آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ
 کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہے۔ حَتَّىٰ نُنزِّلَ اللَّهُ جَمُوعًا یہاں تک ہم خود اللہ تعالیٰ
 کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ چلو تم ساری یہ شرط بھی پوری ہوگی۔ آپ نے ستر
 آدمی منتخب کئے۔ کہ میرے ساتھ طور پر چلو۔ وہاں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہ راست سنا دوں گا
 کہ یہ کتاب اُسی نے نازل کی ہے۔ قوم طور پر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ آپ نے ہر قبیلے سے نوچر
 آدمی نکلے۔ بارہ قبیلوں کے ستر آدمی جمع ہوئے۔ ان میں دو آدمی حضرت یوشع اور قابیل کے
 گئے۔ کہ ہمیں آپ کی بات پر یقین ہے۔ لہذا ہمیں طور پر جانے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ان دو
 آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں نبوت
 سے سرفراز فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی ستر آدمیوں کو لے کر طور پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے
 کلام کیا۔ کہ ہاں یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بات سننے کے باوجود یہ لوگ
 ایمان نہ لائے۔

بعض مفسرین کلام کہتے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے کچھڑے کی پوجا کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان
 میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ کہ کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے اس فعل شیع کی معافی طلب
 کریں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد ان لوگوں نے یہ بے ادبی کی۔ کہ اے موسیٰ! ہم گنہ
 گزاری تصدیق نہیں کریں گے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس پاداش میں اللہ تعالیٰ
 نے انہیں سزا دی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

آخری روایات اور بائبل کی روایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام
 بالمشافہ سننے کے بعد بھی توراہ کو کتاب الہی تسلیم نہ کیا۔ فَاَخَذَ اللَّهُ الصَّيْقَةَ تو انہیں
 بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی۔ کہ کیمہ بجلی چمکی اور سب کو فنا کر گئی۔ کہتے ہیں۔ کہ

بنی اسرائیل و
 ستر

بجلی دراصل عالم مثال کا حجاب نوری یا ناری تھا جس کی چمک ظاہر ہوئی تھی۔ اور جوان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔

رؤیت الہی اس
جہان میں ممکن نہیں

بنی اسرائیل کی رویت النبی کی شرط قابل قبول نہیں تھی۔ کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے۔ تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے ﷺ إِنَّكُمْ لَن تَعْدُوا رَبَّكُمْ عَزًّا وَجَلًّا حَتَّى تَصُوتُوا ثُمَّ كَيْفَ بغير اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رویت تمام محدثین اور فقہار کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو گا۔ قرآن پاک میں موجود ہے وُجُوهٌُ يَوْمَئِذٍ نَّاظِرَةٌ ﴿٧﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٨﴾ ملکی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس جہاں کے کشف اعضار میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ زیارت النبی سے مشرف ہوں۔ بلکہ اگلے جہاں کے لطیف اعضا میں اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت پیدا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار بعض گمراہ فرقے مثلاً رافضی، معتزلہ اور خارجی وغیرہ کرتے ہیں۔ جن کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ اور نہ اگلے جہان میں دلیل ان کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے۔ جہت اور سمت سے بھی پاک ہے۔ اور رویت کسی مکان اور سمت میں ہی ممکن ہے۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے وغیرہ لہذا اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت قرآن و سنت سے ثابت ہے مگر اس رویت کی کیفیت کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بے کیف رویت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے کہ اسے بے کیف رویت الہی نصیب

ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ روایت تو یقیناً ہوئی مگر لا تذکرہ
الابصار نہ وہو یدرک الا بصارۃ۔ انسان انھیں اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر وہ
آنکھوں کو پالیتا ہے۔ یہاں یہ کیفیت ہے۔ مگر وہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو تجلیات ہوں گی۔ اور
علی قدر المراتب ہوں گی۔ وہاں ذاتی اور صفاتی دونوں قسم کی تجلیات ہوں گی۔ جن میں انسان دیکھے گا
خدا تعالیٰ کی رویت اس طریقے سے ہوگی۔ مگر یہ اس جہاں میں ممکن نہیں۔

آگے سورۃ اعراف میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام
کیا تو انہیں رویت کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ عرض کیا رَبِّ ارْنِیْ اَنْظُرُ الْبَیْتُ ذَا مَوْلَاکَرِیْمِ میں تجھے
ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا لَنْ تُرَیْہُ تَمْنِیْہُ دیکھ سکتے فرمایا پہاڑ کی طرف دیکھو۔
فَاِنْ نَسَقْنَا مَکَانَہُ فَسَوْفَ تَرٰہُ۔ اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو پھر شاید تم
بھی مجھے دیکھ سکو۔ فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّہُ لِلْجَبَلِ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تھوڑی سی تجلی ڈالی۔
سَحَابًا مِّمَّہُ دُکَّانًا۔ پہاڑ ریزے ریزے ہو گیا۔ وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا۔ اور موسیٰ علیہ السلام ہوش
ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے تَبٰیْتُ الْبَیْتُ ذَا مَوْلَاکَرِیْمِ میں تو برا کرتا ہوں
میری درخواست درست نہیں تھی۔ فرمایا فَخُذْہَا اَنْتَ وَکَیْہُ۔ اے موسیٰ! جو میں تمہیں دے
دوں اسی پر اتکا کرو۔ وَکُنْ مِّنَ الشَّکْرِیْنَ اور شکر گزار بن جاؤ۔ مقصد یہ کہ رویت الہی اس
جہاں میں ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اہل فیصلہ ہے۔ جسے بدلائیں جاسکتا۔

حضور علیہ السلام نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس میں مختلف آراء
ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ دیدار کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور قاضی شہار الشہابی پتی و
فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ مگر عالم بالا میں کیا۔ اس مادی جہاں
میں نہیں کیا۔ ————— عالم بالا میں رویت کے وقت تو حضور
علیہ السلام حظیرۃ القدس میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں تو رویت یقیناً ہوگی۔

الغرض جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان
نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بھل پڑی اور سرسڑکے سر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب

بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا
اور دوبارہ زندہ کرنا

موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آیت۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی وجہ سے میری ذات پر کوئی حرج نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہمارے آدمی سے جا کر مرادیے۔ اے مولا کریم! مہربانی فرما نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ وَمِنْ ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ صریح لفظ موجود ہے۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض توجیہ کرتے ہیں کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سوتے پڑ گیا تھا۔ پھر برٹش میں آگئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ سے واضح ہے کہ ان لوگوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ رکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پورے کے پورے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ قرآن پاک میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ جب عزیر علیہ السلام سوال کے بعد اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ كَمْ لَبِثْتَ تم کتنے دن سوئے ہو۔ عرض کیا لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سویا ہوں فرمایا بَلَدٌ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ تم تو سو سال تک سوئے ہو۔ اتنا عمر گزر گیا۔ اس دوران تمہارا گدھانا ہو گیا۔ اس کی ٹہیاں چور چور ہو گئیں۔ اب دیکھو اس کی ٹہیوں کو ہم کیسے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر انہیں گوشت پسائے ہیں۔ اور زندگی بخشے ہیں۔ برخلاف اس کے کھانا جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے۔ مگر وہ بالکل تازہ پاس پڑا ہے۔ لَمْ يَتَغَيَّرْ وہ گھاسٹا نہیں۔ آخر میں فرمایا أَلَمْ أَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ قادر علیٰ

ہے۔ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے۔

الغرض! اُن ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا کہ ہم جی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی نکتہ بندی نہیں کرنی چاہیے تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم میں بکرا گواہی دی کہ بے شک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

جہادِ جوار

اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ شام و فلسطین تمہارے جدا مجہد تہذیب و تمدن اور اخلاق علیہما السلام کی وارثت ہے۔ لہذا تم اپنی وارثت دوبارہ حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ٹھکانا یہی ہے اب اس علاقے پر عمالہ قوم کا قبضہ ہے۔ تم ان کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا وطن واپس دلا دیں گے۔ وہی وطن جہان تمہارے آباء اجداد آباد تھے۔ اور جن کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ تم تھوڑی سی محنت کرو۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کریں گے۔

بنی اسرائیل مسلسل غلامی کی وجہ سے بزدل ہو چکے تھے۔ ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاد پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ غلامی کا اثر تھا۔ آج ہمارا حال بھی یہی ہے انگریز کی سو سالہ غلامی کے نتیجے میں اخلاق بگڑ چکے ہیں جنہوں نے انگریز کا دودھ پیا ہے۔ ان کے اخلاق کی درستگی کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ نئی نسل آئے گی۔ نئے حالات پیدا ہوں گے۔ تو عرصہ کے بعد اخلاق کی درستگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم عمالہ بڑے سخت لوگ تھے۔ جب بنی اسرائیل نے ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے سنے تو ان کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہاد نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا بھگایا کہ تم صرف کم محنت بانہو۔ اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائیں گے۔ سو قلمداد میں تفصیلات موجود ہیں۔ یہ قوم کسی طرح جہاد پر آمادہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ستر سال صحرا میں نظر بند ہے۔ یَتِیْهُوْنَ فِي الْأَرْضِ

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْرِ الْفٰسِقِيْنَ اے موسیٰ! یہ فاسق لوگ ہیں۔ ان پر افسوس نہ کریں۔ یہ اسی سرزمین میں حیران و پریشان پھرتے رہیں گے۔ اس صحرائے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نیز یہ کہ یہ ساری نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔ نئی نسل کا نیا خون آئے گا۔ تو ان میں جذبہ جہاد بیدار ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام وہیں وفات پا گئے۔ پرانی نسل کے وہ لوگ جنہوں نے فرعون کی غلامی کا دور دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ستر سال کے بعد نئی نسل نے علم جہاد بند کیا اور شام و فلسطین کو فتح کیا۔

بَدَلِ کَاسِیَہ بَدَلِ کَاسِیَہ
بنی اسرائیل کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو انعامات سے نوازتا رہا۔ صحرائے تیرہ میں نظر بندی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاش اور زندگی کے اسباب معجزانہ طور پر مہیا فرمائے۔ بنی اسرائیل خمیوں میں اقامت پذیر تھے۔ جب خیمے بچھ گئے۔ تو ان کے لیے سورج کی گرمی سے بچنا مشکل ہو گیا۔ صحرائ کی گرمی بھی ایسی جو پاکستان کی گرمی سے چھ گنا زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک اور انعام فرمایا وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ یعنی اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا جب دن کے وقت دھوپ تیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ بادلوں کو حکم دیتے وہ بنی اسرائیل پر چھا جاتے۔ اور اس طرح وہ دن کے وقت سورج کی تپش سے محفوظ رہتے۔

مَن اور سَوٰی مَن اور سَوٰی
صحرائے سینا میں خورد و نوش کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی۔ نہ کھیتی باڑی اور نہ کوئی فصل ملے۔ چھ لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کھانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نسل بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اور اشیائے خورد و نوش کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح فرمایا وَانْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّٰی وَالسَّلْوٰی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر مَن اور سلویٰ نازل کیا۔ مَن کا لفظی معنی احسان ہوتا ہے۔ سورہ جاثیہ میں آتا ہے۔
يَعْمَلُوْنَ عَلَیْہِ اَنْ اَسْلَمُوْا اَبِیْہِمْ اَحْسَنَ جَلَاتِہِمْ اَمْ اَنْ اَسْلَمُوْا اَبِیْہِمْ اَحْسَنَ جَلَاتِہِمْ اَمْ اَنْ اَسْلَمُوْا اَبِیْہِمْ اَحْسَنَ جَلَاتِہِمْ
تاجم مَن میں یہ معنی پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت کے احسان کے طور پر انہیں کھانا مہیا کیا۔ کوئی کھیتی باڑی نہیں کرنی پڑی۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کام دہرا کرنا پڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالکل محنت میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔

من ترنجبین کی قسم کے دانے تھے۔ جیسے دھنیا کے دانے ہوتے ہیں۔ یہ سنایت شیریں
 مادہ تھا۔ جو رات کو بنی اسرائیل کے خیموں یا دوسری رہائش گاہوں کے ارد گرد برس جاتا تھا۔ اور
 اس کی مقدار اس قدر کافی ہوتی تھی۔ کہ ہر فرد کو ایک ایک یہ کے قریب میسر آ جاتا تھا۔ صبح اٹتے
 تھے۔ اور یہ دانے اکٹھے کر لیتے تھے۔ یہ ان کی چوبیس گھنٹے کی خوراک کے لیے کافی ہوتا تھا۔
 چونکہ ہفتے کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے جمعہ کے دن دو دن کی خوراک مل جاتی تھی۔

من کے دنوں میں خاص قسم کی شہ ہوتی تھی۔ جو کہ حیات انسانی کے لیے بڑی ضروری ہے۔
 انسانی جسم کی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے شہ کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کا جسم ٹھنڈا ہو کر
 ختم ہو جانے کا۔ قدرت نے انسان کے جسم میں ایسا نظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ انسان جو بھی غذا
 استعمال کرتا ہے۔ یہ جسم میں پہنچ کر شکنج جاتی ہے۔ یہ شکنج جسم کے امان اور پھلوں وغیرہ سے
 حاصل ہوتی ہے۔ اگر جسم یہ اصلی شکنج بھی کھائیں۔ تو بھی انسان جسم خوراک کے دیگر اجزاء سے شہ
 حاصل کر لیتا ہے۔ گویا انسان جسم کو کوئی غذا نہ دیتا ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اشیائے خورد و نوش
 سے جگر میں پیدا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسم کے باقی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی جسم
 کو نشتر پیر زمین یا لمیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دالوں وغیرہ کا بھی حاصل ہوتے ہیں الغرض!
 بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے من کے دانے مہیا کر کے ان کی یہ ضرورت پوری کر دی۔

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ارشاد میں عبود نامی کعبہ اور من کی تعریف فرمائی ہے۔
 حدیث میں آتا ہے: الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّعَةِ عَجْوَةٍ۔
 جنت کی کعبہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر اور سحر کا علاج رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا: الْكُمَاةُ
 مِنَ الصَّنِ وَمَاءُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ یعنی کھنیاں من میں سے ہیں اور ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ
 نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ یہ پھپھوئی موٹی زرد و سفید کھنیاں خورد و بینی سے بڑی لذیذ
 چیز ہے۔ انسانی جسم کے لیے گوشت کا اثر رکھتی ہے۔ نہ ان کا کوئی منج بوتلا ہے۔ اور نہ ان
 کی کوئی مخالفت کرتا ہے۔ خود بخود انہی میں اور لوگوں کے کام آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اس کا پانی سر میں جلا کر لگایا جائے یا ویسے ہی سنانی اس کے پانی میں بھگو کر آنکھوں میں لگائی جائے۔ تو آنکھوں کی کئی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتی ہے فرمایا یہ کھنبیاں سن ہی کی ایک قسم ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تہنجین کی قسم کے اس مادہ کو بنی اسرائیل کے لیے خوراک کا ذریعہ بنایا۔

سلمیٰ سلوان کے مادہ ہے۔ یہ بیٹر کی قسم کا جانور تھا۔ ہر ہفتے ان جانوروں کے غول کے غول دریائے شہر کی طرف سے اڑ کر آتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے خیموں کے قریب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ انہیں پکڑنے کے لیے دوسرے شکار کی طرح ان کو محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جوئی ذرا اندھیرا ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل ان جانوروں کو آسانی کے ساتھ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پکڑ لیتے تھے۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت پکاتے تھے۔ اور کباب بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ درجے کی خوراک مہیا کی تھی۔

پئے آپ پر غلہ

بادل کے سائے اور خوراک کی بہم رسانی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت عطا کی تھی۔ تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ ایک بہت بڑا ستون غار ڈٹھا جس سے بنی اسرائیل روشنی حاصل کرتے تھے۔ رات کے وقت یہ بڑا چمک اٹھتا تھا جس سے اس قدر روشنی میسر آجاتی تھی جو بنی اسرائیل کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

فرمایا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ بنی اسرائیل کھا دیا پاک چیزیں جو ہم نے تم کو رزق دی ہیں وَمَا ظَلَمُونَا اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ انہوں نے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں ہم نے عطا کی ہیں۔ انہیں خوب کھاؤ پو۔ مگر ان کا ذخیرہ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوشت گلنے سڑنے لگا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آئے۔ كَوَزَ بَنُو إِسْرَآئِيلَ یعنی اگر بنی اسرائیل ذخیرہ اندوزی کا ارتکاب نہ کرتے تو گوشت ایسی نہ سڑتا۔ خواہ مہینوں پڑا رہتا۔ مگر ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے گوشت سڑنے لگا۔ اس

طرح گویا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا۔ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا۔ بعد خود اپنی جانوں پر ظلم کے مرتب ہوئے
 اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے
 طرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار
 کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام
 فرمایا۔ پانی کی ضرورت پیش آئی تو جیسا کہ آگے آئے گا وہ بھی مہیا فرمایا۔

الْاٰ

رس لبت و جہا

البقرة

آیت ۵۸، ۵۹

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ
شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَكَنِيَةُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾
فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ
فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمِثْقَا
كَذُوبِهِمْ يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

قر مجید : اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور
کھاؤ اس میں سے جہاں بھی تم چاہو کثرت سے۔ اور داخل ہو دو روازے میں سجدہ
کرتے ہوئے۔ اور کنوئیں شش۔ ہم بخش دیں گے تمہاری غلطیوں کو۔ اور زیادہ دیں گے
ہم نیک کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ پس تبدیل کر یا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات
کو۔ سوائے اس کے جو ان کو کئی گئی تھی۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے
ظلم کیا عذاب آسمان کی طرف سے۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

تجلیات

جس طرح ابتداء رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ یٰبَنیٰ اِسْرَآءِیل اذْکُرُوا
نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اسی طرح ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل
ہی ہیں۔ جہاں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل
کے تقصیر، سرکشی اور نافرمانی کا حال بھی بیان ہو رہا ہے۔ انعامات میں سے فرعون کی غلامی سے
آزادی کتاب تورات کا حصول اور من و سلوٰی کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی نافرمانی کا ذکر ہوا۔ انہوں نے
اللہ تعالیٰ کی بنیاد بنی کی جس پر انہیں سزا بھی ملی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ
تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں
شام و فلسطین کا وہ علاقہ واپس دلا دیں گے جو تمہارے آباء و اجداد کا مسکن رہا ہے۔ مگر بنی اسرائیل

نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہاں پر بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو سورۃ مائدہ میں ہیں۔ تاہم کچھ باتیں سورۃ بقرہ میں بھی آ رہی ہیں۔ ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل ستر سال تک تیسرے کے بیابان میں سرگردان پھرتے رہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تہذیب اور سرکشی کا حال بیان فرما کر دوسرے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ سرکشی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو من و سلوئی کھاتے ہوئے کئی سال گزر گئے۔ بعض روایات میں اٹھارہ سال کا ذکر آتا ہے۔ تو انہوں نے بعض دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس کا ذکر اگلے کوع میں آئے گا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ من و سلوئی کی بجائے سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کو چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر تم ایسا ہی چاہتے ہو۔ تو اس بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پر یہ چیزیں تمہیں سیر آجائیں گی۔

وہ کون سی بستی تھی جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں بعض مفسرین اسے بیت المقدس سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ اریحامی بستی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے لوگوں سے جہاد کرو۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوا یا ان کے بعد۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ وہ بستی موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فتح ہوئی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل جہاد پر آمادہ ہوئی۔ ترانیں شاد اور فلسطین پر غلبہ حاصل ہوا۔ ہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ من و سلوئی کی بجائے دوسری خوراک کی طلب ہے۔ تو اس اریحامی بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں میسر آئیں گی۔

فَمَا وَادَّ قُلْنَا اَدْخُلُوْا هَذِهِ الْقَرْيَةَ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب بنی اسرائیل! ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ فَكَلُّوْا مِنْهَا حَيْثُ رِشْتُمْ رَعْدًا کھاؤ اس میں کھلے طور پر وسعت کے ساتھ۔ تمہیں اس معاملہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہاں یہ بات یاد رکھو کہ وَادَّخُلُوْا الْبَابَ سُجَّدًا اور اس بستی کے دروازے میں داخل ہو کجہ کرتے ہوئے بستی میں داخل ہوتے وقت سجدہ کرنے سے مراد کجہ شکر ادا کرنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فتح عطا کی ہے۔ اس بستی کا قبضہ دلایا ہے۔ تو اس کے بدلے غرور و تکبر نہ کرنا بلکہ عاجزی اور انکاری کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا یا کرنا انبیاء علیہم السلام کا عمل اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: کہ جب مکہ معظمہ فتح ہوا۔ تو حضور علیہ السلام اونٹنی پر سوار تھے۔ اور داخلے کے وقت آپ سر کو جھکائے ہوئے تھے۔ آپ اگر ٹکر داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اسی طرح جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران کا پایہ تخت مدائن فتح کیا۔ اور آپ نے اس قلعہ میں جا کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور کجہ شکر تھا۔ جو فتح و کامیابی پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا۔ کہ جب فتح حاصل ہو جائے۔ اور اس بستی میں داخل ہونے لگو تو نخوت و تکبر کی بجائے عاجزی دکھاتے ہوئے اور کجہ شکر بجالاتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ یہ آسمانی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔

محرکہ بدر میں بڑے بڑے کھار مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو اہل ایمان نے شکرانہ کے طور پر دو نفل پڑھے۔ اور اس بات پر اللہ رب العزت کا شکر یہ ادا کیا۔ کہ اس نے اہل ایمان کو ظالموں سے نجات دلائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحر قلزم سے باہر نکالا اور شکر فرعون کو غرق کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی کجہ شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے تو کجہ شکر بجالاتے ہیں شریعت محمدیہ میں کجہ شکر کی بجا آوری نہایت مستحسن فعل ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: کہ کجہ شکر ادا کرنے کے لیے دو رکعت نماز

نقل ادا کرنی چاہیے۔ تاہم صرف سجدہ کر لینا بھی درست ہے۔

استغفار
برکات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو احکام دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وَقُولُوا حِطَّةٌ اور زبان سے یوں کہیں کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ حِطَّ لَافْعَلٰی معنی مٹا دینا ہے۔ ہماری خطاؤں کو گرا دے۔ لفظ حِطَّ دراصل اَحَطُّ عَنَّا حِطًّا کا مخفف ہے۔ یعنی ہماری غلطیوں کو تباہیوں اور خطاؤں کو مٹا دے معاف کر دے یا دگر فرما۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سجدہ اور استغفار کی تلقین کی۔ اور فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق خوراک حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ان دو شرائط کے ساتھ بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کی کون ابتداء ہوتی ہے، وَأَوَّلُ الْخَيْرِ الْإِسْتِغْفَارُ اور خیر کی ابتداء استغفار سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرے۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ وَخَيْرُ الْخَطَايَا بَيْنَ التَّوَابُونَ بِرِثْمِهَا كَرِهَ غَطِيَاں سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الشَّابُّ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ زَاذَنْبٌ لَهُ كَنُہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہی ہے جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

فرمایا جب تم استغفار کر لو گے۔ مجھ سے معافی مانگ لو گے۔ تو پھر میں اس کا صلہ یہ دوں گا۔ کہ نَفِّزْ لَكُمْ خَطِيْبَكُمْ بِمَقَارِنِ خَطَايَاں اور لغزشوں کو بخش دیں گے۔ معاف کر دیں گے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کریں گے بلکہ وَسَنَزِيْدُ الصَّحِيْبِيْنَ يَتُوكَارُونَ کو مزید اجر عطا فرمائیں گے۔

علم خداوندی
میں تبدیلی

بنی اسرائیل کی طبیعتوں میں قہر اور سرکشی گھر کر چکی تھی وہ معمولی سے معمولی حکم بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ فَسَدَ الَّذِينَ ظَلَمُوا پس تہ لہ کر دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا تُوْرٌ غَيْرٌ سَدَنٌ قِيلَ لَهَا فَتَحْ وہ بات جبرائیل سے کہی گئی تھی۔ یعنی انہیں حکم تر رہا

کہ بچہ ٹکرا داکرتے ہوئے جائیں۔ وہ اکڑتے ہوئے اور چوڑا گھیسے ہوئے داخل ہوئے۔ اسی طرح حکم یہ تھا کہ زبان سے استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر انہوں نے لفظ حِطَّة کی بجائے حِنْطَة کہنا شروع کر دیا۔ کتنا تو یہ چاہیے تھا کہ اے اللہ ہمیں معاف کر دے حِطَّة مگر انہوں نے کہا حَبَّة فی شَعْرَة یعنی ہمیں تو خوشی کے اندر گندم چاہیے۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے۔ جو کہ مدبھے کی بے ادبی، گستاخی اور سرکشی تھی۔

یہاں پر لفظ ظَلَمُوا کہہ کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ احکام کو تبدیل کرنے والے سائے کے سائے بنی اسرائیل نہیں تھے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا۔ جس طرح پکھڑے کی پوجا کرنے والے بھی سائے کے سائے لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح احکام میں تبدیلی کے مرتکب بھی کچھ لوگ تھے۔ چنانچہ آگے ان کی سزا کا ذکر بھی آئے گا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی نص میں تبدیلی کی جو کہ بہت بُری بات ہے۔ انہیں تو اتباع کرنا چاہیے تھا۔ اَلَا مَورِیْہ۔ لہذا اے اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر سر تسلیم خم کر لینا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کوئی بھی احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کا باعث بنے گا۔ وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوگا۔

عالمی قوانین اور
حق شفعہ

اسلامی اصولوں میں تغیر و تبدل ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں بھی بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جنرل ایوب خان کے زمانے میں عالمی قوانین نافذ ہوئے۔ علما و محرم نے ہر جنبہ احتجاج کیا۔ کہ اس کی بعض شقیں قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مگر حکومت کے سربراہوں نے یہ قوانین آج تک نافذ چلے آئے ہیں۔ اسی طرح حق شفعہ کا قانون بنایا گیا۔ اعدائیت کی دُور سے شفعہ صرت میں ذمہ کے لوگوں کے لیے رہا ہے۔ یعنی شفعہ کا وہ شخص حقدار ہے جو یا تو جانیدار کی ملکیت میں شریک ہو یا حق میں شریک ہو یا پردی ہو۔ مگر اب دوستیں اور بھی ملائی گئی ہیں۔ حالانکہ اہم شائع تو پردی کے حق کے بھی قابل نہیں ہے۔ مگر اس دہانے میں مزارع اور باغ کے لڑکے وغیرہ کو بھی حق شفعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ خدائی قانون میں ترمیم نہیں تو اور کیا ہے؟

وراثت میں لڑکی کا حصہ

لڑکیوں کی وراثت سے محمدی بھی مذاتی احکام میں تبدیلی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لڑکوں اور لڑکیوں پر رد کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ مگر ہائے ہاں اس میں بھی رد و بدل ہوا ہے۔ لڑکیوں کی وراثت کے اکثر لوگ قائل نہیں۔ اس ملک میں آخر یہ کیا۔ تو اس نے خود لوگوں سے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کو شریعت کی رو سے نپٹانا چاہتے ہو۔ یا رواج کے مطابق۔ تو بعض اصلاہ کے لوگوں نے رواج کے مطابق تقسیم کو قبول کیا۔ چنانچہ یہ قانون آج تک موجود ہے کہ وراثت کی تقسیم رواج کے مطابق کی جاتی ہے۔ جس سے لڑکی محروم ہو جاتی ہے۔

صوبہ سرحد میں یہ قانون ڈاکٹر خان کی وزارت میں نافذ ہوا۔ مال کا سارا عملہ اس قانون کا پابند تھا۔ افسر مال، تحصیلدار، پٹواری وغیرہ اسی کے مطابق انتقال چڑھاتے تھے۔ مشورہ ہے کہ وہاں پر ایک شخص کا چھ مربع میل پہاڑی رقبہ تھا۔ اس نے ساری جائیداد دو لڑکوں کے نام بہہ کر کے لڑکیوں کو محروم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دنیا پر ہی یہ سزا دی کہ حقوے کی بیماری میں مبتلا ہوا وہ جب تک زندہ رہا اس کا نہ ٹیڑھا رہا۔ دونوں لڑکے بھی آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ ایک نے دوسرے پر گولی چلا دی اور اس کا بازو کٹ گیا۔ اس طرح گویا اس شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کر کے کچھ نصیب نہ ہو سکا۔

عالموں کی خدمت

بہر حال خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں رد و بدل بہت بُری بات ہے اور قابلِ عذاب ہے۔ مگر بنی اسرائیل کے بعض ظالم لوگوں نے اس بات کو بدل دیا جو انہیں کہنی لگی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا جن لوگوں نے ظلم کیا، ہم نے ان پر نازل کیا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ آسمان سے عذاب، مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے طاعون کی بیماری کی صورت میں عذاب نازل کیا۔ صرف ایک دن میں چوبیس ہزار اشخاص شہید ہوئے۔ اور کل ستر ہزار آدمی اس عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے انجام کو پہنچے، دو چار دن کے اندر اس بیماری نے اپنا کام کیا اور بنی اسرائیل کا صفایا ہو گیا۔ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ بَصَاكَ كَذُومًا يَفْسُقُونَ وہ لوگ فسق کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ لہذا

اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ اگر آج بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مہلت دے دے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ وہ نہ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

زمین کی آبادی
اور بربادی

اہم بیضاوی فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کی آبادی نیکی اور اطاعت سے ہوتی ہے اور مخلوق کی برائیوں کی وجہ سے اس کی بربادی ہوتی ہے۔ فسق و فجور کو آپ بیشک تمتی کا نام دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کھیل تماشہ، لہو و لعب، بدکاری، فحاشی، زنا، سود خوری وغیرہ سب بگاڑ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی آبادی تو ہر حال نیکی اور خدا تعالیٰ کی اطاعت سے ہوگی۔ جس قدر کچھ چین نصیب ہوگا۔ اسی قدر آبادی ہوگی۔ جس قدر گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ اتنی ہی بے چینی بڑھے گی۔ لوگ اضطراب اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوں گے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نافرمانی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ہم سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے کہ نیکی اور بدی میں تمیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں، نافرمانی سے پرہیز کریں۔

الْعَمَّ
درس بیت تفسیر ۲۵

البقرة ۲
(آیت ۶۰)

وَإِذَا سَأَلَكَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ نَجْمًا ۚ فَذَعَلِمَ كُلُّ أَنَاسٍ مَّشْرَبُهُمْ
كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْسُوا فِي الْكُرْهُ مَفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾
ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی
طلب کیا۔ پس ہم نے کہا کہ اپنی راہی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے
بھوٹ پڑے۔ تحقیق جان یا سب لوگوں نے اپنا پانی اٹھا لیا۔ اللہ کی دی ہوئی روزی
سے کھاؤ اور پیو۔ اور زمین میں فساد نہ کرو۔ بوسے نہ چلو۔ ﴿۶۰﴾

گذشتہ آیات میں ان انعامات کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ منجملہ
ان کے دشمن سے رہائی اور دولت ناک عذاب اور غلامی سے نجات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ صحرائے سینا میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے سر پہ
بادل کا سایہ کیا۔ خوراک کے لیے مَن اور سلویٰ فراہم کیا۔ جب بنی اسرائیل نے بنسری اور تڑکاری کا
مطالبہ کیا۔ تو انہیں ایک دوسری بستی میں اترنے کا حکم دیا جہاں ہر چیز میسر تھی مگر ساتھ یہ نصیحت
بھی کر دی کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل
ہونا۔ مگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو تبدیل کر دیا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے اگر اکر
بنی میں داخل ہوئے۔ اور زبان سے استغفار کرنے کی بجائے بعض یہودہ باتیں کہنے ہوئے
گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد کی یہ سزا دی کہ آسمان سے طاغون کی صورت میں عذاب
نازل ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ انہوں
نے صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرا دیا۔

بنی اسرائیل
پانی طلب کرنا

توراة اور بعض اسرائیلی روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل وادی سکات کے قریب

ایک مقام پر تھے۔ اُسے قَدَس کی سب سے بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کچھ پہاڑی ہے۔ اور کچھ صحرا ہے۔ پانی نایاب ہے۔ اس مقام پر ہی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ اُسے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے پانی کا بندوبست کرو۔ اس معاملے میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر بدتمیزی سے پیش آئے کہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کا آغاز کیا کہ اے مولیٰ کریم! بنی اسرائیل میرے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آ رہے ہیں کہ مجھے شکار کرنے کے درپے ہیں۔ لہذا تو ہی ان کے لیے پانی کا انتظام فرما۔ آیت زیر درجہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اُسْ وَاقِعَهُ كُرَادًا وَجِبَ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقی کا لفظی معنی طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑا کرنا، استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ابو علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ملتا ہے، کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا: يَسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تَوَلَّوْا إِلَيْهِ اُسْ قوم اپنے رب سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ "يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا" تاکہ وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسائے۔ جب کبھی دنیا خشک ساں کا شکار ہو جائے۔ زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جائے۔ تو فراہمی آب کے لیے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے بننے لگن ہوں کی معافی مانگیں۔ صدقہ خیرات کریں۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔ غرضیکہ استسقی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

استغفار کی
حقیقت

معنا کرام میں سے ہم ابرصینہ و کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقہا ہست و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہے گی۔ آپ نے دین کا پختہ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام علمی قریں اُسے بخوش قبول کر

استغفار کا طریقہ

گئیں۔ امت پر آپ کا بڑا احسان ہے جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی بمفسرین کرام نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا استنباط کیا۔ اور مشکلات کے حل پیش کئے۔ انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقہ پر امت کے سامنے پیش کیا۔ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔

اب وہ سب فرماتے ہیں کہ استغفار کی کیفیت یہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اس کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ تمام استغفار کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔ جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ہستی سے ہر کھلے میدان میں نکل جائیں اور دو رکعت نماز ادا کریں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ استغفار کے لیے صرف مومن کھنٹے ہوں کسی کافر و قریب نہ آنے دیں۔ چہرہ ہمزی اور انگاری کے ساتھ دو نفل ادا کریں۔ اس کے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمارے رحمت نازل کرے گا۔ اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔

دوسرا طریقہ بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ منبر پر تشریف فرما تھے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے اگر عرض کیا کہ حضور! جانور ہلاک ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوئیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسا دے۔ آپ نے منبر پر بیٹھے بیٹھے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا کیں نام و نشان نہ تھا۔ آپ دعا فرما رہے تھے کہ کسی کائنات سے بادل کہ ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل چل گیا۔ اور یکایک موسلا دھار باتس شروع ہوئی۔ ایک تیسرے طبقہ بھی ہے کہ کسی جی نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔ استغفار کی یہ غنا ہے۔ وہ میں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت ایسا ہی باکمی ہے۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ساری قوم محنت پریشانی کے ضرب کھیمی
۱۰۰ میں تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہمزنی سے پیش آنے لڑا آپ دعا میں مصروف ہو

گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی اپنی
 ہڈی اس پتھر پر مارو۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ جو ہڈی لاکھٹی پتھر کی مار کی فَالْفَجْرَتْ مِنْهُ
 اُثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا اس میں سے بارہ چشمے بھوٹ بڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے
 بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔

اس بابے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ دو کون سا پتھر تھا جس پر لاکھٹی مارنے سے پانی
 جاری ہو گیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ پتھر موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں موجود تھا تفسیری
 روایات کے مطابق یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے دنیا میں آیا تھا۔ اور نسل بعد نسل موسیٰ
 علیہ السلام تک پہنچا۔ تاہم کسی صحیح روایت سے ایسا ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی
 بعض روایات سے موسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اس
 زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ پڑے کا خاص خیال نہیں کرتے تھے۔ نہات وقت بھی ایک
 دوسرے کے سامنے کپڑے اتار کر نہانا شروع کر دیتے تھے۔ بر خلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام
 بڑے حیا دار تھے غسل کرتے وقت سر پوتی کا خاص خیال رکھتے اور پڑے میں نہاتے۔ دین کا
 اصول بھی یہی ہے کہ بول و براز پر غسل کرتے وقت دوسرے شخص کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔
 ایسے اوقات میں پردہ واجب ہے مگر بنی اسرائیل الٹی ذہنیت کے مالک تھے موسیٰ
 علیہ السلام کو پڑے میں غسل کرتے دیکھا تو سمجھا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے جسے چھپانا
 چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ کو اُدرہ کی بیماری لاحق ہے جس میں خیسے پھول جاتے ہیں۔
 اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی بڑے پتھر کی
 اوٹ میں اس پتھر پر کپڑے رکھ کر پڑے میں غسل فرما رہے تھے کہ وہ پتھر آپ کے کپڑوں
 سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو سخت پریشان ہوئے ثَوْبِي حَجَبٌ وَ
 ثَوْبِي حَجَبٌ یعنی پتھر میرے کپڑے۔ پتھر میرے کپڑے کہتے ہوئے۔ پتھر کے پیچھے بھاگے

اور اسی حالت میں اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگوں نے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھا مگر جسم میں کوئی عیب نہ پایا تو کہنے لگے مَا بِمُوسَىٰ مِنْ بَأْسٍ لِّعِزِّ رَبِّهِ لَئِنْ رَاٰهُ لَيَحْطَبُنَّہُ۔ ہم تو غلط سمجھ رہے تھے۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام اس بھاگتے ہوئے پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اپنی جلالی طبیعت کے مطابق اس پتھر کو اپنے ڈنڈے سے خوب چٹا جس کی وجہ سے اس پتھر پر لاٹھی کے پانچ سات نشان پڑ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ بڑا مبارک پتھر ہے۔ ایک طرف اس نے میرے حکم کی تعمیل کی کہ کپڑے لے کر بھاگ نکلا اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اتنا نرم ہو گیا کہ اس پر لاٹھی کے نشان پڑ گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر کو اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ کہتے ہیں۔ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے پانی طلب کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی پتھر پر لاٹھی ماری۔ بارہ چشمے بھوٹ پڑے۔ بہر حال یہ تفسیری روایات میں کسی آیت یا صحیح حدیث سے ثابت نہیں

بعض تاریخی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وادی حوریب میں جو پہاڑی سلسلہ اور چٹانیں ہیں۔ وہیں زمین پر پڑی ہوئی ایک چٹان پر موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری تھی۔ اور اس میں سے پانی برآمد ہوا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس پتھر میں اب پانی تو نہیں ہے۔ مگر پانی کے نکلنے کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سوراخوں سے کسی وقت پانی نکلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانی بنی اسرائیل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکالا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو وہ بھی ختم ہو گیا۔

پانی کے بارہ چشمے بھوٹنے کی حکمت یہ تھی کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ

پانی کی
تقسیم

نے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چٹمہ مقرر کر دیا۔ چٹموں کا تخمین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چٹمہ مقرر ہوا۔ اور چھوٹے قبیلے کے لیے چھوٹا چٹمہ۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کر دیا گیا۔ فرمایا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سِرِّمَکَیْنِ اِنَّا اِنَّا کُنَّا نَکَیْنِ مَعْمُوْمَکَیْنِ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے میں ایک ایک چٹمہ تقسیم کر دیا۔ ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نمایاں کھجور لیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مشرکہ مفاد کی اشیاء کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہیے۔ تاکہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صامع حیدر سلمیٰ کی اونٹنی دسے معاملہ میں بھی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ لَکَہُ شَرِبَ یَوْمَ مَعْلُوْمٍ۔ قوم صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز تمہاری باہری سوگی۔ اور ایک روز اونٹنی کی۔ قوم نے مقررہ حد سے تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔

ایک اعتراض اور
اس جواب

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی کیسے آیا۔ یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی چیزوں کو اپنی ناقص عقل سے قیاس کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کام ناقص العقل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان ، ریاضی دان ، جغرافیہ دان سب کے سب ناقص العقل ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت یا تخلیق کی کوئی خبر نہیں۔ وہ تو محض اپنی دھند میں مگن رہتے ہیں۔

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کون سی بعید العقل بات ہے۔ یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے۔ مقناطیس بھی ایک پتھری ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی پتھر میں پانی کو اپنی طرف کھینچنے کی تاثیر پیدا کر دے۔ تو یہ کون سی ایسی بات ہے جو عقل میں نہ آتی ہو۔ ہاں سرسید کو کچھ میں آ سکی۔ پانی تو پتھر کے نیچے موجود تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو ذرا سا ہلا دیا تو پانی کو دھڑا سرسید بیچارہ تو بچھریٹ کماہم تھا۔ اور معجزات کا منکر تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پانی کا اجرا محض اللہ تعالیٰ

کے حکم سے ہوا۔ یہ معجزہ تھا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ بحیرہ قمرم میں کیا ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھٹی چٹائی اور بارہ راستے بن گئے۔ پانی کناروں کے ساتھ منجہ ہو کر رہ گیا۔ وہاں لاکھٹی مارنے کا حکم ہوا۔ تو پانی میں راستے بن گئے اور یہاں لاکھٹی ماری تو خشک بچتر سے پانی کے چشمے بھوت پڑے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ پانی نکان اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لاکھٹی مارنا ممتار کا کام ہے۔

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ بکورد کرنے والی معجزہ اور کرامت وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر آکر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تریبا ذن اللہ تھا۔ فرمایا وَابْرَأْنِي الرَّكْمَةَ وَالْأَبْرَصَ وَاتَّخِذِ الْمَوْتِ بِإِذْنِ اللَّهِ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادہ زاد اندھے اور ابرص کو ٹھیک کر تا ہوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات عیسیٰ طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشتے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَمَنْ جَاءَكَ مِنْهُمْ بِآيَةٍ فَسُحْرٌ أَوْ آيَةٌ كَذِبَةٌ۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جائے گا۔ ہمارے ہادی عظیم علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکالنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت علیہ السلام کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کہتے ہیں کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھا۔ راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا سبب بانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا۔

پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیالے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آد پانی پی لو اور اس سے وضو کر دو لوگوں نے پانی حاصل کیا۔ اس سے وضو کیا اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا شہر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھایا اور پانی نکھنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور علیہ السلام کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہوا جہاں سے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوا۔ صل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

برفمت پر
اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من و سلوی کا بندہ رست ہو گیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کُلُوا وَشَرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدیؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ابو و باد و مرد و خورشید و فلک در کھند تا توانی بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از ہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نہری
فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہیے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کرڈروں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے، پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشینوں سے گذر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر

زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس ملک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر انصافی کی بات ہوگی۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسرے مقام پر آتا ہے: کُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ حَلَالٍ اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں وَاشْكُرُوا لِلَّهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم مالک ہو مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ ان کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے۔ کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اُسے دیکھنا چاہیے۔ کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا تنگنا ہے۔ خاص طور پر سربراہان مملکت کا یہ فرض منصبی ہے۔ کہ اپنے اپنے ملک میں عاجمندیوں کی خبر گیری کریں۔

صیار الدین بٹنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ یا حاکم حقیقت میں وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی شخص بھوکا، تنگنا ہے۔ امور سلطنت اس طریقے پر سرانجام دینے چاہئیں کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ بے شک اعلیٰ درجے کی ضروریات نہ بھی حاصل ہو سکیں۔ تو کم از کم ادنیٰ شعبے کی توہنی چاہئیں۔ ہر شخص کے کھانے پینے، پہننے اور بننے کے لیے انتظام ہونا چاہیے۔ لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

افسوس کی بات یہ ہے۔ کہ اس زمانے میں نیکی کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے۔ جس کے پاس خداوندی الارض دولت آتی ہے وہ اسے اپنے باوا کی سمجھتا ہے۔ نہ خدا کا حق نہ رسول کا حق ورنہ انسانیت کا حق کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ مستحقین پر خرچ کرنے کی بجائے رسم و رواج پر خرچ ہوتا ہے۔ مشرکانہ افعال پر خرچ ہوتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی پر خرچ ہوتا ہے یہ ساری ناشکر گزاری کی

مات میں۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب نہیں لے گا یا اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ہر چیز کا محاسبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کھاؤ اور پو اللہ تعالیٰ کی روزی سے وَلَا تَقْتُلُوا فِي الْأَرْضِ مُضْعِدِينَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ فساد سے مراد خدا تعالیٰ کے قانون، شریعت اور دین کے خلاف چلنا ہے۔ سائے فساد کی جڑیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سکر مقام پر فرمایا: كُنُوا مَعًا فِي الْأَرْضِ حَلَّاءَ طَيِّبَانِ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ حلال اور پاک چیزیں کھاؤ مگر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ شریعت کے خلاف قدم اٹھانا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ بدعت، شرک، معصیت وغیرہ خلاف شریعت ہیں۔ اور اسی کو فساد کہا گیا ہے۔ جہاں فساد ہوگا وہاں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ نہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ نہ قانون شریعت کا احترام کر رہے ہیں۔ اسلام کا نام کتنے زور شور سے لیتے ہیں۔ مگر عمل صفر کے برابر ہے۔ البتہ ظلم و ستم کا کوئی شمار نہیں۔

اس ماہ کی ابتدائی تاریخوں کی اخباری خبر ہے۔ کسی گھر میں نوجوان لڑکی اور بچہ تھا۔ ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دو سپاہی دونوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اُس بچی کے ساتھ زیادتی کی۔ یہ تو ان سرکاری کارندوں کا حال ہے۔ جو خود دوسروں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے۔ تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجرموں کی نشاندہی ہونے کے باوجود اگر اُن تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچتا تو اس صورت میں کیا خدا تعالیٰ کا قہر نازل نہیں ہوگا۔ بہر حال اس قسم کے واقعات فساد فی الارض کے ہونے میں وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔

الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پیو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامِ رَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُخْرِجَ لَنَا مِمَّا تُنْبِئُ الْفَرَصَ مِنْ أَفْعَاهَا وَقِثَابَهَا وَفُومَهَا
وَعَدَسِيَّهَا وَبَصِلَهَا ۖ قَالَ أَتَسْبِدُونَ ۚ الْيَدِي هُوَ الَّذِي بِأَلْيَدِي
هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَآسَا لَتْهُوَ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَكْنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ
ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

ترجمہ: اور جب کہ تم نے اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم
کے کھانے پر۔ پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے وہ
چیزیں نکالے جن کو زمین اگاتی ہے۔ اپنی ترکاریوں سے اور اپنی کھجوروں سے
اور اپنے گندم سے اور اپنے سوسے اور اپنے پیاز سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا
تم بدل میں لیتے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس سے جو بہتر ہے۔ کسی شرمیں اتر
جاؤ۔ بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے مانگا۔ اور ان پر ذلت اور
مسکنت مسلط کی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لیکر لوٹے اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ
کی آیاتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بات
اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی۔ اور وہ مد سے گئے نکل جاتے تھے ﴿۶۱﴾

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل پر انعامات۔ ان کی سرکشی و تمرد اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے
قہر و غضب کا تذکرہ گذشتہ دوس سے چلا آرہا ہے۔ فرعون کے مظالم۔ بنی اسرائیل کا مصر سے
خروج۔ پھر چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگردانی۔ شام و فلسطین میں داخلہ۔ من و سلویٰ اور
پانی کی فراہمی کے تمام واقعات تفصیلاً آپ کے ہیں۔ اب اس آیت میں جس واقعہ کی طرف

اشارہ ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں ہی پیش آیا۔

غلام کے اثرات

دراصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے لکھا تھا: غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر

مقصود یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے: عَبْدًا مَّحْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ غلام مملوک کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔

بنی اسرائیل کو صحرائے کھنہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ وہاں رہ کر ان میں جفاکشی پیدا ہو۔ بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اور غلامی کے دور کی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ تاکہ یہ لوگ آئندہ زمانے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ کسی ملک کے وارث بن کر نظم و نسق چلانے کے اہل بن سکیں۔ مگر ستر سال تک یہ لوگ غلامی کے اثرات میں گرفتار رہے۔ اپنے اصلی مقام سے غافل رہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے کے باوجود ذہنی غلامی کے خول سے باہر نہ نکل سکے۔

جب پرانی نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے کروٹ لی۔ خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع حیدر السلام نبی ہوئے۔ تو ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کی نئی نسل نے شام و فلسطین کو فتح کیا۔ مَشْرِقَ الْأَمْرِ مِصْرَ وَمَغَارِبَهُمَا مَشْرِقَ الْأَمْرِ اور مغرب کے سارے علاقے اللہ تعالیٰ نے ان کو دلائیے۔

علم کی تبدیلی

ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامِهِمْ وَاجْعَلْ لَنَا مِثْلَ مَا كَانُوا يَكْمَلُونَ بنی اسرائیل اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ صحرائے سینا میں بلا مشقت من و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج پر

کے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلویٰ دو مختلف کھانے تھے مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پر پی نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی ہنریاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ اے موسیٰ علیہ السلام، فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ اَب ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔ یُخْرِجْ لَنَا کَرْمًا یَمْلَأُ ہِمَامًا تَنْبُتُ اَرْضُ مِصْرُ وہ چیزیں جن کو زمین اگاتی ہے۔ مِنْ بَقْلِہَا اپنی ترکاریوں سے وَقْتُا پھل اور اپنی لکڑیوں سے وَقْتُہَا اور اندم سے وَعْدَہَا اور اپنی مسورے وَبَصِلَہَا اور اپنے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ دیں یہ دوا یہ۔ من و سلویٰ جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے مزہ کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔

بنی اسرائیل کی اس فرمائش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش کی۔ قَالَ اور فرمایا اَتَشْبَدُ لَوْ اَلَّذِیْ هُوَ اَذِیْ بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ یَا مَایک ادنیٰ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کہتے ہو قوف ہو کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من و سلویٰ جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ اور تم ہنری ترکاری اور لہسن پیاز کے تیکھے پھر ہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مختلف من و سلویٰ سے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بھی بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر ان کے مطلوب لہسن پیاز پر تو حساب کتاب بھی ہو گا۔ یہ بھی ان کے گھٹلے کا سود تھا۔ مگر وہ اُسی پر اُسر تھے۔

کاشتکاری مشقت
طلب کا سبب

جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے

کھلایا کہ اگر تم یہ چیزیں چاہتے ہو۔ اِهْبِطُوا مِصْرَ اَوْ كُفِيَ شَرْمِ اَنْ تَرَجَاؤَ۔ وہاں جا کر کھیتی بڑی کرو۔ بل چلاؤ۔ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ فَإِنَّ لَكُمْ مَكَّ سَالَتْهُمُ اِپْسَ جَوْ كَچھ تم چاہتے ہو۔ تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔ بعض فرماتے ہیں کہ اگوش کی قرارة میں اِهْبِطُوا مِصْرَ واپس مصر چلے جاؤ۔ وہاں جا کر اُسی طرح کھیتی بڑی کرو جس طرح فرعونی کرتے تھے۔ اور بنریاں وغیرہ حاصل کر لو۔ مگر دوسری قرارة یعنی مِصْرَ ا۔ ر کی تئین کے ساتھ زیادہ رائج ہے۔ یعنی کسی شہر یا قصبے میں اتر جاؤ۔ اور کاشتکاری کرو۔ تم اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کر لو گے۔ تم ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر اس کے بدلے میں معمولی چیزیں چاہتے ہو۔ یہ چیزیں تمہیں محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوں گی۔

پیشے بجا
فضیلت

حضرت ابوامامہ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کسی گھر میں لہ کا پھل دیکھا تو فرمایا۔ یہ جہاں بھی ہو، وہاں ذلت کا دور دورہ ہوتا ہے کاشتکاری بذاتِ خود ایک مشقت طلب کام ہے۔ اس کے علاوہ دلیہ اور آبیانہ وغیرہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ شہری تنذیب سے مُد انسان بہت سی اچھی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔

کاشتکاری ایک اچھا پیشہ بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعریف بھی آئی ہے۔ اس پیشے کو فضیلت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہترین پیشہ جہاد ہے، اس کے ذمیلے حاصل ہونے والا مال پاکیزہ ترین ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر تجارت کا پیشہ ہے۔ رزق کا زیادہ تر حصہ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں ہی رکھا ہے۔ اس کے بعد کاشتکاری چھٹی یا ہٹی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص کوئی فصل کاشت کرتا ہے۔ کوئی دانہ بوتا ہے یا پودا یا درخت لگاتا ہے۔ اس کے پھل میں سے اگر کوئی جائزہ وغیرہ کھائے گا۔ تو بونے والے کو صدقے کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کاشتکاری کو یہ فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح فرمایا چوتھے نمبر پر صنعت و حرفت کا پیشہ ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے مختلف پیشوں کی یہ درجہ بندی ہے۔

یہودیوں کی
ذلت و برائی

بنی اسرائیل کے جتنے بھی واقعات ذکر کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اسی ترتیب سے

ساتھ واقع ہوئے ہوں جس ترتیب کے ساتھ انہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا بیان محض عبرت اور تنبیہ کے لیے ہے۔ کہ نوع انسانی ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ ان کے ضمن میں یہودیوں کو بار بار خطاب کیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ان سے عبرت حاصل کرو۔ اور ایسی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ انکی انہی نافرمانیوں کی وجہ سے وَضُیَّتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔ مسکنت مال کی کمی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذلت و رسوائی کی لعنت اُن پر اس وقت مسلط کی گئی جب وہ بحیثیت قوم عادی مجرم بن گئے۔

یہ عام مشہور بات ہے۔ کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم میں مگر یہ درست نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ درنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ سو وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔

حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک در بدر رہے پھر پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جرمی دے ان کے دشمن۔ اٹلی و لے ان کے دشمن۔ یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آج اعتراض ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دعوئے تھا کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پائے میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِنَ النَّاسِ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ

سے۔ ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت اُن کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تویہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس وغیرہ کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کو نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہتھ اٹھائے تو یہودی سلطنت دردن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے۔ وَبَاءُ وَيَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مذابجی لے کر لوٹے۔

آیات الہی
کا انکار

فرمایا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ بنی اسرائیل کی ذلت و سوائی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بستی ہے۔ ابیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إِنِّ جَاءْتُكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ" جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت بستی ہے گی اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ جو کفر کی حالت میں مر گیا اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ ان پر اللہ تعالیٰ۔ اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت مسلط ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکراتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام
کا قتل

بنی اسرائیل پر لعنت مسلط ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وَلَقَدْ تَلَّوْنَ النِّبَاتِ بِفَسَادٍ الْخَفِيِّ کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں متا ہے کہ انہوں نے یرمیا بنی شعیان بنی حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر سینکڑوں نبیوں کو قتل کیا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں خدا تعالیٰ کے تین سو انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ایسا کرنے

سے منع کیا اور انہیں طعن و ملامت کی تو ان کو بھی شہید کر دیا گیا۔ یہ قوم اس قسم کی عادی مجرم بن چکی تھی جس کی وجہ سے یہ مغضوب اور ملعون ٹھہری۔

یہاں پر بفسیر الحق پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نبیوں کے ناحق قتل کا کیا مطلب ہے؟ جب کہ نبی کا قتل تو بلاشبہ ناحق ہی ہو گا۔ نبی کا قتل برحق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مفسرین کرام اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں پر ناحق کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قاتل خود سمجھتے تھے کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سخت عذاب روز قیامت اس شخص کو ہو گا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو گا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو گا۔ دونوں قسم کے اشخاص سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔ امیہ بن خلف کی مثال موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنے نبیوں سے اس ملعون کو رہا تھا بشرطین مکہ میں سے یہ بڑا خزانہ قسم کا کاڑھ تھا؟

ناؤمانی اور
سے بجاوڑ

مغرض! سابقہ بنی اسرائیل کی خرابیاں اور ان کی سزائیں بیان کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ۔ خدا کا آخری نبی آگیا ہے۔ اٰمَنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ جو کچھ میں نے نازل کیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ۔ معافی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اپنے اخلاق و اعمال درست کر لو۔ تو تم آج بھی عروج حاصل کر سکتے ہو۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت مسلط کر دی گئی۔ انکار آیات اور قتل انبیاء کے بعد تیسری وجہ یہ بیان فرمائی۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ عصیان کا معنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا ہے۔ وہ لوگ حقوق اللہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ کَاذِبُوْا يَعْتَدُوْنَ کہ وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ تعدی کا معنی انسانوں کی جانوں اور مالوں کا تلف کرنا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذوق ہی بدل چکا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحیح مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیکی اور

لہ ابو السعود ص ۸۵، مارک ص ۵۲، مظہری ص ۶۶

۲۷ منہ احمد ص ۴۰، ابن کثیر ص ۱۰۳، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۶

بدی میں تمیز کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ذَسَرْتُكَ حَسَنًا وَسَاءَ ثَلَاثٌ سَيِّئَاتٌ جب تمہاری نیکی تمہیں پس منگے۔ اور بُرائی سے نفرت ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیکی اور بدی میں تمیز نہ ہوتی تو سمجھ لو کہ تمہیں روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

اس کی مثال انسانی جسم کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جب آدمی تندرست ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ درست ہوتا ہے۔ اسے میٹھی چیز میٹھی لگتی ہے۔ اور کڑوی چیز کڑوی لگتی ہے مگر جب جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے۔ تو وہ صحیح مومن ہے۔ ورنہ وہ بیمار ہے۔

بنی اسرائیل کے لوگ بیمار تھے۔ وہ تعدی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پاس رکھتے تھے۔ اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال کرنے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے معصوم نبیوں کو قتل کیا جو خدا تعالیٰ کی رحمت اور انسانوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی، اس کے احکام کو حیلوں، باتوں یا تادیبوں کے ذریعے ٹھکرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی برائیوں کی تفصیلات سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور مادہ وغیرہ میں آرہی ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ کہیں تم بھی اسی قسم کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جانا، وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ، تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا۔ کہ ہم نے سنا لیا۔ حالانکہ وہ انکار ہی کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی روش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی ہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالْمَسَائِكِينَ كَانُوا
أَمَّنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلُوا صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: جو لوگ مسلمان ہوئے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے

اور صابی، جو شخص بھی ایمان لایا — اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر

اور اپنے کام کی۔ پس ان کے لیے ان کا اجر ہے۔ ان کے رب کے پاس اور ان پر

کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

اس سے پہلے آیات میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں، فساد فی الارض، اس کے نتیجے میں ان
پر سزا جانے والی ذلت اور مسکنت کا ذکر تھا۔ آیت زیر درس کے بعد بنی اسرائیل کی یکے بعد دیگرے
خرابیوں کا ذکر ہوگا۔ اس درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتا دیا ہے۔ جس کی پابندی
انتخاب کر کے اور جس پر عمل پیرا ہو کر ان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کسی خاص فرقے
یا گروہ کے لیے نجات مختص نہیں کرتا۔ بلکہ جو بھی شخص اس میں دیے گئے اصول کی پابندی کرے
گا۔ وہ نجات پا جائے گا۔ خواہ وہ کسی خاندان کسی نسل یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اصل
بنی اسرائیل کے نسبى تفاخر اور مذہبی فوجیت کی تردید ہے۔ جس میں وہ مبتلا تھے۔ اور اسی نام
بزدلی کی وجہ سے اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مؤمنین، یہود، نصاریٰ اور صابین
کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورۃ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزول قرآن کے
وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین، یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت
مولانا شیخ السند، اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت

کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ زبرد پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

اس آیت میں جن مذاہب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست اہل ایمان ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **اِنَّ الْكَافِرِيْنَ اَمْسُوْا بِكُمْ شَكٌّ** وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان ہوئے صرف اَمْسُوْا میں وہ تمام لوگ آجیتے ہیں جو بظاہر ایمان لے آئے۔ اور ان میں منافقین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اور پھر آپ کی اطاعت کا دعویٰ بھی کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اَمْسُوْا کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں اَمْسُوْا سے مراد وہ اہل ایمان ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر۔ اس کے رسولوں پر اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس خطاب کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ محض زبانی دعوئے ایمان سے نجات ممکن نہیں ہے۔

اہل ایمان

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے۔ یہاں پر مطلقاً یہودی نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا جو یہودی ہوئے۔ اس میں امتیاز یہ ہے۔ کہ یہودی ایک نسلی مذہب ہے یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہودی وہ ہیں جو نسلی طور پر بنی اسرائیل ہیں۔ اور یہودی ہونے سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ نسلی طور پر یہودی نہیں ہیں مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔ نزول قرآن کے وقت مدینہ کے گرد دناج میں بنی قریظہ ایسے قابل تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دُور یا اس سے بھی پہلے جب بڑے بڑے حوادث پیش آئے۔ تو یہ لوگ اپنے اس وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے قلعے اور آبادیاں تھیں یہ لوگ صاحبِ علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اصل یہودی تھے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اصل عربی النسل تھے۔ مگر یہودیوں سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں کے

ہَادُوْا
کا مضموم

متعلق کسا گیا ہے کہ جو یہودی ہوئے۔

یہودیوں کو یہود کہنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ بہترین کلام فرماتے ہیں کہ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یودا کے نام پر ہے۔ اس نام کی دوسری توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سورۃ اعراف میں آیت "رَبَّنَا هَذَا إِلَهُكَ هَادٍ هُوَذَا لَاحِقُنِي" ہوتا ہے۔ رجوع کرنا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا دعائہ کلمہ ہے۔ جب بنی اسرائیل نے سخت گستاخی کی۔ اور کہا کہ ہم ہرگز اس کتاب کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہم سے ہم کلام ہو کر اس کتاب کی تصدیق نہ کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے سر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ پور کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر بجلی کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ سر آدمی ہلک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سخت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کہ مولا کریم! میں قوم کو جا کر کیا بتاؤں گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی وہاں لے جا کر مروا دیے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اور عرض کیا تھا: اِنَّا هَذَا إِلَهُكَ اے مولا کریم! ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ تو بعض فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود کا لقب اس ہَذَا کے لئے دیا گیا تھا۔

اس وقت پوری دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ برخلاف اس کے نصاریٰ کم و بیش دو ارب کی تعداد میں ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر کاربند کہتے ہیں۔ مگر ان میں ابتداء کے زمانہ ہی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ بعد میں یہ عادی مجرم بن گئے۔ عصبیان ان کی رشتہ میں داخل ہو گیا۔ اور یہ لوگ حقوق العباد کو ضائع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انبار علیہم السلام کو قتل کیا۔ یہ لوگ اپنے آباء اجداد کے شنیع افعال پر نادم ہونے کی بجائے۔ ان پر فخر کرتے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ اُن کے عبادت اعمال اور اخلاق میں بے شمار قبائح پیدا ہو چکے تھے۔ اور آج تک موجود ہیں۔

یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانی صورت کے معتقد ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو جسمانیت سے متبرک سمجھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی ہے۔ اس جسم کو وہ مثالی اور نورانی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جسمانیت شعاع کی طرح ہے۔ جو پھیل جاتی ہے۔ اور سکڑ جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے رویت الہی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لَنْ نُوْثِقَ لَكَ حَتّٰی نَرٰی اللّٰہَ جَهْدًا ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر گریہ، ہنسی، حزن اور غم کا بھی اطلاق کرتے ہیں۔

یہودی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی بڑی بدگمانی رکھتے ہیں۔ بلکہ ان پر ہمتیں لگاتے ہیں۔ تورات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر کیا کیا بدنامیوں سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہمت لگائی۔ کہ آپ ہارون علیہ السلام سے حد کرتے تھے اس لیے آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا۔ (العیاذ باللہ) حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں سفارشی تھے کہ "وَأَشْرِكُهُ فِي آمْرِی" (۳۲) کی "نَبِّحَكَ بِمَا أَنَا بِكَ وَرَدِّكَ" میرے بھائی کو میرے ساتھ تبلیغ میں شریک فرما۔ آپ نے یہی تودعا کی تھی۔ "هُوَ أَفْضَحُ مِنِّي لِسَانًا" وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ اے اللہ میری زبان میں شکست ہے۔ "رَدَا يَصْدِقُنِي" اے میرا معاون بنائے جو میری تصدیق کرے۔ کہیں فرمایا اے میرا وزیر بنائے۔ ہم مل کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "أَوْثَقْتُ سُوْفًا يَمُوسٰی" اے موسیٰ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے مگر یہ بد بخت یہودی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔

یہودیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے بلکہ دلی مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی تو محض اطمینان ہوتا ہے۔ مگر دلی نبی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تقرب الی اللہ کا وہ زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔

ان بد بختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سونے کا بکھڑا خود حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا یا انہوں نے بنانے کا مشورہ دیا تھا (العیاذ باللہ) اسی طرح انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے اپنے کمانڈر انچیف اور یا کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو گھر میں رکھا (العیاذ باللہ) انہیں لوگوں نے سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا کہ یہ جادوگر اور طلسمات کا ماہر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے بارے میں بہت بڑا جھوٹ ہے۔

یہودی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت رافضی ہے جو کبھی فروغ نہیں ہوگی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اور انہو دجال تک کہ۔ ان بد بختوں نے ان کے منہ پر تھوکا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر زنا کی تہمت انہی ظالموں نے لگائی۔ (العیاذ باللہ) یہودیوں کی یہ اخلاقی بد عقیدگی اور ان کی بڑی خصلتوں کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں تفاسیر میں ملتی ہیں۔ اور بعض تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

نصاری کی وجہ تسمیہ

مومنین اور یہود کے تذکرہ کے بعد تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا: وَالنَّصَارَىٰ اور نصاریٰ جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لفظ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ اور نصرت کے معنی مدد کرنے کے ہوتے ہیں۔ مسخرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے: مَنْ أَنْصَارِیْ إِلَى اللَّهِ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کون میرا مددگار ثابت ہوگا۔ قَالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں چنانچہ اسی لفظ سے ان کو نصاریٰ کا نام دیا گیا۔ یعنی نصرت کرنے والے۔ مدد کرنے والے جنہوں نے مسخرین کرام فرماتے ہیں کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے۔ اس بستی کا نام

۱۔ تفسیر عزیزی قدسی ص ۲۶۸، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۸، ۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۱

۴۔ معالم السنن ص ۳۱۱، ۵۔ در مشورہ ص ۴۵

نامصرہ تھا۔ چنانچہ اس بستی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کے لقب سے طعن کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مدینہ کی نسبت کر کے منی کہا جاتا ہے۔ یا کسی کو مکی یا شامی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نصاری کے
عقائد باطلہ

نصاری بھی عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ بالکل جڑا چکا ہے۔ نجات کل کے مسیحی پولس نامی ایک شخص کے بگاڑے ہوئے ہیں۔ یہ شخص مسیحیت کا مبلغ تھا۔ اس نے دین مسیحی کا بالکل حلیہ بگاڑ دیا۔ پولس نے بھی عیسائیت کو اس طرح خراب کیا جس طرح عمر بن لُحی نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا تھا۔ عرب اقوام تقریباً دو ہزار سال تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مذہب پر قائم رہے۔ اتنے عرصہ تک یہ توحید پرست رہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اس شخص نے عربوں میں بت پرستی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نازل قرآن کے وقت سارے عرب شرک میں غرق ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

پولس نے مسیحیت کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول مانتے والے لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اور تثلیث کا مسئلہ ان میں رواج پا گیا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آ رہا ہے کہ انہوں نے "إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" کا عقیدہ بنالید اور اس طرح گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے چار گروہ بنالیے۔ مگر اس وقت کے کچھ تو تک اور پروٹسٹنٹ دونوں گروہ شرک میں۔ دونوں میں سے کوئی بھی توحید پر قائم نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا یا ابن اللہ کہا۔ انہوں نے یہ عقیدہ بھی قائم کر لیا کہ خدا عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ یہودیوں نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کچھڑے میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح کا باطل عقیدہ عیسائیوں نے وضع کر دیا۔

سیّد علی ہجویری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مردود ہیں۔ اور باقی دس فرقے مقبول ہیں۔ دو مردود فرقے یہی حلول

دائے فرقے ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی اسی لوگوں کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بندے کے اندر داخل ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) تو بہ حال یہ لوگ بھی اس قسم کی بدعتیہ کی کاشہ ہو چکے ہیں وَالصَّابِغِیْنِ اور صابی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صابی کا عام فہم معنی بے دین ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے تو اسے صابی کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عرب کے مشرکین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔ یعنی انہوں نے پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے تاہم اس مقام پر جس صابی فرقہ کا تذکرہ ہے۔ مفسرین نے اس کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرقہ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ نیک نیتی اور سعادت حاصل کرنے کے لیے انسان کسی نبی کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ روحانیات اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں سے انسان فیض حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے سیکل بناتے ہیں۔ مثلاً آفتاب، مہتاب، ستاروں اور ملائکہ کے نام کے سیکل بناتے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ قبلہ کی طرف منکر کے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کو سجدہ جلاتے ہیں۔ اور انہیں قبلہ تصور کرتے ہیں۔

اس فرقہ کے متعلق یہ بھی بھلبھ ہے کہ یہ تین نمازیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں صابیوں کے صابیوں کے عقائد جانشین پروردی اور چکرا لوی ہیں۔ چکرا لوی بھی تین نمازوں کے قائل ہیں۔ ان کے بعض لوگ دو نمازیں پڑھتے ہیں اور بعض صرف ایک۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں اسی طرح پروردی کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ نماز کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحیح نماز وہ ہوگی جو حکومت معزز کرے گی۔

صابیوں کی اور بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کو کوئی شخص ہاتھ لگا دے۔ تو اس کے لیے غسل ضروری ہو جاتا ہے یہ لوگ گدھے اور کتے کے گوشت کو تو نہیں کھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اونٹ اور بچے دار جانور کے گوشت کو بھی یہودیوں کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔ یہ پیاز اور باقلا کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ مارا ہوا یا مار پھلی یعنی سانپ کی مانند پھلی بھی ان کے ہاں حرام ہے۔ یہ لوگ شراب کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں۔ مگر نئے کو حرام گردانتے

ہیں۔ طلاق کے متعلق ان کا شرعی مسئلہ یہ ہے کہ حاکم وقت کی اجازت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں ایک سے زیادہ نکاح بھی جائز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک عورت سے ہی نکاح ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے صابیوں کے مختلف بیگلروں کی شکل و صورت کا بھی تذکرہ کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ علتِ اولیٰ (FIRST CAUSE) یعنی تخلیق پر بھی بیکل بندتے ہیں۔ عقل کا بیکل الگ ہوتا ہے۔ سیاست کا الگ۔ اسی طرح صورت کا بیکل بندتے ہیں۔ اور پھر نفس کا بیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل سیارے کا بیکل مدس شکل کا ہوتا ہے۔ اور مشتری کا بیکل مثلث شکل کا۔ آفتاب کا بیکل مربع شکل کا ہوتا ہے۔ اور مہتاب کا بیکل مٹمن یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ قیامت کا باکل انکار کرتے ہیں۔ اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس سال کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر برزی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آئندہ نسل ملتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے گا۔ اس کے بعد یہ تباہی کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ علیٰ ذہن القیاس۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گندی ہے اس کامرکز بابل شہر تھا۔ جو کہ کم و بیش ایک سویل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے قریباً ستر یا سویل دور تھا۔ اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا۔ وہ ختم ہوئی ہو تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ انہیں کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ وہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام و فلسطین کو مرکز بنایا۔ پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ تو صابیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور روحانیت کے قائل تھے۔ اور ان کو قبلہ بنا کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے

صیغی بقا صبا

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے مذہب ہیں۔ ایک صیغی اور دوسرا صبا۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صبا دور تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دور صیغیت شروع ہو چکا ہے اب صیغیت کی آگے تین شاخیں ہیں۔ یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں۔ باقی دونوں گروہ اصل دین سے ہٹ چکے ہیں۔

دور ابراہیمی سے پہلے جو صبا گروہ تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے آگے اس کی بھی تین شاخیں ہیں۔ یعنی مجوس، برہمن اور بدھ، مجوسیوں کو زیادہ تر عروج ایران میں ہوا۔ وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ایران بعہد ساسانیوں میں موجود ہے کہ مجوس کی بھی دو قومیں ہیں ایک کا نام ایرج ہے۔ اور دوسری کا طور۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے دو بیٹے ایرج اور طور تھے۔ انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔ مجوسی بھی دراصل اہل کتاب تھے۔ مگر بندوں کی طرح انہوں نے بھی مذہب کو بگاڑ دیا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مجوسیوں کے کسی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا۔ اور پھر اسے جائز قرار دینے کے لیے وقت کے علماء کو ساتھ ملا دیا۔ خود غرض مفتیوں اور عالموں نے بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیا کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تو بہن کے ساتھ نکاح جائز تھا۔ گویا مجوسیت میں اس قسم کی بے حیائی بھی روا تھی حتیٰ کہ ماں کے ساتھ نکاح بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے۔ جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے بدھ ہیں۔ جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔ یہ سب کی سب صبا امتیں ہیں۔

ایمان بار

ان چار گروہوں یعنی اہل ایمان، یہود، نصاریٰ اور صبا کا تذکرہ کر کے اب وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ تو فرمایا ان چاروں گروہوں میں سے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ یعنی کوئی شخص کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا بڑا کافر اور مجرم ہو۔ بدترین قسم کا ظالم ہو۔ اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ اور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا۔ تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور وہ نجات حاصل کر لے گا۔ ایمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ اس کی صفات ۱۰ اس کی تقدیر وحدانیت ۱۰ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو۔ کہ خدا بنی نہیں بھیجتا یا حکم جاری نہیں کرتا۔ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مر گیا۔ تو وہ جہنمی ہے۔ بنی بھیجتا۔ حکم جاری کرنا۔ شریعت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا انکار بھی دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض پہنچانے والی مخلوق ہے۔ یہ لطیف اجسام والی نورانی پاک اور منزہ مخلوق ہے۔ ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالآخرۃ

فرمایا ایمان حاصل کرنے کا دوسرا قانون ایمان بالآخرۃ ہے۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہ وہی دن ہے جو اس جہان کا آخری دن (LAST DAY OF THIS WORLD) ہو گا۔ پچیس ہزار سال کے اس دن میں تمام انسانوں کا حساب کتاب ہو گا۔ اور اس کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ گویا قیامت کے دن کو ماننا بھی آنا ہی لازم ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ جو شخص روزِ جزا کا انکار کرے گا۔ وہ بھی کفر میں داخل ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے بعد تیسرا قانون وَعَمِلْ صَالِحًا ہے۔ یعنی نجات کا حق دار وہ شخص ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیتا ہو۔ مجددِ ملت ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ہیں۔ ہتھائے کرام البتہ جہاد کو بھی بنیادی اعمال میں شمار کرتے ہیں۔ تو جو لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ان بنیادی اعمال کو بھی انجام دیں گے۔ ان کے متعلق فرمایا فَذَرُوا حَبْرَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کو ان کے رب کے پاس بلے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا وَرَاحُونَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ان پرستقبل میں کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ سابعہ اعمال

پر غمگین ہوں گے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ مگر یہ طبعی اور عارضی ہوگا۔ بالآخر وہ ہر قسم کے خوف سے بچ جائیں گے۔ بعض اوقات دنیا میں بھی بعض نیک لوگوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ ملال و حزن سے دوچار ہوتے ہیں مگر یہ عارضی چیز ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے ایسے لوگوں کو خوف نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ خسرو اسے دن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ بڑے دن کی گھبراہٹ بھی انہیں خوفزدہ نہیں کرے گی۔ اللہ ان کے دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ رَتَّلَتْهُمْ الْمَلَائِكَةُ فرشتے ملاقات کریں گے تو انہیں تسلی دیں گے۔ کہ گھبراہٹ اب تمہارے لیے امن ہی امن ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی خوف نہیں ہوگا۔ کہ ہم سے کسی وقت کوئی نعمت چھین جائے گی۔ یا کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ لوگ دنیا میں انجام دیے گئے اپنے کسی عمل پر بھی غمگین نہیں ہوں گے۔

الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہو یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے مگر نجات کا دار و مدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتلادیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آ رہی ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ
بِقُوَّةٍ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ لَوَّيْتُمْ مِمَّنْ بَدَّ
ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٦٤﴾

تم جبرہ بن اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ اور ہم نے تمہارے
اوپر طور کو بلند کیا۔ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور یاد کرو جو کچھ اس میں
ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور

اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے ﴿۶۴﴾

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ہی ذکر ہے۔ اس سے پچھلی آیت میں قانون
نجات کی تفصیل بیان کی گئی تھی کہ نجات کسی خاص فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا
دارومدار ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ آیات ذریعہ درس میں بنی اسرائیل کی توجہ
اس واقعہ کی طرف دلائی جا رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کتاب میں
تمہیں دے رہا ہوں اس کے احکام کی پابندی کرو گے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہ احکام تو بڑے مشکل
ہیں ہم سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے سروں پر کوہ طہ
کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ اس واقعہ کو یاد کرو جب
ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔

بنی اسرائیل
کا عہد

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات حاصل ہو گئی۔ فرعون اور
اس کے تمام لشکر ہلاک ہو گئے۔ تو بنی اسرائیل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ ہمارے
لیے کوئی شریعت مقرر کرو۔ جس کی ہم پابندی کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

تورات عطا فرمائی۔ مگر وہ طرح عرض کے بیٹے بہانوں سے اس کے احکام کو ماننے کی کوشش کرنے لگے۔ اور انہوں نے تورات کے منزل من اللہ ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور اعتراض یہ کیا کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے کیلئے تیار نہیں جب تک خود اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق نہ کرے۔ کہ یہ اس کی عطا کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام شراذیموں کو لے کر کوہ طور پر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ مگر اس کے باوجود گستاخی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی نہ بجلی آئی اور سب کو خاکستر کر گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندگی عطا کی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود طور سے واپس آنے والے لوگوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اس کے تمام احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس قدر ممکن ہو اس پر عمل کرنا اور باقی کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا۔ کہ تورات کے جملہ احکام تو بہت مشکل ہیں۔ لہذا ہمیں ساری تورات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہوں نے عریح احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اس کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا جیسا کہ ارتفاع طور

الفاظ سے ظاہر ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا یہ اتنی خوفناک صورت حال تھی کہ پہاڑ کسی وقت بھی ان پر گر کر ان کو مینا چور کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پوچھا کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے یا نہیں۔ تو انہوں نے عہد کیا کہ مولا کریم! ہم سے یہ مصیبت ڈال دے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔

معجزات کے بعض منکرین رَفَعْنَا کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں۔ دو کہتے ہیں۔

کہ پیڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ بنی اسرائیل کو پیڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا
 تھا کہ پیڑ کا کچھ حصہ ان پر چھبکا ہوا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے سورۃ اعراف میں تَقْنُنَا کا واضح لفظ آتے ہے جس کا مطلب
 کھانڈ کر کھڑا کر دینا ہے اور معجزانہ طور پر الیا ہو جانا کوئی بعید بات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی نکال سکتا ہے
 عمدہ کو پیڑ کر اس میں بارہ راستے بنا سکتا ہے۔ من اور سلوی نازل کر سکتا ہے وہ اگر کسی پیڑ
 کو اٹھا کر سروں پر معلق کر دے تو کون سی بڑی بات ہے۔ بلکہ تورات میں قرۃ تفصیل بھی آتی ہے
 کہ نہ صرف پیڑ معلق ہو گیا تھا۔ بلکہ ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور آگ کے شعلے سامنے نظر آ رہے تھے
 الغرض ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ عہد لیا۔ جس کا تذکرہ اس آیت میں آتا ہے
 لغوی طور پر طور الے پیڑ پر بولا جاتا ہے۔ جو سر ہنر ہو۔ یعنی اس پر بکثرت درخت پائے
 جائیں۔ خشک پیڑ کے لیے طور کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں پر جس پیڑ کا ذکر ہے یہ وہی
 طور ہے۔ جو صحرائے سینا کے اطراف میں واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کو اللہ تعالیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی پیڑ پر آپ کو تورات ملی تھی۔

دین میں جبر نہیں

بنی اسرائیل کے سروں پر طور معلق کر کے عہد لینے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ تو جبری
 عہد ہو گیا۔ جو کہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ یعنی
 دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر یہاں پر جبر عہد کر لیا گیا۔ مفسرین کرام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بیشک
 دین میں جبر نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کو کوئی دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔
 خواہ اس کا دل ماننے یا نہ ماننے۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے۔ کہ
 تبلیغ کی جائے۔ اسلام کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ اس کے متعلق اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں۔ تو انہیں
 دور کیا جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔
 اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی زمانے میں کسی پر جبر
 نہیں کیا۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا۔ البتہ کیمونسٹوں اور عیسائیوں کی تاریخ واضح ہے۔ کہ انہوں
 نے کیسے کیسے ظلم کئے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اور بعض کو تہ تیغ کیا گیا۔

کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قلعہ جبر وادانیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون ظلمی کام تکب ہو گا۔ اس پر جبر بھی ہو گا۔ بنی اسرائیل پر پیار معلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جو عہد کیا تھا۔ اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پیار تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مہفن ہمیں بنے گا۔

اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے۔ تو سارا معاملہ ہی دہم برہم ہو جائے گا۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ جب کسی طرز کو سزا دی جائے گی۔ تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے گا۔ کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ اُسے جبر کوٹے لگائے جائے ہیں یا اُسے جبر اُقمید میں ڈالا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہو گا۔ بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔ الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبر سزا دی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ میں سلطان سلیم ترکی نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر حکم دے دیا کہ ترکی کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔ اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو اس حکم کی خبر ملی۔ تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور اس سے اس حکم کے متعلق دریافت کیا۔ سلطان نے تسلیم کیا کہ اُس نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر یہ حکم صادر کیا ہے۔ تو شیخ الاسلام نے درڑک الفاظ میں سلطان سے کہا کہ آپ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر آپ غیر مسلموں پر جبر کر رہے ہیں کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ سلطان بات کو سمجھ گیا اور اپنا حکم واپس لے لیا یہ تاریخی واقعہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور انہوں نے اس کی پابندی کا اقرار کیا تو اہتماماً بالکتاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِتَوَّاهٍ جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ اُسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ اہتماماً بالکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اسے تسلیم کرو۔ اس پر ایمان رو۔ اور پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں: یہ پوری کوشش اور جانفشانی کے ساتھ اس کا

پڑھنا پڑھانا۔ لیکن سچا۔ اس میں مندرج قوانین کی پابندی کرنا انسان کی ترقی اور خطیرۃ القدس کا مجہ بننے اور علیتین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ غرض کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب مضبوط ہاتھوں سے پکڑنا نہیں۔ بلکہ اس کے قوانین پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کرنا ہے۔ محض خالی خالی وعدوں سے کام نہیں بنے گا۔

قوانین کی پابندی

استمک بالکتاب کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا وَ اذْکُرْ دَاۤءِمًا فِیْہِ اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ یعنی اس کو پڑھتے پڑھتے رہو۔ یہ قرآن پاک قانون خداوندی ہے۔ سنت رسول اس کی شرح ہے۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں۔ جو قرآن و سنت سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجائی جا رہی ہے۔ کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اُسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشریح کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دینی حکومت کے قانون کی تشریح ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ حاکم وقت کو اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہونا چاہیے۔ جیسے کوئی باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ ایک باپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ ہر شریف النفس باپ ایسا ہی چاہے گا۔ بلکہ باپ تو یہ پند کرے گا۔ کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ ترقی کرے۔ اسی طرح حاکم کو بھی اپنی رعایا کی تربیت اور ادب کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اور اپنے قانون کی خوب تشریح کرنی چاہیے۔ تاکہ رعایا کا کوئی فرد اس سے نادان نہ رہے۔ اور قانون پر عمل پیرا ہو جائے۔ اب اگر حاکم خود اپنے قانون کی پابندی کرے گا۔ تو رعایا بھی اس پر کاربند ہوگی۔ اور اگر وہ خود پابندی نہیں کرتا تو وہ دوسروں سے کیسے پابندی کروائے گا۔ جو شخص خود فاسق و فاجر اور بدکار ہے وہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا کیا درس دے گا۔ جو خود جوار کھیتا ہے۔ وہ دوسرے جوار یوں کیسے سزا دے گا۔ شرابی حاکم شرابیوں سے کیسے

نہیں گا۔ لہذا ضروری ہے کہ حاکم پہلے خود قانون کی پابندی کرے اور پھر دوسروں کے سختی کے ساتھ پابندی کروائے۔ اس کے بعد جو کوئی قانون شکنی کرے اسے سخت ترین سزائے فرمایا وَإِذْ كُنَّا فِيهِ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اور اس کے پڑھنے کے لیے وسائل بھی مہیا کرو۔ مدرسے قائم کرو۔ معلم مقرر کرو تا کہ ہر خاص و عام اس کی تعلیمات سے مستفید ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہیے کہ ہمارا قانون بہترین قانون ہے۔ اس دستور سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستور نہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں تمام شریف ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ غور کریں گے تو اسلام سے بہتر کوئی قانون نہیں پائیں گے۔ لہذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جس طرح میں نے اس دستور کو قبول کر لیا ہے۔ آؤ تم بھی اسے گلے لگا لو۔ اور فلاح پا جاؤ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے۔ وَإِذْ كُنَّا فِيهِ کا یہی مطلب ہے۔

وہ کون سے جرائم ہیں۔ جو اس دنیا میں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیر دیا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ کہ زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔ مگر آج آپ کے سامنے کیا کیا واقعات پیش ہو رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور پھر انہیں ہلاک کر دینا ایک عام معمول بن چکا ہے جس سرزمین پر اس قسم کے واقعات پیش آتے ہوں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی آسکتا ہے ۱۹۱۷ء میں روس میں کیا ہوا۔ پورے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ بڑے بڑے مالداروں کو ٹانگوں سے باندھ کر کئی کئی میل تک ٹھیسٹا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں کی طرفداری کرتے تھے یہ لوگ انسانیت کے دشمن تھے۔ جس معاشرے میں اس قسم کے ظلم ہوتے ہوں اور ان کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ عنقریب دنیا کے سامنے آجائے گا۔

فرمایا جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے اسے یاد کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا لَعَلَّكُمْ تُتَّقُونَ کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اگر انسان کا عقیدہ صحیح ہو۔ قرآن پاک کو پڑھتا پڑھاتا ہے۔ ذریعہ تبلیغ انجام دیتا ہے۔ تو متقیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ اور تقویٰ ایک ایسی چیز ہے۔

جس کو اختیار کرنے سے شریعت کے احکام کی تعمیل انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک کو هُدًى لِلْمُتَّقِينَ کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

فرمایا ہے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد ثُمَّ تَوَلَّيْتُمُوفِينَ 'بَعْدَ ذَلِكَ' تم اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے۔ اسے پورا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دینا رہا۔ کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کر سؤ۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی علیہ السلام بھی آچکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایفائے عہد کرتے ہوئے 'وَامِنُوا بِهَا' انزلت مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک جو کہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے۔ جو پہلے سے تمہارے پاس ہے۔ یعنی توراہ اور دیگر کتب سماویہ۔ لہذا اب بھی موقع ہے کہ ایمان لے آؤ 'وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ' اور اس کے ساتھ اولین کفر کرنے والے نہ بنو اگر ایسا کر دو گے تو آنے والی نسلیں بھی تمہارے ہی نقش قدم پر چل کر رہِ راست سے ہٹ چکی رہیں گی۔

فرمایا اس کے باوجود فَلَا تَكُونُوا فَضْلًا لِلّٰهِ عَلَيْهِمْ كُفْرُكُمْ وَرَحْمَتُهُ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ شَيْءًا کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی لکن كُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ فوراً ہلاک ہو جاتے اور تمہیں دوبارہ موقع بھی نہ ملتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راستہ پر آ جاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سب کے لئے دن یاد کی کئی کئی۔ پس ہم نے ان کو کما کر ذیل بند بن جاؤ ﴿۶۵﴾ اور بنا دیا ہم نے اکی لوگوں کو عبرت ان کے لئے جو اس وقت موجود تھے۔ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ اور متقیوں کے لئے نصیحت بنا دیا ﴿۶۶﴾

گذشتہ آیات میں اس عہد و پیمان کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ کہ وہ تورات پر عمل پیرا ہوں گے۔ اب ان آیتوں میں خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد دلایا ہے جس میں ان نافرمانوں کو سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے سب کے دن تعدی در زیادتی کی تھی جس کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم نازل فرمایا تھا کہ اس دن کوئی شخص کوئی کام نہ کرے نہ تجارت کرے نہ زراعت کرے نہ مزدوری کرے اور نہ کوئی دوسرا کام انجام دے حتیٰ کہ گھر میں کھانے پینے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور حکم دیا کہ اس روز صرف عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔ اور ساتھ تنبیہ کر دی کہ جو کوئی سب کے روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے ہوئے۔ کوئی بار بار کرے گا۔ وہ جک ہو جائے گا۔

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی

امتوں کو ہرکا دیا۔ کہ وہ جمعہ کا دن نہ پاسکیں۔ بلکہ فیضیت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ کیونکہ جمعہ تمام الیم سے زیادہ فیضیت والا دن ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْيَهُودُ عِنْدَ اٰيَتِي يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَكْلَانِ اَوْ شَرَابٍ اَوْ غَيْرٍ مِّنْ ذَلِكَ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ سَابِقٌ لِلْغَيْرِ مِنَ الْجُمُعَةِ وَلِلْعَاقِبَةِ اَمَّا الْكَافِرُ فَاُجْرَتُهُ مُعْطَاةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ يَوْمَ الْاُثْنَيْنِ وَلَا يَوْمَ السَّبْتِ وَلَا تَذْكُرُوا يَوْمَكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُكْفَرُونَ۔ اس کے بعد یعنی التوار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار سے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب نہ کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدس میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے متبرک دن سمجھا گیا۔

یہودی قانون
شکنی

جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر کیا تھا اور اس روز دیگر ہر قسم کے کام کی ممانعت کر دی تھی۔ مگر یہود نے اس حکم کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اس خلاف ورزی کی تفصیل قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر آئی ہے۔ تاہم سورۃ اعراف میں ایک پورا رکوع اسی موضوع پر ہے۔ وہاں پر ہفتے کے روز تعدی کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ بکھرے قلمزم کے کنائے واقع بستی میں بستے تھے۔ توراۃ کے مطابق اسی بستی کا نام ایلہ تھا۔ جسے آج کل عتبتہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساعلی لوگ تھے۔ ان کا پیشہ عام طور پر ماہی گیری تھا۔ تاہم انہیں ہفتہ کے علاوہ باقی چھ دنوں میں مچھلیاں پکڑنے کی عام اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا اسمحان لینا چاہا۔ کہ یہ لوگ کس حد تک میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ لوگوں نے مشاہدہ کیا۔ کہ ہفتہ کے روز بہت زیادہ مچھلیاں نظر آتی تھیں۔ جب کہ باقی دنوں میں خال خال ہی پکڑی جاتی تھیں۔ تو انہوں نے زیادہ تعداد میں مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی۔ کہ سمندر کے کنائے حوض بنائے۔ جن میں ہفتے کے روز سمندر کا پانی چھوڑ دیتے۔ جب بہت سی مچھلیاں ان حوضوں میں جمع ہو جاتیں۔ تو پیچھے بند لگا دیتے تاکہ یہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہفتہ کے روز واقعہ مچھلیوں کو نہ پکڑتے بلکہ انہیں حوض میں جمع کر کے اگلے روز یعنی التوار کو پکڑ لیتے۔ گویا اس طرح وہ حیلہ سازی سے احکام الہی کی خلاف ورزی کرتے جب ان سے کہا جاتا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے روز مچھلیاں پکڑنے سے منع کر

رکھا ہے۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم ہفتے کے روز شکار نہیں کرتے بلکہ اگلے روز کرتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

شاہ عبدالغیر نے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہی حیلہ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ تو انہوں نے لوگوں کو کھیتی سے منع کیا اور بتایا کہ اس روز شکار کرنا حرام ہے۔ یہ حیلہ سازی بہت بُری بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام تو ہم اپنے اباؤ بعد سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے کہ جس چیز کو تم شرک بتاتے ہو۔ یہ کام تو ہم نسا بعد نسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر یہ واقعی بُرائی کا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ بند کر دیتا۔ چونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہذا یہ کوئی بُرا کام نہیں۔

الغرض! حضرت داؤد علیہ السلام نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور برائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہ کی۔ کہ اگر تم اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ قرآن کے مضامین میں صاعین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکنا بھی نہ تھا۔ آگے قرآن پاک میں آتا ہے کہ یہ گروہ برائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا "مَعَذْرَةَ إِلَىٰ رَبِّكَمْ وَعَلَيْهِمْ يَتَّقُونَ" کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے مذراہ کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا ہوتا۔ کہ تم نے انہیں برائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہو گا۔ قیامت کے روز مذمت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

لوگوں تک پہنچائیں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہِ راست پر آجائے
 اسی واسطے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے: **لَمَّا كَرِهَ جِبْرِائِيلُ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم** نے حضرت علیؓ
 کو مہذبہ اخطا کیا اور جہاد کے لیے روانہ کیا تو فرمایا: **لَا تَقْدِمِی اللہُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرًا لِّكَ**
مِنْ اَنْ تَكُوْنَ لَكَ حُمْرَ النَّعَمِ اگر ایک آدمی نے بھی تمہاری وجہ سے ایمان
 قبول کر لیا۔ تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی بہتر ہو گا۔ جہاد کا اصل مقصد
 جنگ و جدال نہیں بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کو مٹانا اور درندہ صفت لوگوں کو راستے سے ہٹانا ہے
 وقت گزرتا گیا۔ اور یہ قینوں گروہ اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار صالحین نے سوچا
 کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک گزار کریں گے۔ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔
 کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ہم بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے
 باقی دو گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں منتقل ہو گئے۔ ان دونوں
 علاقوں کے درمیان دیوار یا کوئی اور آڑ تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔
 البتہ ایک دوسرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

انسان بندہ
 بن گئے

ایک دن ایسا ہوا کہ صالحین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی۔ اور
 نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے جھانک کر دیکھا۔
 تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا **فَقُلْتُ لَهُمْ كُوْنُوا قِرْدَةً خَاسِیْنِ** پس ہم نے کہا کہ تم سب
 ذیل بندہ بن جاؤ۔ چنانچہ صالحین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے بڑے خنزیروں کی شکل میں اور
 نوجوان طبقہ بندروں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ غلیں تبدیل ہو چکی ہیں مگر شور باقی ہے۔ اپنے
 کیے پر نام ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے فلاں رشتہ دار
 ہیں۔ اور یہ فلاں رشتہ دار ہیں۔ اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے، ہم دوسرے مقام خنزیر بھی آتا
 ہے۔ **فَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرْدَةَ وَالْخَنَازِيرَ** کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس شکل و صورت
 میں تین دن تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ہلاک ہو گئے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان بندر اور خنزیر کیسے بن گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں ذروں کی تیسویں کا بھی عام چوچا ہے۔ جو کہ تہ ہے کہ موجودہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے پہلے سب بندر ہی تھے۔ مگر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس کا دعویٰ اس دلیل پر مبنی ہے کہ بندر کی شکل انسانی شکل کے مشابہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بندر یا خنزیر کی نسل نہیں ہے۔ اور نہ بندر انسان کی نسل سے ہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ بندر اور انسان پہلے بھی علیحدہ علیحدہ تھیں اور آج بھی ویسی ہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معترضین ذروں کی تیسویں کو تسلیم کرنے میں تو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے مگر جب قرآن پاک کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ تو انہیں یقین نہیں آتا۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لعن اللہ الیہود والنصارى۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منع کیا تھا کہ تمہارے لیے چربی کا استعمال جائز نہیں۔ خواہ حلال جائز ہی کی ہو۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس طرح حید سازی کی کہ چربی خود تو نہیں کھاتے تھے۔ مگر اسے پگھلا کر فروخت کر دیتے تھے۔ اور اس کی قیمت کھا جاتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ تمہارے لیے چربی حرام ہے تم سے کیوں کھاتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم چربی تو نہیں کھاتے۔ بلکہ اُسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تَرْكَبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ اے ایمان والو! اس چیز کا ارتکاب نہ کرو۔ جس کا یہود کرتے تھے۔ فَتَسْجَلُوا مَحَارِمَ اللَّهِ بِأَذْنِ الْخَيْلِ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو جیسے ہانے سے حلال کر لیتے تھے۔ کہیں تم بھی ان کی پیروی نہ کر کے مغبوط علیہ زہن بن جانا۔

یہودی بعض برائیاں کھلے عام کرتے تھے۔ مثلاً سود علی الاعلان کھاتے تھے اسی طرح دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے تھے مگر ان برائیوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ نہیں کیں۔ ایسا کیا ہے۔ تو ان جرائم پر جن کا ارتکاب انہوں نے جیلے بہانے سے کیا۔ معلوم ہوا کہ ناجائز

حید سازی بست بڑی خصلت اور بست بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حید سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا، نہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کرنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حید سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی مادیوں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حید سازی اور حرام ہے۔

جائز حید سازی

اگر نیت نیک ہو اور حید سازی حرام سے بچنے کے لیے کی جائے تو یہ جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے بعض امور میں خود حید سازی کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آتا ہے: کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے بست اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے۔ آپ نے دریافت فرمایا اَکُلُ قَمَرٍ خَبَبٍ هَكَذَا کیا خبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! بعض گھٹیا اور ناقص قسم کی کھجوریں بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے مزید دریافت کرنے پر صحابہؓ نے بتایا کہ ہم ادنیٰ قسم کی دو صاع کھجوروں کے عوض اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ذَلِکَ الرَّبُّو یہ تو سود ہو گیا۔ ایک ہی جنس کا لین دین تو برابر ہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ذکر کم و بیش۔ ایسا نہ کرو۔ یہ حرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سب سے منہ کا حل یہ ہے۔ کہ پہلے ادنیٰ قسم کی کھجوروں کو کسی دوسری جنس مثلاً گندم، جو کے عوض بیچ ڈالو یا ان کی نقد قیمت وصول کر لو۔ اور پھر اس سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خریدو۔ یہ حید جائز ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پر ناراض ہو گئے۔ تو قسم کھائی۔ کہ تندرست ہو گیا۔ تو بیوی کو سولاٹھیاں یا کوڑے ماروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی نیک خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے تو چھڑیوں کا ایک گٹھلے لو۔ اور ایک ہی دفعہ بیوی کو ضرب لگا دو یہ کافی ہے۔ گویا سو کڑوں کی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حید سازی بتلائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی حیلہ سازی کا ذکر آتا ہے۔ کہ آپ نے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس ملک کے قانون کے مطابق وہ انہیں نہیں روک سکتے تھے۔ اُدھر اسرائیلی قانون کے مطابق جو شخص چوری کا ارتکاب کرے اُسے سال بھر غلامی کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی کو روکنے کے لیے اسرائیلی قانون کا سہارا لیا۔ اور اس کے لیے حیلہ یہ بنایا کہ اس کے سامان سے چمانہ برآمد کر لیا۔ اسی حیلہ سازی کو قرآن پاک نے اس طرح بیان فرمایا: **كَذَلِكَ كَدْنَا لْيُوسُفَٰ** ہم نے یوسف علیہ السلام کو ایسا کرنے کی تدبیر بتائی تھی۔ البتہ ناجائز حیلہ سازی بہر حال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے ذیور بیوی کے نام بہہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا۔ تو بیوی نے خاوند کے نام بہہ کر دیا۔ گویا نہ کسی کے ہاں ذیور پر پورا سال گزرے اور نہ اُس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرعن، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم بھٹے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی شکل میں اخلاص طلبہ پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا۔ کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کرے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آگیا۔ اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندر جس اور شے میں

بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نفال جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھ لے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اُن نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو اُن سے زیادہ مشابہ ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس میں کوئی معاملہ کرتے ہیں۔ تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاملہ یا (AGREEMENT)

ہوتا ہے۔ جس کی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آجائے گی۔ جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں۔ اسی طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر بے دیکھتا ہے۔ تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

اب نکاح کی بھی شرائط ہیں۔ نکاح ایسے مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جو آپس میں محرمات میں سے نہ ہوں۔ اگر محرم ہوں گے۔ تو نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ اہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ان تمام شرائط کے ساتھ جو کام ہوگا وہ درست ہوگا۔ ورنہ قانون شکنی کی زد میں آجائے گا۔ اسی طرح مباشرت کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ جب مرد اور عورت آپس میں ملیں گے۔ وہ بھی فطری طریقے سے بغیر فطری راستے سے استغناء بھی خلاف قانون ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔

قانون شکنی پر خنزیر اور بندر کی سزا اللہ تعالیٰ نے اس واسطے دی ہے کہ یہ دونوں جانور اخلاق طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گہرے ہوئے ہیں۔ خنزیر ایک ایسا جانور ہے کہ اس کی دہ کے ساتھ کئی کئی نزدیک وقت چھتی کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔

اور بندر کی ایک بہت بڑی خصلت یہ ہے کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قصائے شہوت کرتا ہے۔ خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت ہوتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا وہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں۔ جو خود قانون شکن ہے۔

نماز کا ایک اہم قانون ہے کہ مقتدی اہم سے آگے نہ بٹھے۔ رکوع، سجود، قنوت، قعدہ، ہر مقام پر اہم کی اقتدار میں ہے۔ اور اگر کوئی نمازی اہم سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بوقوت جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ گدھے کی مانند ہے۔ یہ تو اس کی باطنی صورت ہے۔ فرمایا اہم سے آگے نہ بٹھیں ایسا نہ ہو یَجْعَلَ اللّٰهُ صُورَتَهُ صُورَةً حَمَارًا کہ اللہ تعالیٰ اس کی شکل گدھے کی بنا دے یعنی کہیں ظاہری طور پر بھی قانون شکن گدھا ہی نہ بن جائے قانون شکنی پر سخت وعید آئی ہے۔

فرمایا بنی اسرائیل! تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی کی اور حکم بجا نہ لائے۔ بلکہ جلد سازی سے اس کی عمر مت کو توڑا۔ تو ہم نے انہیں کہا کہ ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔ پھر جب وہ بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ تو باقی دنیا کے لیے وہ نشان عبرت بن گئے۔ فَجَعَلْنَاهَا نَكَارَةً لِّمَنْ يَّرَىٰ بَيْنَ يَدَيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ہم نے انہیں موجودہ اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنادیا۔ لوگوں کی باؤں پر اور تار سخی کی کتابوں میں محفوظ ہو گیا کہ فلاں قوم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر اور بندر

بنادیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعہ کو یاد کر کے آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔
 فرمایا تبدیل اشکال محض عبرت کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ بھی
 بنادیا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے اس واقعہ میں نصیحت ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی
 کسی نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا۔ تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ
 نے متقیوں کے لیے اس واقعہ کو نصیحت بنادیا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً
قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُؤًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیا
ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا تو بتاتا ہے ہم کو ٹھٹھاکا ہوا موسیٰ
علیہ السلام نے کہا۔ پناہ بخدا۔ اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ﴿۱۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جلد سازی کا تذکرہ بیان فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے قانون کو کس طرح توڑتے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں ان کی شکلوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ اور بالآخر وہ
ہلاک ہو گئے۔ آیت زیر درجہ میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس
قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو مان چاہا۔ اور اس ضمن میں طرح طرح
کے سوال کئے۔ گویا بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ من حیث القوم یہ خرابی بھی بنی اسرائیل میں موجود تھی۔
اس آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔

در اصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر اگلے رکوع
کی پہلی آیت میں ہے: وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا جَبْتُمْ لَهَا
شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور الزام ایک دوسرے کے سر نہ پہنے گئے۔ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ
تَكْتُمُونَ۔ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرے والا ہے۔ جس کو تم چھپاتے ہو۔ قتل تو ہو گیا۔ مگر قاتل
کو پتا نہیں چلتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا
مقتول کے جسم پر مارو، تو وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا کہ اس کا قاتل کون ہے، چنانچہ قاتل
کا پتہ چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کا تذکرہ آیت زیر درجہ
میں ہو رہا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مقصد کی خاطر گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس کو تو بعد میں بیان کیا ہے۔ مگر اس حکم کا تذکرہ پہلے کر دیا گیا ہے۔ گویا واقعات کے تقدم و تاخر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کے متعلق مغتربین کرام بیان کرتے ہیں: کہ قرآن پاک کا اسلوب بیان یہ ہے کہ جو چیز زیادہ ضروری ہوتی ہے اُسے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے دو اجزاء ہیں۔ ایک اصل قتل جس میں مقتول کا حق ضائع ہوا۔ اور دوسرا جزو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بندوں کے حق پر مقدم ہے اس لیے گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو مقدم رکھا اور اصل واقعہ قتل کو مؤخر کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں بعض دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے حق کو بندوں پر مقدم رکھا گیا ہے مثلاً وَتَقْضَىٰ رِبْكَ اِلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاّٰ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا مِّمَّا تَرَىٰ رَبِّيْ فَيُفْصِلُ كَيْفَ يَشَاءُ کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق پہلے بیان کیا اور والدین یعنی بندوں کا بعد میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ لقمان میں آتا ہے: وَ اِنْ جَاهَدَكَ عَلٰى اَنْ تَشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَذٰ تَطَعْتُمْ کہ ماں باپ اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنا چاہیں یعنی تمہیں شرک پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت مت کرو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا اس واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذبح گائے کو مقدم رکھا۔ کہ یہ اس کا اپنا حق ہے اور مقتول کے حق یعنی دیت یا قصاص وغیرہ کو مؤخر کر دیا۔

اس واقعہ سے حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے: کَذٰلِكَ يُدْعِي اللّٰهُ الْمَوْتٰی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اس مردہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ اور پھر حساب کتاب اور جزا و سزا کے تمام واقعات پیش آئیں گے۔

ملا علی قاریؒ دسویں صدی کے بڑے پائے کے محدث گذرے ہیں آپ کا اصل وطن ہرات تھا۔ مگر مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربی میں مرقات کے نام سے مشکوٰۃ شریف کی منہ پاز شرح لکھی ہے۔ اپنی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا دولت مند

درج قتل

کثرت سوال
کے بچو

اس کی گردن توڑ دیں۔ اور پھر لاوی خاندان کے کاہن اس پر کچھ پڑھیں پڑھائیں۔ یہ لوگ اس ندی پر اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ اے پروردگار ہم اس خون سے بری ہیں۔ نہ ہم کو ملے ہے کہ یہ خون کس نے کیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو فرمایا کہ بھائی! ایک گائے ذبح کرو تو تمہارے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت بیت وعل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبیعتوں میں تعمق تھا۔ وہ بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے۔ توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بیچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں مہربات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔

قاتل کی تلاش کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک مبارک راستہ اختیار کیا۔ کہ اس طرح گائے ذبح کرو اور پھر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مار دو تو وہ خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انہیں بذریعہ وحی بھی قاتل کی خبر مل سکتی تھی اور وہ ان کو بتا سکتے تھے۔ اس کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اسرائیلیوں کے دماغوں میں تعمق بھرا ہوا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست قاتل کی نشاندہی کر دیتے تو قوم بگڑ جاتی۔ حسرت موسیٰ علیہ السلام ان کی عادات کو خوب سمجھتے تھے۔ جب وہ توراۃ لے کر آئے تھے۔ تو اس وقت بھی اسرائیلیوں

نے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے عمدہ و بیان کو بھی توڑا۔ اور جب ان پر جبر کیا گیا کہ وہ طور ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا پھر وہ راہِ رست پر آئے۔ اور تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی باتیاں نبی کے علم و عمل سے علیحدگی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور نبی سے قطع تعلقی تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اول بے خبری یعنی امتی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ نبی کا عمل اور عقیدہ کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ طبیعتوں میں جاڑ پیدا ہو جائے۔ امتی اصل راستے سے ہٹک جائیں تو بھی نبی سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

تیسری وجہ ماحول کا اثر ہے۔ جب لوگ معاشرے کے دیگر لوگوں سے متاثر ہو کر ان کا طریق اختیار کر لیں۔ تو پھر بھی اپنے نبی سے قطع تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ قیمنوں بیماریاں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات بات میں تخرار کرتے تھے۔ حجت بازنی اور حیلہ بازی کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی کوشش کرتے تھے یہ بیماریاں آج امت محمدیہ میں بھی موجود ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَتَبْعَنَّ سُنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكَ یعنی میری امت! ایک وقت آئے گا۔ جب تم بھی پہلی قوموں کی طرح ہی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے محفوظ رکھے۔ اور نبی علیہ السلام کی صحیح اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

ارشاد ہوتا ہے وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً۔ اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ کائے ذبح کرو۔ بقرہ کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر گائے پر بولا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اسم جنس کے طور پر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی نر اور مادہ یا گائے اور بیل دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گائے نہیں بلکہ بیل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے قوم کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیکر تمہارے مسئلہ کا حل فرمایا ہے۔ تم حکم کے مطابق گائے یا بیل ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو یہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ مگر وہ ظالم قوم تعمیل حکم کی بجائے کہنے لگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام قَالُوا اتَّخَذَ نَا هُزُؤًا کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا (مذاق) کرتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے۔ کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو جائے اور اپنے قاتل کی نشاندہی کرے۔ یہ تو آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔

هٰذَا مَصْدَرٌ مِّنْ مَّفْعُولٍ بِهٖ غَطْلٰی مَعْنٰی یہ ہے کہ کیا تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا بتاتا ہے۔ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا عظیم اور صاحب کتاب نبی ہے۔ مگر قوم اس قدر بڑبی ہوئی ہے۔ کہ معجزہ کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ تھوڑا عرصہ قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر کئی ایک معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انیس فرعون کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ یہ چالیس سال تک صحرائیں سرگرداں پھرتے رہے۔ من و سلویٰ کھاتے رہے۔ پانی کے لیے بارہ چٹے جاری ہوئے۔ اس کے باوجود مزاج فاسد ہیں۔ صاف کہہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر سخت غصہ آیا قَالَ فَرَنَعُ اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اے نادانوں! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خدا تعالیٰ کا نبی ہو کر خدا تعالیٰ کا حکم سن رہا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مخول کر رہا ہوں۔ یہ تو جاہلوں کا کام ہے۔ اسی لیے ہماری شریعت میں ٹھٹھا حرام ہے۔ سورۃ حجرات میں آتا ہے لَا يَخْفَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ قَوْمٌ كُوْنِي قَوْمٌ كُوْنِي قَوْمٌ سے ٹھٹھا نہ کرے۔ یہ منہسی مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر ہوتی ہو۔ سمحت منع ہے۔ ہاں ایسا مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو جائز ہے۔ تاہم اس کی زیادتی بھی مناسب نہیں۔

خوش طبعی
جائز ہے

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر خوش طبعی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میں خوش طبعی کرتا ہوں۔ مگر میری خوش طبعی اور عام لوگوں کی خوش طبعی میں بنیادی طور پر فرق ہے۔ اَنْ لَا اَقُوْلَ اِلَّا حَقًّا میں حق کے بغیر کچھ نہیں کہتا۔ خواہ خوش طبعی ہی ہو۔ حدیث شریف میں موجود ہے

کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا: حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس سواری نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کر دیں گے۔ اُس نے سمجھا کہ شاید حضور اونٹ کا کوئی چھوٹا بچہ عنایت فرمائیں گے۔ کہنے لگا مگر میں اس پر سواری کیا کروں گا۔ اُس کی توجہ غفلت کرنی پڑ گئی۔ نامعلوم کتنے سال بعد وہ بچہ سواری کے قابل ہو گا۔ اُس کی یہ بات سن کر حضور علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا کہ تم نے اونٹ کے بچے کو بالکل چھوٹا بچہ کیوں سمجھ لیا۔ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں اونٹ کا وہ بچہ دوں گا۔ جو سواری کے قابل ہو گا۔

اسی طرح ایک بڑھیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ کے نبی! میرے لیے جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے اُمّ فلاں! کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ بیچاری پریشان ہو گئی۔ جب وہ روتی ہوئی جانے لگی۔ تو حضور علیہ السلام نے اُسے واپس بولایا اور فرمایا کہ میں نے صحیح بات کی ہے۔ جنت میں بڑھی عورت نہیں جائیگی۔ بلکہ جو بھی جائے گی۔ جوانی کے عالم میں جائے گی۔ جنتی مرد اور عورتیں سب تیس پینتیس سال کے پیمانے میں ہوں گے۔ جب وہ جنت میں جائیں گے۔

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پناہ بخدا کہ میں ٹھٹھا کر کے جاہل بن جاؤں یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس کا حکم سنا رہا ہوں اور تم اُسے ٹھٹھے پر محمول کر رہے ہو۔ اب وہ سمجھے کہ یہ تو سنجیدہ بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

الْعَمَاءُ

البقرة

درس کی دیکھ

آیت (۲۶۸-۲۶۹)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۚ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۚ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٢٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوثُهَا تَكُرُّ النَّظِيرِينَ ﴿٢٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٢٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُكَلَّمَةٌ لَا شِيبَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا لَنَنَجِّتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٢٧١﴾ وَلَا ذُقْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا ۚ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٢٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمُرْتَكِبِينَ ۚ لَعَنَّا لَكُمْ تَفْعَلُونَ ﴿٢٧٣﴾

ع

ترجمہ: بنی اسرائیل نے کہا کہ اپنے پروردگار سے دعا کر، ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے زعفران خورہ (بڑھی) اور نہ بچھیا (نوعمر) ہو، بلکہ اس کے درمیان میں ہو۔ پس کہ ڈالو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۲۶۸﴾ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے، اس کا رنگ گہرا ہے۔ جو دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿۲۶۹﴾ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے، بیشک وہ بے ہم و

مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے ﴿۵﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرمائیے کہ وہ ایسی گائے ہے جو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو جوتی دچھاڑتی ہو زمین کو اور نہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو۔ صحیح سلامت ہو۔ اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ ٹھیک بات لائے ہیں۔ پس انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا۔ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے ﴿۶﴾ اور (اے بنی اسرائیل) اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ۔ جب تم نے ایک جان کو قتل کر ڈالا۔ اس میں تم مجھڑا ہونے لگے۔ (ایک دوست کے سر پر دھرنے لگے) اللہ اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے، اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے ﴿۷﴾ پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ کو گلے کے بعض حصے کے ساتھ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور اسی طرح وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو اور غور و فکر کرو ﴿۸﴾

گزشتہ درس میں بنی اسرائیل کی حیل سازی کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے احکام الہی حیل بہنے سے مننے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے تعمق اختیار کیا۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پھر جوں جوں سوالات کرتے گئے۔ توں توں ان کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر گائے کو ذبح کیا۔ اور اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم کے ساتھ لگایا۔ تو وہ زندہ ہو گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اُسے اس کے بھتیجوں نے دولت پر قبضہ کرنے کے لیے قتل کیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی بات کو ظاہر کر دیا۔

قاتل کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ مقتول چچا کی لڑکی کو حاصل کر لے گا۔ کیونکہ اس کی جائیداد کی وارث تو وہی تھی۔ نیز وہ اس لالچ میں تھا کہ مقتول کی لاش کو جس علاقے میں پھینکا گیا ہے۔ اس کی قریبی بستی کے لوگوں سے مقتول کی دیت بھی وصول کر لے گا۔ یہ تمام باطل خیالات اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس چیز کو تم چھپاتے ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ جب وہ قتل کا یہی وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے کر گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر دو۔ یہ من کر پلے تو وہ بگڑ گئے۔ کہ اے موسیٰ علیہ السلام کیا آپ ہم سے نچا کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بنی نے کہا کہ میں ٹھٹھا نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جو تمہیں پسپا رہا ہوں بٹھٹھا کرنا تو

جہاں

جاہوں سے ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو بخیر گئی سے لیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر نبی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے حکم کی فوراً تعمیل کر دیتے اور بونی بھی گائے فنگ کر دیتے۔ تو ان کا منہ حل ہو جاتا۔ مگر ان کے مزاج میں فساد چھپتا تھا۔ وہ ریت و صل کر کے لگے۔ چنانچہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ خود ہی پابندیوں میں جکڑے گئے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے سر۔ ت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی گائے کے فنگ کر کے کا حکم دیا۔ اس کی تلاش میں ہائی وقت گزارا۔ تاہم اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت یہ تھی کہ اس طریقہ سے ایک غریب آدمی کی پرورش مقصود تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک پرہیزگار آدمی فوت ہو گیا اور اپنے پیچھے بیوہ، ایک بچہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا۔ اس کے مدوہ اس کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ مرنے سے قبل اس شخص نے دعا کی تھی کہ مرنے پر میرے بچے کے لئے اس بچہ سے میں برکت ڈال دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔

اس بچے کی نیک نیتی اور سعادت مندی کے متعلق دو روایات آتی ہیں۔ اہم ابن کثیرؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ اس کا باپ سویا ہوا تھا۔ نینے میں باہر سے کوئی جرایا۔ ہیرا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو اتنی ہزار میں ہیرا فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ مگر بچے نے جواب دیا کہ میں اپنے باپ کی اجازت کے بغیر تم سے سود نہیں کر سکتا۔ جب وہ اٹھ گیا تو بات کریں گے۔ تب جہنے کہا کہ باپ کو جگا دو۔ میں کم قیمت پر بھی ہیرا بیچ دوں گا۔ مگر لڑکا باپ کے آرام میں مغل ہونے پر رضا مند نہ ہوا۔ تاہم کم سے کم قیمت لینے پر بھی تیار ہوا۔ مگر لڑکے نے کہا کہ میں اتنی ہزار کی بجائے ایک لاکھ روپیہ دینا پسند کروں گا۔ مگر باپ کو بے آرام نہیں کر دینا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس لڑکے کی نیک نیتی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اسے برکت سے نوازا۔

بعض دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ان فی شعل میں اس بچے کے پاس

۱۔ تفسیر درمنثور ج ۱، تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱

۴۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۶۔ معالم التنزیل ص ۲۳

آیا اور پھر اس کی قیمت دریافت کی۔ اور پھر دو دینار کی پیش کش بھی کر دی۔ لڑکے نے کہا۔ کہ میں اپنی والدہ سے پوچھے بغیر قیمت طے نہیں کروں گا۔ جب والدہ سے دریافت کیا تو وہ اتنی قیمت پر رضا مند ہوئی۔ فرشتے نے زیادہ قیمت لے دی۔ بہت سے پھر کہا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ مگر والدہ نے پھر انکار کر دیا۔ غرض! فرشتہ قیمت بڑھا کر بارہ بار والدہ سے مشورہ کرتا رہا۔ مگر والدہ کسی قیمت پر اپنی بچہ ادا نہیں کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ لہذا بچے نے باپ کو ملحق جواب دہ بنا دیا۔ اب فرشتے نے کہا۔ کہ تم بڑے سعادتمند بیٹے ہو جو اپنی والدہ کی شے کے بغیر ایک قدم نہیں ہٹتے۔ تو سنو! اس بکھڑے کو عزیز نہ کے لیے تمہارے پاس لوگ آئیں گے جو تمہاری قیمت پر بچہ خریدو گے۔

کرنا یہ تمہیں مالدار کر دے گا۔

ادھر بنی اسرائیل کو ایسے بچہ کے کی تلاش ہوئی۔ جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نشانیوں پر پورا اترے پھر تے پھر تے انہیں بنی بکھڑا مل گیا جس میں بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ جب انہوں نے قیمت پٹانا چاہی۔ تو سوداگر بن سہ۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آکر بتایا کہ طلبہ بچہ تو مل گیا ہے۔ مگر اس کا مالک مناسب قیمت پر بیچنے کو تیار نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو بد بھیجا۔ اور بچہ نہ لینے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ جی بتائیں۔ جب کہ میں اس کا مالک ہوں کیا میں اپنی مرضی کے مطابق اس کو نصرت میں لانے کا مجاز نہیں ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیشک تجھے اپنی مرضی کے مطابق نصرت کی اجازت ہے۔ تو اس نے کہا کہ میں اس بچہ کے بہت سے اس کا ہم وزن سونا ہوں گا۔ اس سے کم قیمت پر مرضی نہیں ہوتا۔ بعض دوسری روایتوں میں آتے ہیں کہ اس نے بکھڑے کی عہد قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت حسب کی۔ تاہم ہم وزن سونے والی روایت زیادہ مشہور ہے چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ بکھڑا اس کے وزن کے برابر سونا دے کر حاصل کیا۔ اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ذبح کیا۔

الغرض! بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فوری طور پر کون سے یہ بچہ اسے کر جانے کی نشانیں

ذبح نہ کیا۔ بلکہ اس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سوال و جواب کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ تو کہنے لگے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں تفصیل سے بتائے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کیسی ہو۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے۔ إِنَّهَا بَقَرَةٌ تَلَوَّانَ فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ وہ گائے نہ تو بڑھئی ہے۔ اور نہ نو عمر بلکہ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ فَأَفْعَلُوا مَا تَأْمُرُونَ پس کر ڈالو جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اب بھی زیادہ سوال و جواب کے چکر میں نہ پڑو۔ بلکہ درمیان عمر کی کوئی گائے نہ کر ذبح کر دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی فوری تعمیل ہونی چاہیے۔ مگر وہ بد بخت قرعہ پھر بھی تعمیل حکم پر آمادہ نہ ہوئی۔ بلکہ دوسرا سوال کر دیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یعنی اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں اپنے رب سے یہ پوچھ دیں يُبَيِّنْ لَنَا وہ ہمیں واضح طور پر بتائے مَا كُونَتْ کہ اس گائے کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے انہیں بتایا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ كَوْنُهَا وہ گائے زرد رنگ کی صفت ہے۔ کہ وہ زرد بھی ہو اور گہرے بھی ہو۔ یہ رنگوں کے مختلف نام ہیں۔ اور پھر آگے ان کی صفات ہیں۔ صَفِيَّةٌ زَنْجٌ كَوْبِيضٌ اور سرخ کو احمر کہتے ہیں تو اس گائے کے رنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ گہرا زرد ہو، تَشْتَرُ الشُّظْرَيْنِ جو لوگوں کو بدل بھاننے والا ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے قمری سوال کر دیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کریں يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا بیشک گائے ہم پر مشابہہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے۔ اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے وَأَنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ تو بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہِ راست پائیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطابق کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا گویا یہ آخنی بات تھی جو انہوں نے دریافت کی۔ عام قانون بھی ہے کہ وَرَبُّهُ تَقُولُ لَنُشَاطِ

فَقُلْتُ ضَرْبُودُ بَعْضِهَا یعنی کائے کے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول کی لاش پر درود اسے
قیمت پر ہوم گذارتی تھی لکن نعوذی اس طریق سے اللہ تعالیٰ اس مرنے کو زندہ کرے گا۔
اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ اس کے قاتل کون ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور مردہ زندہ ہو گیا۔

اس چیز میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کائے کا کون سا حصہ تھا جو مردہ پر کیا گیا۔ بعض روایات
میں دم آتا ہے بعض میں قلب اور بعض میں زبان بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا حکم
تھا۔ اور عجیبہ طور پر یہ ہوا تھا کہ کائے کے گوشت میں ایسی کوئی تاثیر نہیں تھی جس سے مردہ زندہ ہو
جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو قصاب نہروں جانور روزہ ذبح کرتے ہیں۔ وہ تو قاصد مرنے زندہ کر لیں۔
اصل میں وہ تو خدا تعالیٰ کا حکم تھا کہ اس طریق سے مردہ زندہ ہو کر ان کی پریشیدہ بات کو ظاہر کرے گا۔
ایک نئے موتی بالکل اسی طرح کا عجیبہ تھا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا فَقُلْتُ
اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ۔ کہ اس پتھر پر اپنی لڑائی مارو تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ لایا
ہماتے پاس بھی ہیں۔ اور پتھر ہی بے شمار ہیں۔ مگر پانی نہیں نکلتا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے
پانی میں مارنے کا حکم دیا تو بارہ راستے بن گئے۔ یہ سب عجائبات تھیں۔

بہر حال کائے کا ایک جز مرنے کو جانے سے عجیبہ طور پر مردہ نہ کر سکتا تھا۔ اس سے
پوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا تھا۔ تو اس نے صاف بتا دیا کہ اس کے قاتل اُس کے بھتیجے ہیں اور
یہ رزم جمع عام میں کھڑے لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مردہ پھر اپنی مردہ حالت میں
تبدیل ہو گیا۔ اس واقعہ پر یہ سبق پایا جاتا ہے کہ جو ملک ملک اپنے حق سے ایک مردہ کو زندہ کر
سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز تمام مردوں کو قبروں سے زندہ نہایت پر جی قرار ہے اور اس قسم
کے واقعات کا مشاہدہ اس لیے کیا جاتا ہے۔ وَلِيْرُنِيْكُمْ اٰيٰتًا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں
اپنی نشانیاں دکھا دے جس سے تم عبرت حاصل کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہ تم غور و فکر کرو۔
اللہ تعالیٰ کی ان آیات کے عیش نظر سے بے گناہت کی راہ متعین کر سکو۔

قاتل
سے

بھتیجوں نے چچا کو اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ اس کی وراثت میں اس کو مال کرا پاتا ہے

تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قاتل نہ صرف وراثت سے محروم ہو گئے۔ بلکہ انہیں مقتول کی ویت ادا کرنا پڑی۔

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
 الْقَاتِلُ لَا يَرِثُ قَاتِلُ وَرَثَتِ كَاخْتَارَ نَحْسٍ بَوَاتُ۔ اُس نے جرم ہی ایسا بڑا کیا ہے کہ وہ اپنے
 جائز حصے سے بھی محروم ہو گیا۔ اہم مالک کا مسک یہ ہے کہ اگر قاتل عدا کیا ہو تو قاتل مقتول کی وراثت
 سے محروم ہو گا۔ اور اگر غلطاً قتل ہوا ہے۔ تو وراثت کا حقدار ہے۔ باقی ائمہ اس بات کے قائل
 ہیں کہ قاتل خواہ عمدہ ہو یا غلطی سے۔ ہر حالت میں قاتل اپنے مقتول وراثت کی وراثت سے محروم ہو
 جائے گا۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلم کا اور غیر مسلم مسلمان کا وراثت نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 فرمان ہے۔ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ شَدَّ الْغَرِيَامُ زَانِي، ہو
 جائے۔ تو وہ مسلمان باپ کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر باپ مذہب تبدیل کر
 لے۔ تو وہ بیٹے کی وراثت سے حصہ نہیں پاسکے گا۔

البقرة

(آیت ۷۴)

الم

درس ۲۲

ثُمَّ قَتَلْتُمْ قُلُوبَكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فِي الْحَجَارَةِ أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً فَإِنَّ مِنَ الْحَجَارَةِ لَمَّا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ أَلْهَرُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَشْقُوقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَنْهِيضُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت ہیں اور بیشک بعض پتھروں میں سے البتہ وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بیشک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں ان سے پانی نکلتا ہے اور بیشک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان

کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو ﴿۷۴﴾

بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا ہے۔ اور بعض کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے بنی اسرائیل کی طرف سے کتمان حق، بکھڑے کی پرستش، قانون کی خلاف ورزی، قتل، انبیاء علیہم السلام وغیرہ۔ یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے۔ سورۃ مائدہ میں بنی اسرائیل کی قیادت قبیلہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَسِيَةً يُفْسِدُ فِي سَبِيلِنَا يَذَّبُونَ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ إِنَّهُم كَجَافِلُونَ ﴿۷۴﴾۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس قسم کے کام کرتے تھے کہ ”يُحْدِثُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوْعِدَةِ اللَّهِ تَعَالَى الْكَلَامُ“ کو اپنے مقام سے تبدیل کر دیتے۔ گویا آسمانی کتاب میں تحریر کے مرتب ہوتے تھے جس کی وجہ سے قیادت قبیلہ جیسی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ ان کے فہم بھی اٹک گئے۔ ان میں ضعف ہمت کی بیماری بھی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ جہاد کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ کہنے لگے کہ اے

الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ فَهُوَ سَاجِدٌ یعنی جن حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں حالت سجدہ سب سے اولیٰ ہے، اس حالت میں جس قدر عجز و انکساری ہوگی اُسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی اتصال کی بدولت انسان کی حالت درست رہ سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص پتھروں جیسے اوصاف کا حامل بھی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو اُس سے مخلوق کو عام فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ وہ شخص محدود پیمانہ پر مفید ہے۔ اور نہ ہی اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہے۔ تو پھر ایسا انسان بلاشبہ بد بخت لگتی ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انہیں قدرتِ خداوندی کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جو ان کے ساتھ چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس نعمت کے محروم نہیں ہتے اور پھر ان کی وجہ سے بڑی بڑی باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

ہماری بعض ایسے اکابر قریبی زمانہ میں ہوئے ہیں جو یقیناً مقررینِ الہی میں سے ہیں یہ احمد شہید بریلوی سادات کے خاندان میں سے حسنی تھے۔ وطن مالوٹ گجرات تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور علم حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے مزید تربیت کے لیے اپنے برادر خورشید شاہ عبدالقادر کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے قین سال تک سید احمد شہید بریلوی کی تربیت کی۔ یہ وہی شاہ عبدالقادر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب کشف بزرگ تھے ہر وقت عبادت میں مشغول ہتے۔

جنس اکابر
دین

شاہ عبدالعزیز کی عیسوی نظروں نے جانچ لیا کہ سید احمد شہید بریلوی عظیم صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے بہت اہم کام لے لیتا ہے۔ چنانچہ قین سال تربیت مکمل کر لینے کے بعد شاہ صاحب نے سید احمد شہید کو لونگ جا کر فوجی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا۔ لہذا آپ نے چھ سال تک فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ گویا سید احمد شہید۔ شاہ عبدالعزیز کے تربیت یافتہ اور ان کے مجاز تھے۔

خود شاہ عبدالعزیز برصغیر میں اپنے باپ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپ محدث اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کے داماد مولانا عبدالحی بھی بڑے پائے

کے بزرگ تھے۔ آپ سیدہ صاحبہ سے زیادہ عالم تھے۔

شاہ اسماعیل شہید، شاہ عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے تھے قرآن پاک کے علاوہ تفسیر و تراجم حدیث زبان یاد تھیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے اور سورج نکلنے تک ختم کر لیتے اور عصر کے بعد شروع کرتے تو مغرب کی اذان کے ساتھ ختم کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعام فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں شیخ عبدالغنی محدث کا وہ رسالہ آگیا جس میں نماز کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ رات کے وقت دو رکعت ایسی نماز پڑھنے کی توفیق میسر آجائے جس کے دوران کوئی دوسرا نہ آئے، ایسی کوشش میں رات بھر میں سو رکعت نماز ادا کی۔ مگر مقصد حاصل نہ ہوا اس بات کا ذکر آپ نے سید احمد شہید بریلوی سے کیا کہ شیخ عبدالغنی محدث کے رسالہ میں مذکور طریقے سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض کتاب میں طریقہ پڑھ کر مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ دو رکعت نماز ادا کر لو۔ چنانچہ جب سید صاحب کی اقدار میں نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور قلب عطا کیا۔ اور مطلوبہ کیفیت حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا ذکر آپ نے حضرت مولانا عبدالحی کے پاس بھی کیا کہ حضور قلب کے لیے انہوں نے کتنی کوشش کی مگر یہ چیز سید احمد شہید کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوئی، یہ سن کر مولانا عبدالحی کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ سید صاحب سے عرض کیا تو انہوں نے انہیں بھی اپنے پیچھے نماز پڑھائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی وہی کیفیت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں صاحبان یعنی شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی ہمیشہ سید احمد شہید بریلوی کے ہمراہ رہے۔ شاہ اسماعیل کو تو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا مرتبہ عطا کیا، مگر مولانا عبدالحی کی سسر کے دوران سسر کے علقہ پنج تار میں جا کر بیمار ہوئے اور وہیں پر داعی اجل بلبل گیا۔

بانگلوٹ کی تاریخی جنب میں شاہ اسماعیل شہید فوج کے ساتھ تھے اور مولانا عبدالحی سید احمد شہید کے لشکر میں عمدہ قضا پر فائز تھے۔ اس اسلامی فوج کے امیر سید احمد شہید بریلوی تھے، سرمد میں ان کی قائم کردہ اسلامی حکومت تین سال تک چلی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی نالائقی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی دوران مولانا عبدالحی بیمار ہوئے جب ان کی زندگی کی ٹیڈ باقی نہ رہی تو سید صاحب

نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتائیں کہنے لگے خواہش تو شہادت کی موت کی تھی۔ جو پوری نہیں ہو سکی۔ اب چاہتا ہوں کہ اس آخری وقت میں آپ کا قدم میرے سینے پر ہو۔ یہ صاحب نے ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اور آپ نے اس کے بعد اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کی اپنی غارتگی ہے۔ یہ فداویٰ ابنِ عسکری کے دور کے بعد ساتویں صدی میں شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے عظمتیں تباہ ہوئیں۔ اور مسلمان مدبرِ ذوالِ ہیبت پھر یہ اپنے قدموں پر تہ نہ رکے۔

تو بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا اتصال نصیب ہوتا ہے۔ حقیقت معنوں میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں پتھروں والی تین صفحات جی نہیں پائی جاتی وہ بہ بخت اور شقی ہوتے ہیں۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت بنی اسرائیل کی مثال واضح ہے۔ یہ پتھروں سے بھی گئے گئے ہیں۔ ان کا وجود غیر معنیٰ مگر بنی انسان کے لیے مفید ہے گویا یہ سارا اسرائیلیوں کی غریبوں کا ذکر ہے۔

فَرِّيَا وَمَا اللَّهُ بِغَفُورٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ يَا دُرُكْهُو اللّٰهُ تَعَالٰی تمہارے کسی فعل غافل نہیں ہے۔ تمہاری تمام برتوتیں اس کی نگاہ میں ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جب اللہ جل شانہ تمہارے اعمال کا انجام تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ یہ سارا بنی اسرائیل کو خطا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہِ راست پر آ جاؤ۔ تو ایسے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ورنہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

فَتَصْمَعُونَ ۚ إِن يَتُوبَ لَكُمْ لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ
 كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يَحَرِّمُونَ عَلَىٰ بَعْضِ مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ
 ④۵ وَرَدَّ لِقَا لِّلَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعُضُوبِهِمْ إِلَىٰ
 بَعْضٍ قَالُوا اتَّخَذُوا لَهُمْ سَمًّا ۚ فَمِمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُخَاجِبَكُمْ بِهِ
 عِندَ رَبِّكُمْ ۚ فَلَا تَعْقِلُونَ ④۶ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ④۷ وَمِنْهُمْ أَفْقُسُونَ لَا يَعْلَمُونَ
 لِكِتَابِ آلِ آدَمَ ۚ وَلَٰكِن هُمْ لَا يَفْهَمُونَ ④۸ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُمُونَ
 لِكِتَابِ بَآئِدِهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيُشَارَكُوا
 بِهِ تَمَتُّ قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ
 وَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ④۹

ترجمہ: (اے اہل ایمان) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری
 بات پر۔ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سننے سے بچتا تھا۔ پھر اس کو
 ہر لڑا لیتے تھے۔ بعد اس کے کہ انہوں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اور وہ جانتے بھی یہی
 ④۵ اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب
 انہیں ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض، بعض کے پاس، تو کہتے ہیں، کیا تم ان (مکملوں)
 کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو، جو اللہ نے تم پر ظاہر کی ہیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے
 تمہارے ساتھ تمہارے رب کے ہاں شریک کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ ④۶ کیا یہ
 لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں
 اور جس کو ظاہر کرتے ہیں؟ ④۷ اور ان میں سے بعض ان پر عمل نہیں کرتے جو انہیں جانتے
 کتاب کو مخریہ بنی ہوئی آرزو میں۔ اور انہیں میں وہ مکرمان کرتے ④۸ پس ہلاکت!

ایہا میں تھیں

فرمایا ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ اُنْ
میں سے بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ ثُمَّ يُخَرِّفُونَهُ مِنْ اَبْدَانٍ مَّعْتَلُوْنَ
پھر اُنے سمجھنے کے باوجود بدل دیتے تھے۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرتوت
کر رہے ہیں۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں بیان بوجھ کر تحریف کرتے تھے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر تحریف سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مراد
ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے تھے۔
تاکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا کلام سُن لیں۔ کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا
کی۔ مگر ان لوگوں نے تحریف یہ کی کہ کما بیشک یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ مگر اس کے
احکام پر سختی سے عمل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کہا ہے کہ جب قدر آسانی سے عمل ہو سکے کرینا۔ باقی
کو چھوڑ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن ستر آدمیوں کو بجلی کے ذریعے خاکستر کر دیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی دعا سے انہیں پھر زندگی عطا کی۔ مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں نے دیدہ دانستہ تحریف
کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیا۔

حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے اہل کتاب خصوصاً یہود کی تحریف کی بھی
واضح مثالیں موجود ہیں۔ آگے آئے گا کہ یہود کا دطیرہ یہ تھا کہ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّكَ الْخَقُّ وَہ جانتے
تھے کہ نبی آخر الزمان کا دین سچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پیشین گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے متعلق توراۃ میں بیان کی ہیں۔ وہ سب کی سب آپ پر پورا اترتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگوں
کو صحیح بات بتانے کے لیے تیار نہ تھے۔ جبکہ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کر دہ
نشانیوں کو چھپاتے تھے۔ اور لوگوں کو انٹی سیدھی باتیں بتا کر آپ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔
سورۃ مائدہ میں آئے گا کہ ان لوگوں نے توراۃ کے احکام میں بھی تحریف کی۔ توراۃ میں
رجم کا حکم موجود تھا کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ مگر یہودیوں نے یہ حکم چھپایا۔ توراۃ میں
حضور علیہ السلام کا علیہ مبارکہ موجود تھا کہ آپ خوش شکل ہوں گے۔ آپ کے بال گھنکریا لے اور

آنکھیں سیاہ ہوں گی۔ قد درمیانہ اور رنگ گندمی ہو گا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمادیا۔ تو یہودیوں نے توراۃ میں آپ کے بیان کردہ عیسے کو بدل دیا۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے۔ کہ بنی آخر الزمان (علیہ السلام) جسے قد و اسے ہوں گے آپ کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور بال سیاہی سے ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو آپ پر ایمان لانے سے روکنے کی کوشش کی۔

یہودی بڑھوٹا

الغرض! اہل ایمان کو گھمایا جا رہا ہے۔ کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو۔ کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہ راست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ حضور علیہ السلام کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ ارشاد ہے کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔

یہود کے ساتھ
موافقت اور
ان کی مخالفت

ابتداءً زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ساتھ موافقت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انہیں ترغیب ہو۔ اور یہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس قسم کے احکام ملتے ہیں آگے دیکھیں۔ یہودیوں کے لیے قرآن پاک میں بھی آئے ہیں کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم یہودیوں کی ترغیب کے لیے ہی تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے سر کے بالوں کے بنانے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں سر میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ مگر یہود مانگ نہیں نکالتے تھے۔ بلکہ ویسے ہی بالوں کو پیچھے کی طرف ڈال دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے موافقت کی خاطر ان کا طریقہ اپنایا۔ لہذا آپ مانگ نہیں نکالا کرتے تھے۔ مگر

یہودی سخت متعصب تھے۔ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہذا بعد میں آپ نے ہائیک نہان شروع کر دیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ کسی طرح راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد آپ نے دوسرے طریقے اختیار فرمایا۔ اور الشرائع میں اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ ایسے کسی ایک مسئلے میں جن میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مخالفت کا حکم ہے۔ یہود محرم الحرام کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ان کی مخالفت کرو اور دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھا کرو۔ اسی طرح یہود حیض والی عورت کو گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ علیحدہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم عورت کو ہر حالت میں اپنے گھر میں رکھو۔ فرمایا حیض والی عورت گھر کے سامنے کام انجام دے سکتی ہے۔ موانے اس کے کہ اس کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ میاں بیوی اکٹھے لیٹ سکتے ہیں ایک برتن میں کھانا کھا سکتے ہیں تاہم مباشرت نہیں کر سکتے۔

اہل کتاب بالوں کو زخما جائز سمجھتے تھے حضور علیہ السلام نے اس کام کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ان سے مخالفت کی بنا پر تھا۔ اسی طرح یہود تہ بند نہیں باندھتے تھے۔ آپ نے شعور پہننے اور تہ بند باندھنے کا حکم دیا مقصد یہ کہ شروع شروع میں مدینہ کے یہودیوں کی خاطر ان کی موافقت میں بعض امور انجام دیے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑے منہ دی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ تو آپ نے ان کے بعض امور کی مخالفت کا حکم دیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اسی بات کو بیان فرماتا ہے۔

کہ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے کسی موافقت کی امید نہ رکھو۔ بلکہ یہ تو سخت عداوتی لوگ ہیں۔ یہ کبھی تمہاری بات ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کا وطیرہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ اس میں تحریف شروع کر دی۔

اہل کتاب میں سے تو ایک گروہ ایسا تھا۔ جو علانیہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انحراف کرتا تھا۔ منصفین کی
چالاکیاں اور آپ کی مخالفت کرتا تھا۔ البتہ ایک مخفی گروہ ایسا بھی تھا۔ جو بظاہر تو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر درپردہ ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ غیبت میں ایسے ہی لوگوں کی ذمہ داری

کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَإِذْ آتَيْنَا آلَ إِبْرٰهٖمَ الْإِسْلٰمَ قَالُوا اٰمَنَّا بِهٖ یعنی ایسے لوگ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاپکے ہیں وَإِذْ أَخَذَ بَعْضُهُمْ رِآلِي بعض اور جب یہ الگ ہوتے ہیں اہل ایمان کے علاوہ بعض دوست لوگوں کے ساتھ تو قَالُوا أَتُخَذَتُنَا اٰمِنُوۡنَ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ کِتٰبَہٗمَ یٰۤاٰیہٗمُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوۡا کہ تم نے ہمیں جو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ لِیُخَآجِبُوۡکُمْ بِہٖ عَنْ رَّبِّکُمْ یہ سہلان اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات میں تمہارے ساتھ مجھڑا کریں گے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو تورات کے احکام سے کیوں آگاہ کرتے ہو۔ جن میں کھجابت کہ نبی آخر الزمان کی یہ نشانیاں ہیں۔ اور یہ کہ تورات قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسی باتیں اہل ایمان کو نہ بتاؤ۔ یہ آخرت میں اسی سے تمہارے خلاف دلیل قائم کریں گے۔ کہتے تھے کہ یہ ایسی گہری بات ہے۔ جو ہم سے خلاف جاتی ہے اَفَلَا تَعْقِلُوۡنَ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی تمہیں اس نکتہ کی کیوں سمجھ نہیں آتی کہ یہ چیزیں ہمارے حق میں نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی ان تمام تر چال کیوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے کہ ان کی ہوشیاری کسی کام نہیں آئے گی۔ اَوَلَا یَعْلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا کِیۡدُوۡنَ وَمَا یُعْلِنُوۡنَ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہر اس بات کو جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے تھے کہ منافقت کا یہ چکر چلا کر وہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھ سکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ جو بے ایمانی کر رہے ہیں۔ احکام کی غلط ترویج کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ان کی کوئی چال کاہل نہیں ہوگی۔

یہودیوں کی
موجوم آرزوئیں

فرمایا تحریف کردہ اور منافقت۔ تو عام لوگوں کی بیماریاں تھیں۔ یعنی یہ خصائل ان لوگوں کے تھے۔ جو ہتھورا بہت علم رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے وَمِنْہُمْ اٰمِنُوۡنَ لَا یَعْلَمُوۡنَ اَلْکِتٰبَ جو بالکل ان پڑھ تھے انہیں کتاب کا بالکل علم نہیں تھا۔ فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اِلَّا اٰمٰنٰتِیْ سوائے چند خود ساختہ آرزوؤں کے جن کا ذکر آئے بیگا یعنی بہر نسبت صرف یہودیوں کے لئے وقف ہے۔ یا یہ کہ سخت ابراہیم علیہ السلام

دوزخ کے دروازے پر پھڑپھڑاتے ہوں گے، اور قیامت کے دن کسی یودی کو جس نے ختنہ کی ہوگی اس میں نہیں گرنے دیں گے۔ یا اگر بنی اسرائیل دوزخ میں پہلے جی گئے تو محمدؐ اسے سننے ایام کے لیے جتنے دن ان کے آباؤ اجداد نے پھڑپھڑے کی پوجا کی تھی۔ اس کے بعد آخر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے بابل اور ان پر اس قسم کی آزمائشیں لیے بیٹے تھے، مگر ان کا عقیدہ یہاں تک تھا کہ عربوں کا دل بھنم کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ سود کو بدل کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتے تھے شریعت کو جائز قرار دیتے تھے وَأَن فَعَمَّ الْآلِیُّنَ اور زمین پر گروہ کھان کرتے۔

تورہ میں
تحریر

تحریر فی الکتاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس جرم کی بنا پر نَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یُکْتَبُونَ الْکِتَابَ بِأَیْدِیْہُمْ سَوْءٌ ہلاکت ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے ائمہ سے کتاب جن توراة کہتے ہیں ثَوَّ یَقُولُوْنَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ گویا اپنی تحریر کو اللہ تعالیٰ کی تحریر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قدر عالم لوگ ہیں۔ اور یہ تحریر اس لیے کرتے ہیں لَیْسَ تَمُذَابٌ لَّحَنًا قَلِیْلًا تاکہ اس کے ذریعے حیرت آمیز معادضہ وصول کریں۔ مثلاً جب کسی زانی کو جہم کی نذر سے بچنا مقصود ہو تو کہہ دیتے تھے کہ توراة کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کا منہ کالا کرو اور گودے پر سوار کر کے شہر پھرا دو یا زیادہ سے زیادہ کوئی جہم نہ کرو۔ اس طرح زانی کی جان بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار من گھڑت مسائل تھے جنہیں توراة کی طرف منسوب کرتے تھے۔ تحریر کی دونوں صورتیں ان میں پائی جاتی تھیں۔ یا تو الفاظ ہی بدل دیتے تھے جیسا کہ بیان ہوا۔ یا پھر الفاظ تو نہیں بدلتے تھے۔ بلکہ ان کی تاویل غلط کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی یہ قباحت بھی بیان کر دی کہ وہ کتاب الہی میں تحریر جیسی قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔

تحریر کا دائرہ شمالوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں انصاف کی نظر سے دیکھیں گے۔ تو پتا چلے گا کہ اکثریت کے عقیدے خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے خود خفا اور جھوٹے عقیدے ہیں جنہیں آج کل کے نام نہاد علماء قرآن و سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ تحریر فی الکتاب و سنت نہیں تو اور کیا ہے آج کے داعی قہر پرستی رسومات و رسوم و رواج

ہمات سے متعلق کتنی بناوٹی حدیثیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ یہ بالکل بیوردیوں کا طریقہ ہے۔ جو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ اس دور میں نیکی کا وہ معیار کہاں ہو گیا ہے۔ جو کتاب اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اقوال صحابہ کا تھا۔ اصل دین کہاں چلا گیا۔ دور حاضر میں دین چند رسومات اور چھوٹے سختہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و سنت کی طرف کون رجوع کرتا ہے۔ نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور نہ عمل کرنے کی، شرک و بدعت پر دین کا دار و مدار ہے۔ اس کی تبلیغ کرنے والے دو لوگ ہیں۔ جو چھوٹے قہقہے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیزیں فتنوں میں ہیں اور غزروں میں ہیں اور انہیں پر عمل ہو رہا ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج چند رسوم کو دین کا نام دے دیا گیا ہے۔ اور لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ دین کو سمجھنے والے لوگ بالکل قلیل تعداد میں ہیں۔ آج کتنے لوگ ہیں جو مفسرین، فقہاء اور ائمہ دین کی طرف پر ریسرچ کا بیڑا اٹھائیں۔ اور دین کو اس کا صحیح مقام دلائل حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی پہنچے۔ قرب قیامت میں فتنوں کا دور آئے گا۔ اُس وقت دین کو ہاتھ میں پکڑنا اس قدر مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جلتے ہوئے کوٹوں کو پکڑنا۔ آج آپ کسی بقیعِ رکھ کی تردید کر کے دیکھیں، ساری برادری اور خاندانِ راض ہو جائے گا۔ شادی بیاہ کی رسمیں دیکھ لیں۔ یہ انٹرنیشنل اور فوٹیج کی رسوم کی طرف نگاہ ڈالیں۔ میلوں اور عرسوں کی طرف دیکھیں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھانی جا رہی ہیں۔ میلے لگانے جا رہے ہیں۔ قواہاں ہو رہی ہیں۔ خواجہ نظام الدین دیوانہ کی قبر پر دو ہزار روپے کی چادر لے کر ایک آدمی گیا، یہ کون سا دین ہے؟ مسٹر جناح کی قبر پر بیش قیمت گنبد کی تعمیر کون سی شریعت ہے؟ ہر جگہ عرسوں کی بھرمار ہے۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ یہ کس شریعت کی باتیں ہیں؟ کیا یہ یزید کا طریقہ نہیں ہے؟

دین کی بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہمارے لئے لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں اور پھر دینِ فحش میں ان کی اس خواہش کو تحریک کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نکاح و طلاق کے مسائل کی مثال واضح ہے۔ جلد بازی میں طلاق دے دیتے ہیں جب اپنے کیے پر نہ امت ہوتی ہے تو اس کے لیے راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ طلاق کے کتنے ہی ایسے معاملات ہیں جن میں لوگ غلط فہمی حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ طلاق جیسی اہم اور دوہیں چیز کو عائد کرنے سے پہلے اس پر

اچھی طرح غم کیا جاتا، کسی صاحبِ لڑائی عالم سے مشورہ کیا جاتا۔ طلاق دینے اور پھر اس کے اثرات کے متعلق پوچھا جاتا۔ مگر ہمارے معاشرے کا اصول یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اس کے اثرات کے لیے فتویٰ حاصل کرنے آتے ہیں کہ جی غلطی ہو گئی ہے لڑکے نے غصے میں آکر طلاق دے دی ہے۔ اب اس کا کوئی مل بتائیں۔ ہم چوبیس سال سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں اتنے عرصے میں صرف ایک آدمی نے طلاق دینے سے پہلے مشورہ کیا ہے کہ میرا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے پھر ہی کوشش کے باوجود نباہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ ہمیں طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ اور نہ باقی سب طلاق دینے کے بعد ہی آئے ہیں۔ کہ اب کسی طرح حلال کر دو۔ یہ دین میں تحریف نہیں اور کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تحریف کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ یعنی خود کچھ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور تحریف کے مرتکب ہوئے فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو انہوں نے کیا ہے یعنی غلط فتوے دیے اور تحریف کر کے جو دنیا انہوں نے کمائی وہ ان کے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حلال کی بجائے حرام کھیا ہے تو اس کی قیمت میں تباہی ہی آئے گی اسی بات کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْكُمْ لَمُكُوْنًا مُّوَارَاثًا بِاَنْبَاطٍ یعنی کتنے ہی پیرائے عالم ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھا جاتے ہیں۔ یہ باطل طریقے ہی ہیں۔ جو شرک اور بدعتِ رسوم کو اپنا کر اختیار کئے جاتے ہیں۔ جھوٹی کہانیاں سنا کر اور باطل عقیدے پھیلا کر لوگوں کا مال مضموم کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ایمان ضائع کئے جاتے ہیں۔ تو فرمایا اس قسم کی کمائی پر بھی لعنت تباہی اور بربادی ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے باطل عقائد کی تفصیل آرہی ہے۔ اور قانونِ نجات کا دوبارہ تذکرہ ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَنَّا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَخَذْتُ مَعْدُودَةً
 اللَّهُ عِندَهُ أَفَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا
 تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَاطِبُنَا
 فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ
 فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾

القصص

م

ترجمہ اور (یہودی) کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوٹے گی ہم کو (دوزخ کی) آگ
 مگر چند دن کے لیے۔ (اے پیغمبر) آپ فرمادیجئے کیا تم نے پوچھا ہے اللہ تعالیٰ کے
 پاس کوئی عہد پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا — بلکہ تم اللہ تعالیٰ
 پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۸۰﴾ کیوں نہیں جس شخص نے بُرائی کائی اور گھیر لیا
 اس کو اس کے گناہوں نے، وہی لوگ دوزخ دے دیے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے
 ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ وہی لوگ جنت دے دیے

ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۸۲﴾

یہودیوں کے
باطل عقائد

اس رکوع میں اہل کتاب کی ضربیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ
 نے کافروں سے امید قطع کرنے کا حکم دیا کہ یہ بڑے متعصب لوگ ہیں۔ آپ ان سے
 ایمان لانے کی امید نہ رکھیں۔ اس کے بعد ان کے دو طبقوں یعنی اہل علم اور ان پرست
 لوگوں کا ذکر ہوا کہ ان جابلو لوگوں کے پاس دین نہیں۔ بلکہ چند چھوٹی آرزوئیں ہیں مثال کے طور
 پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ایک چھوٹی آرزو یہ ہے کہ وَقَالُوا لَنْ تَمَنَّا النَّارَ
 وہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً مگر چند دن کے لیے
 جنت آ رہا ہے یہی مقصد ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ ان کی بات کو یوں بیان فرمایا لَنْ يَدْخُلَ

فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ اور اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی وعدہ تم سے نہیں کر رکھا ہے۔ اَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ البتہ ایمانداروں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر رکھا ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں سکھایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کہا کرو: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعٰهَدُ الْبَيْتَ فِیْ هَذِهِ الْحَیْوَةِ الدُّنْیَا یَعْنِیْ اے اللہ! میں تیرے سامنے اس دنیا کی زندگی میں عہد کرتا ہوں۔ بِاَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ یہ کہ تو ایک ہے۔ اور تیرا کوئی شریک نہیں دَانَ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ اور بے شک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں وَ اِنِّیْ رَاٰتُكَ اَنْتَ اَبْرَحِمَتِكَ اور مجھے صرف تیری رحمت پر ہی عبور دے ہے۔ رَنْ تَكْلِفْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ اگر تو مجھے میرے نفس کی طرف سوئپ دے گا۔ تَقْبِرْ بِنِیْ مِنَ الشَّيْءِ تَوْجِیْ شَرِّیْ قَرِیْبَ كُرْیْ گا۔ وَ تَبَاعِدْ فِیْ مِنَ الْخَيْرِ اَوْ رِیْیْ اور بھلائی سے دُور کر دے گا۔ فَاجْعَلْ فِیْ عِمْدِكَ عَهْدًا تَوْفِیْقِیْدَ یَوْمِ الْقِیَمَةِ پس ترمیم سے یہ عہد بنا دے کہ اس کو قیامت والے دن پورا کرے۔ اِنَّكَ لَا تَخْلِفُ اَیْمَانًا بے شک تو وعدے کو خلاف نہیں کرتا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص اس دعا کو دنیا میں پڑھے گا۔ تو اس کو قیامت والے دن اس کا بدلہ ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی عہد کرنا ہو تو وہ ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے ایمان کے بغیر کوئی عہد نہیں ہو سکتا جو انسان کے لیے دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن سکے۔ مگر اے بنی اسرائیل تمہارے پاس تو ایمان موجود نہیں۔ لہذا تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ ہم اذل تو دوزخ میں جائیں گے نہیں۔ اور اگر گئے بھی تو چند روز سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ بلکہ جنت میں آجائیں گے۔ یہ تو تمہارا عقیدہ بالکل فاسد ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائد باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا قانون تو آگے آرہا ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل

باطل عقائد
کی بنیاد

بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم و عمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزو میں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔ ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں روزِ آخر سے بچالیں گے۔

سنانوں کے
باعل عقائد

اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پر يَا شَافِعُ الْمُذْنِبِينَ کے نعرے مارتے جاتے ہیں۔ کہ ہم جو چاہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْضَىٰ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کر سکا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ خدا ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے ضرور ہی قبول فرمائے گا۔ یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے محض میلادِ مسخہ کر لینا، جلوس نکال لینا یا گیارہویں مہینہ کافی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے۔ شیعہ بھی یوں کہتے ہیں حضرت حسینؑ کا نام لے لو۔ ماتم بپا کرو۔ بس نخشے جاؤ گے کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب علم و عمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ساری عمر لوگ اسی دھول کو پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ کہ خدا چاہے۔ رضی ہو یا ناراض۔ نبی۔ ولی۔ جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہی ٹھوکر کھائی۔ اور ہم بھی اُسی راستے پر چل نکلتے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق ہوگا

قانونِ نجات

فرمایا ہے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے۔ جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔ سبکی بلکہ قانونِ نجات یہ ہے کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ جس شخص نے بھی گناہ کیا۔ اور اس کے گناہوں نے اُسے گھیر لیا۔ فَأُولَٰئِكَ مَتَّعْنَا النَّارَ يَوْمَ يَخْرُجُ مِنَ الدُّنْيَا۔ ہمارے جہنم میں داخل ہوں گے۔

ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا۔ جو سب سے بڑا ہو گا۔ اور چاروں طرف چھایا ہو گا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ قرآن پاک میں آتا ہے: **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ**۔ سب سے بڑے ظالم کافر ہیں۔ نیز فرمایا: **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ**۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ**۔ شرک کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ **وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ**۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے، معاف فرماتے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی کسی کو معاف فرمائے۔ وہ مالک ہے مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کریگا۔ یہ اُس کا اہل فیصلہ ہے۔ ہاں اگر سحرات موت طاری ہونے سے پہلے پستے اُس نے توبہ کر لی، تو وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے۔ جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہو جائیں۔ فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغْرَضِ** انسان کی توبہ غرضہ طاری ہونے سے پہلے مقبول ہے اس کے بعد نہیں۔

کافر اور شرک
دائمی جہنمی ہیں

اسی لیے فرمایا: **وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** جس شخص نے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا **فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا** ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اور ابدی جہنمی ہے اس کے لیے دوزخ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے۔ جسے ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ کھلم کھلا کفر پر اڑا رہا۔ البتہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر اور دوسری چیزوں پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتا جائے۔ یعنی اُس نے اپنے ایمان کو شرک کھاتا ہوا ملا لیا ہے۔ اور اپنے ایمان کو خراب کر لیا ہے۔ قرآن پاک نے اس مضمون کو بڑی تاکید کے ساتھ

بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منادی کرتے تھے۔ اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبَّنَا وَدَبِّكُمُ اللّٰهُ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو مت پکارو، اور نہ ان کی ایسی تعظیم کرو۔ جو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے، ورنہ شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نجات سے محروم ہو جاؤ گے۔ اِنَّهُ مَنُ يَشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَذَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنتِ عالم کر دی ہے۔ وَمَاؤُمُهُ النَّارُ۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہو گا۔

اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ لَا تَفْتَحُ لَهُمُ الْبُوابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سَوْءِ الْحِيَاظِ۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گزر جائے نہ دھنٹ سوئی کے ناکے میں گزرے اور نہ کفار کے لیے جنت کے دروازے کھلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے۔

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا اُمّی اَنْذَعُ مَا اَفْضَلُ حضور! کون عمل افضل ترین ہے، آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ سی لیے فرمایا وَالَّذِينَ آمَنُوا جو لوگ ایمان لائے وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے، ان کے متعلق فرمایا اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ۔ یہی لوگ جنت واسے ہیں۔ جنت کی چابی ان کے پاس ہے۔ اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہو گا، بَلْ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قانونِ نجات ہمارے پاس ہے۔ تم کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی دیگر برائیوں میں ملوث ہوتے ہو۔ اس کے باوجود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ یہ بالکل باطل خیال ہے۔

الْعَمَلِ

البقرة ۲

درس سی و پنج ۳۵

(آیت ۸۳)

وَلَا تَأْخُذْ بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَبِإِلَهِدَيْنِ
 إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَ
 أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ
 وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل کیا کہ تم اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ان باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور قرابت داروں
 کے ساتھ۔ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکین کے ساتھ۔ اور مولوگوں کے لیے نیک بات
 اور نماز کو قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دیتے ہو۔ پھر پھر گئے تم (بنی اسرائیل) بہت تھوڑے

تم میں سے اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۸۳﴾

رابط آیت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مختلف خطریاں بیان ہو رہی ہیں۔ پچھلے درس میں ان کے ان
 غلط عقائد کا ذکر تھا کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا یہ اللہ تعالیٰ
 پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں جو عہد
 بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اس کا ذکر ہے۔ اور وہ ایسا عہد تھا۔ جو کہ نہ صرف توراۃ میں تھا۔ بلکہ مت میں
 انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی موجود تھا اور اس کی تمام باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت
 میں بھی آگئی ہیں۔

توجہ کے
دو پہلو

اس آیت میں جس عہد کا ذکر آ رہا ہے۔ وہ عہد توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْخُذْ
بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل لیا تھا
 پختہ عہد کو کہتے ہیں۔ جو بڑا مضبوط اور پکا ہو۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ تم اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ لَا تَعْبُدُونَ کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ تم عبادت نہیں کرو گے
 درہنہ خبر کی صورت ہے۔ مگر حقیقت میں یہ حکم ہے۔ عِنَّا لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایسی بات کو خبر کی شکل میں ذکر کرنے کا مقصد اس میں زور پیدا کرنا ہے۔
 اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو تو پہلے گزرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے
 کہ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس کی توحید کو تسلیم کرو۔ وحدانیت کا دوسرا
 پہلو منفی ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ جہاں تک
 پہلے حصے کا تعلق ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ اور اس میں اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا کہ بھی اپنے رب
 کی عبادت کرو۔ مگر توحید کے دوسرے حصے میں جا کر اکثر گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگ شرک یا مبتدا
 ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگ حقیقی رب کی عبادت کے
 ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بائبل میں اگرچہ بہت کچھ تحریف ہو چکی
 ہے مگر توحید کا مسئلہ آج بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین
 کے اوپر خدا کے غیر کی عبادت نہ کرو۔ مجدد نہ کرو۔ صرف خداوند جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس کی
 عبادت کرو۔ مقصد یہ کہ توحید ایک مسئلہ ہے۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائط میں قدر مشترک کے
 طور پر موجود رہا ہے۔ آیت زیر درس میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لیے۔ بمجملہ ان کے تورات بنی اسرائیل نے
 میں یہ عہد تھا۔ جسے قرآن پاک نے بیان کیا وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا ذُرِّيَّتَكُمْ
 الْعَهْدَ یعنی اے بنی اسرائیل اس بات کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے نچتے عہد لیا تھا۔ اور تمہارے
 سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے عطا کیا
 ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اور پھر یہ بھی کہا تھا وَ اذْكُرُوا مَا فِيهِ جَوْ كُفَّهِمْ نے تورات میں نازل کیا ہے اس کو یاد کرو
 تورات میں یہ عہد بھی لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے چھپاؤ
 گے نہیں۔ یہ لوگ اصل احکام کو چھپا بیٹھے تھے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ مسائل لوگوں کو بتاتے تھے۔
 اللہ تعالیٰ کے حکم لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ لَا تَكْتُمُونَ ذُنُوبَهُمْ عمل نہیں کرتے تھے۔

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔
 نہ کرنا۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا۔ عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ہے کہ جسکی عبادت کرنا ہے۔ اس کی صحیح پہچان بھی ہو۔ اسی لیے سب سے پہلے رب تعالیٰ کی پہچان کرائی گئی ہے: **الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (۱) **الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** (۲) **مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ** (۳) یہ سب اللہ تعالیٰ کی پہچان ہی تو ہے۔ یعنی رب وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے: **الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ** وہی تمہارا بھی خالق ہے۔ اور تم سے پہلے آنے والے لوگوں کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے۔ اُسے فتنے فتنے کا علم ہے **اِنَّذِرْ لِّکُلِّ شَیْءٍ مَّحِیْطٌ** اس صفت کی پہچان ہو گئی تو توحید سمجھ میں آجائے گی۔ اسی طرح قادر مطلق ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہے **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ باقی تمام چیزوں کا وجود استعار ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے۔ کسی چیز کا حکم دینا یا کسی چیز سے منع کرنا بھی اس کی صفت ہے۔

اس کے علاوہ ان چیزوں کی پہچان بھی ضروری ہے۔ جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عاجزی اور جہالت سے پاک ہے۔ رافضیوں کا عقیدہ بالکل باطل ہے جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو بڑا بھی ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ کام کر لیتا ہے، بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یا جس طرح یہودیوں کا باطل عقیدہ ہے کہ بعض کام کر کے اللہ تعالیٰ نادم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے پہلے باب میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے خود بچھڑایا۔ تو ایسی یہودہ باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو مین کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تو دست بردار نہ ہوئے! سب سے پہلے ان لوگوں کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا **فَاِذَا عَزَمْتَ لِلّٰهِ عِزِّیْ** جب وہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح سے پہچان لیں، تو پھر انہیں خدا تعالیٰ کے احکام یعنی نماز، روزہ

زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے احکام بتلانا کہ اُس خدا تعالیٰ نے تم پر یہ فرائض عائد کیے ہیں۔ انہیں انجام دینا لازم ہے۔

والدین سے
حسن سلوک

بہر حال عہد کا پہلا حصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اُس کے سوا کسی دوست نہ کرو۔ عبادت نہ کرو۔ عہد کا دوسرا حصہ فرمایا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا صرف بنی اسرائیل کی شریعت میں ہی ضروری نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو شریعت محمدیہ کا بھی ایک لازمی جزو ہے: وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اہل فیصلہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا۔ اور پھر ساری مخلوق میں والدین کو سب سے اول نمبر پر شمار کیا۔ یہ احکام تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں موجود رہے ہیں۔ توراۃ اور قرآن پاک میں بھی موجود ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن سلوک کے سلسلے میں والدین کو کیوں مقدم رکھا ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق اور حقیقی مربی ہے اسی طرح والدین بھی اس مادی دنیا میں اولاد کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مقدم رکھا ہے۔ والدین جو احسان اولاد کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرما کر اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا اسی طرح والدین کے اپنی اولاد پر بے مثال احسان ہوتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ماں اور باپ میں سے کون مقدم ہے۔ تو اس کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ آپ نے فرمایا أَهْلَكَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ، اس شخص کے تین بار کے سوال کے جواب میں آپ نے ماں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ چوتھی دفعہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا

اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ گویا خدمت کے سلسلے میں ماں کو باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہے۔ لہذا خدمت کی زیادہ حقہ ار بھی وہی ہے۔ قرآن پاک نے ماں کے متعلق فرمایا: **حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ** یعنی ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر بچے کو بیٹ میں رکھا۔ اسی لیے محدثین عظام فرماتے ہیں: اگر ماں اور باپ دونوں کو یہاں تک مٹی ہوئی ہو۔ تو پہلے ماں کو پانی چلاؤ۔ کہ خدمت میں اس کا حق فائق ہے۔ مگر جہاں ادب و احترام مقصود ہوگا تو وہاں باپ مقدم ہوگا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت ترکِ ایذا ہے۔ ماں باپ کو قول سے یا فعل سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ احسان کے خلاف ہے۔ بلکہ اولاد کا فرض ہے کہ اپنے جسم اور مال کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر والدین مالی طور پر ضرورہ مند ہیں۔ تو ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو اولاد ان کو راحت پہنچائیں۔ مثلاً ان کی کھٹی چائی کریں۔ ان کو کھلائیں پلائیں۔ ان کو سنلائیں دھو لائیں وغیرہ وغیرہ۔

ماں باپ کی فقیہانہ کی کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا بھی ان کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے لیے استغفار کرو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ تاکہ ان کے لیے آخرت میں راحت کا سبب بنے۔

حضرت علیہ السلام کا ارشاد ہے: کہ اگر ماں باپ نے کوئی وصیت کی ہے۔ تو اولاد کو چاہیے کہ اُسے پورا کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سمجھا جائے گا۔

مسلم اور ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے: کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بے دولا۔ آپ نے اپنا گدھا اس بے دولا کو دے دیا۔ آپ کے سر پر چڑھائی تھی۔ وہ بھی بے دولا کے سر پر رکھ دی۔ ساتھیوں نے عرض کیا: حضرت! آپ کے پاس یہ ایک گدھا تھا۔ جو سواری کے کام آتا تھا۔ مگر آپ نے اس دیہاتی کو دے دیا۔ دیہاتی لوگ

۱۔ کتب المدری ص ۲۱۱ ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۳

۳۔ ابوداؤد ص ۲۴۲ ۴۔ ابن ماجہ ص ۲۶ ۵۔ مسلم ص ۲۱۱ ۶۔ جمع الفوائد ص ۱۶۹ ۷۔ بحوالہ مسلم ترمذی، ابوداؤد

تو معمولی چیز پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی قیمتی سواری تک مٹے دی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! اس کا باپ میرے والد کا دوست تھا۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا باپ کے ساتھ نیکی میں شریک ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بعض حدود بھی متعین ہیں۔ سورۃ لقمان میں واضح ہے: وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔ اگر ماں باپ تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی البتہ دنیا میں ان سے اچھا سلوک کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر والدین ترکِ فرض پر مجبور کریں، تو ان کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ مثلاً کسی پر حج فرض ہو گیا ہے۔ مگر ماں باپ روکتے ہیں۔ تو ان کی بات کی پروا نہیں کی جائے گی۔ قربانی واجب ہے۔ اگر والدین اس سے روکیں تو نہیں رکن۔ البتہ اگر سنتِ موکدہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالیں۔ تو ان کے کہنے پر ایک دودھ ٹانا جاسکتا ہے تاہم سنتِ موکدہ کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ نفلی عبادت کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر ماں باپ روکتے ہیں، تو قطعی طور پر رک جاؤ۔ ماں باپ کی بات مانو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نفل پڑھنا چاہتا ہے۔ اور والدین کہتے ہیں کہ ان کو تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ لہذا نوافل کے لیے مسجد میں نہ جاؤ۔ تو ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔ کفر و شرک پر آمادگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ماں باپ بدعات پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت نہیں کرنا ہوگی۔ مثلاً وہ کہیں کہ قبر پر سجدہ کرو۔ یا داتا صاحب بجا چڑھاؤ۔ فلاں جگہ نیانہ دے کر آؤ۔ تو ایسی باتوں کو نہیں ماننا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام تر حدود و قیود کے باوجود والدین سے حسن سلوک ہر حالت میں لازم ہے۔ رَبِّالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا کا یہی مطلب ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد فرمایا وَذِي الْقُرْبَىٰ یعنی قرابتداروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ قرابتداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم محرم قرابتداروں کی ہے۔ یعنی وہ قرابتدار

ذاتِ ان کے
مستحق

جو آپس میں محرم ہوں اور جس کو آپس میں نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بھائی، بہن، چچا، بھتیجی، پھوپھی، بھتیجی وغیرہ۔ قرابتداروں کی دوسری قسم غیر محرموں کی جیسے ماموں زاد، خالہ زاد، چچا زاد وغیرہ۔ فرمایا ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ رضاعی ماں کی خدمت کرو۔ دودھ والے رشتہ داروں کی مالی خدمت زیادہ موزوں ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے محتاج عزیزوں کی خبر گیری نہیں کرے گا۔ تو مجرم ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ فرمایا: **وَاتَّذَنُوا لِلَّهِ حَقَّ** قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ تو ان کی امداد کرو۔ یہ ان کا حق ہے اس کے بعد فرمایا **وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ** یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کے سرپر والدین کا سایہ نہ ہو۔ اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

یتیم، مسکین
اور فقیر

کہتے ہیں کہ جانوروں میں یتیم وہ سمجھا جاتا ہے جس کی ماں موجود نہ ہو۔ باقی چیزوں میں یتیم وہ چیز ہے جس کی نظیر نہ ہو۔ اور وہ نادر چیز ہو۔ جیسے ندرت یتیم۔ نادر قسم کا عمدہ ہیشمال ہوتی۔ مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا ہو۔ بیچارہ کثیر العیال، محنت، مشقت کرتا ہے مگر جو کچھ کماتا ہے۔ اس میں گزراوقات نہیں ہوتی۔ ایسا شخص بھی حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ محتاجوں میں ایک قسم فقیر کی بھی ہے۔ اور فقیر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بالکل ہی نادار ہو، اور جس کے پاس در وقت کاکھانا بھی میسر نہ ہو۔ ایسا شخص بھی محتاج ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ مال باپ کے حسن سلوک سے ہمیشہ آؤ۔ قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

الْعَمَلُ

درس پندرہویں

البقرہ

آیت ۱۲۳

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ قَدْ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿١٢٣﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور قرابتداروں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور کمزوروں سے نیک بات اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر گئے تم نے بنی اسرائیل مگر بہت بھڑے تم میں سے۔ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۱۲۳﴾

ان آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی جلد سازی کے ذریعے احکام شریعت سے اعراض کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی مفسد باتوں اور انبیاء علیہم السلام کی ایذا رسانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے آزادی حاصل کرنے کے بعد غرض شریعت کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے توراۃ عنایت فرمائی۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے عہد لیا تھا۔ جب انہوں نے لیت و عمل کیا۔ تو اُن کے سروں پر وہ طوفان علق کر کے انہیں ڈرایا گیا۔ اس عہد کی تفصیلات سورۃ اعراف میں آئی ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا۔ کہ یہ دوسرا عہد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تورات کے ذریعے بنی اسرائیل سے لیا۔ اور وہ یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ اقربتداروں یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: حضرت!

كَذٰلِكَ اَعْمَلُ اَفْضَلُ زِيَادَهُ مِمَّنْ عَمِلَ كُنُسًا هِيَ. تو آپ نے ارشاد فرمایا الصَّلَاةُ لَوْ قُتِلَتْ
یعنی نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔ اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ حضور! اس کے بعد کون سا عمل افضل
ہے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِشَرِّ الْوَالِدَيْنِ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ اُس شخص نے سربارہ پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے، تو آپ نے
فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔

تہذیبِ اخلاق

اصل بات یہ ہے کہ علم سے دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیبِ اخلاق اور اجتماعی حقوق۔
اخلاق میں آگے دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اصلاح عقیدہ اور اعمال صالحہ، جب تک عقیدے کی
اصلاح نہیں ہوگی کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ لہذا سب سے پہلے اصلاح عقیدہ ضروری ہے۔ اور
اس میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ تَعَالٰی
کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ جب عقیدہ درست ہو جائے تو پھر اعمال صالحہ بھی مقبول ہوں گے۔
تہذیبِ اخلاق کا دوسرا جزو اجتماعی حقوق ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں
والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت حاصل ہے۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ
منا چاہیے۔ اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کی کفایت
یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن پاک کی بیشتر سورتوں میں والدین کے ساتھ
حسن سلوک کے احکام موجود ہیں۔

اجتماعی حقوق میں قربتداروں کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ
حسن سلوک کی تاکید ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر کے ہوں، گلی محلے یا شہر یا ملک کے۔ سب کے سب
اجتماعی حقوق میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ بھی انسان کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اس لیے اجتماعی طور
پر اس کا بدلہ دینا بھی ضروری ہے اس کو عدل کہتے ہیں۔ عدل اور احسان تقویٰ کے درجہ ہیں
لہذا یہ سب چیزیں تہذیبِ اخلاق میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے۔ جو محض بنی اسرائیل
کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اُمت کے لیے بھی یکساں طور پر قابلِ عمل ہے۔

حسنِ کلام

الغرض! آیت زیرِ دیس کے پہلے حصے کی تشریح گذشتہ درس میں پیش کر دی تھی جس میں
دو چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین، قربتداروں

چیموں اور مکیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ آج آیت کے دوسرے حصہ کا ذکر ہے۔ **وَقُولُوا**
لِلنَّاسِ حَسَنًا اور کہو لوگوں کے لیے اچھی بات، مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ کوئی فرد واحد عام
لوگوں کے ساتھ نہ بدنی نیکی کر سکتا ہے۔ اور نہ مالی نیکی کر سکتا ہے۔ ایسے افعال وہ محدود لوگوں کے
ساتھ ہی انجام دے سکتے ہیں مثلاً والدین کی خدمت، ماں اور بدنی دونوں طریقوں سے کر سکتا ہے۔
اس طرح قربتداروں اور دوستوں کی مالی اعانت کر سکتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں عوام اناس کے
لیے انجام دینا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اجتماعی نیکی حاصل کرنے کے لیے **قُولُوا لِلنَّاسِ حَسَنًا**
کا حکم دیا۔ کہ اگر تم بدنی اور مالی خدمت نہیں کر سکتے۔ تو عام لوگوں کو اچھی بات ہی کہہ دو۔

اچھی بات کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب آپس میں
ٹو۔ تو ایک دوسرے کو سلام کرو۔ اور پھر اچھا کلمان دو ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔ **عَلَى**
مَنْ عَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو نہیں پہچانتے
اس کو بھی سلام کرو۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ سلام جو ہے۔ یہ مین
خَيْرُ خَصَالٍ اَوْ يُمْكِنُ اَوْ قَالَ اسلام ایمان کی بہترین خصلتوں میں سے ہے۔ یا فرمایا اسلام
کی بہترین خصلتوں میں سے۔ سلام کرنے کی حکمت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ ایسا
کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں مقام عطا کرے گا
جب کوئی سلام کرے تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو۔ قرآن پاک میں موجود ہے **"رُدُّوْهُ"**
سلام کا جواب ویسے ہی لوٹا دو یا اُس سے بہتر لوٹاؤ۔ فرمایا **الرَّايِبُ** شخص تمہیں **السَّلَامُ عَلَيْكُمْ**
کہتا ہے۔ تو تم اسے بہتر لوٹاؤ اور کہو **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ** صرف
السَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے والے کو دس نیکیاں ملیں گی اور **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ**
وَبَرَكَاتُهُ کہنے والے کو تیس نیکیاں حاصل ہوں گی۔

کسی کی نیکی کی طرف راہنمائی کرنا اور بُرائی سے روکنا یہ بھی حسن کلام میں داخل ہے جب

۱۔ تفسیر غزالی فارسی ص ۳۱۶ پرہ ما ۲۔ ترمذی ص ۳۸۵ ۳۔ ابو داؤد ص ۲۵۱ ۴۔ بخاری ص ۹۲ ۵۔ مسلم ص ۳۸

۶۔ بخاری ص ۹۲ ۷۔ مسلم ص ۳۸ ۸۔ ترمذی ص ۳۸۵ ۹۔ ابو داؤد ص ۲۵۱

وَرُحْمَانِ اَپس میں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی دعوت دیں۔ آپس میں دوستی کا اظہار کریں۔ اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو پکارتے، تو اچھے لقب سے پکارے قرآن پاک میں موجود ہے: وَلَا تَسْأَلُوا بِأَلَاءِ الْغَابِ ایک دوسرے کو بڑے اقباب سے مت پکارو۔ یہ سب باتیں قول اللہ میں حُسن میں داخل ہیں۔

اسی طرح فرمایا کسی غیر حاضر بھائی کا ذکر کرو تو اچھے طریقے سے کرو۔ اس کو برائی کیساتھ یاد نہ کرو۔ اگر کوئی مسلمان تم سے مشورہ طلب کرے۔ تو اس کو صحیح صحیح مشورہ دو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے: الْمُشْتَارُ مُؤْتَمَنٌ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اُسے امین سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ غلط مشورہ دے گا۔ تو خائن مقصور ہو گا۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ نادانستہ طور پر سڑات میں پڑا ہوا ہے۔ تو اُسے حُسن اخلاق کے ساتھ روکنے کی کوشش کرو۔ مگر اس سلسلے میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سختی اور نرمی دونوں اپنے اپنے مقام پر روا ہیں تبلیغ و تعلیم کرتے وقت ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا۔ تو فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا اس سے نرم لہجے میں بات کہنا۔ لَعَلَّهُ يَذَّكَّرُ اور بخشنی شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا اس کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ خود حضور علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک نے بیان کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لَبِثْنَا فِي مِثْرَةٍ مِّنْهُمَا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نرم مزاجی میں رہے۔ وَلَوْ كُنْتُمْ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ اگر آپ سخت مزاج ہوتے تو لافضول و مہربانی نہ ہو۔ تو لوگ آپ کے ارد گرد سے پھر جاتے۔ کیونکہ سخت مزاج شخص سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو نرم مزاج بنایا۔ آپ کو حُسن کلام کی توفیق بخشی اور اس طرح لوگوں کو آپ کے گرد جمع کیا۔

جب کسی کے ساتھ بحث و تمحیص کی نوبت آجائے۔ تو فرمایا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ حَسَنٌ تو اچھے طریقے سے دفع کرو۔ مناظرے کے وقت بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑو۔ اخلاق سے گری

ہوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ نرمی کالی کھوج۔ نہ نوبت پہنچی چاہیے۔ بلکہ نہایت احسن طریقے سے گفتگو ہونی چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد کرامی ہے مَا دَخَلَ الرَّفِيقُ فِي مُشْتَى إِلَّا دَانَهُ جِسْرٌ مِنْ زَمِيٍّ أَمْلَأَ كِيٍّ وَهُوَ زَيْنَتٌ نَخْتَلِيهِ۔ اور جس چیز میں شق آئے گی۔ وہ اسے عیب دار کر دیگی۔ (مَا دَخَلَ الْخَرَقُ فِي مُشْتَى إِلَّا شَانَهُ)

فرمایا ہر جگہ نرمی ہی سے اور نہیں چلے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر سختی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً تعزیر کے طور پر سزا مطلوب ہو یا جہاد میں کفار سے مقابلہ ہو تو وہاں پر سختی کرنا پڑے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو حکم دیا مَجَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ۔ آپ کافروں کے ساتھ جہاد کریں۔ وَاعْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اور اُن پر سختی کریں۔ کفار کے ساتھ جہاد نہوار کئے ذریعے ہوگا اور منافقوں کے ساتھ نہانی طور پر۔ یعنی اُن کے نفاق کو کھول کر بیان کریں تاکہ دوسرے مسلمان اُن سے بچ سکیں۔ یہ دروزں طریقے سختی کے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نرمی ملحوظ رکھتے ہوئے۔ شریعت کی حدود کا بھی خیال رکھا جائے۔ نرمی بھی اس وقت تک ہی گوارا ہے۔ جب تک شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ اگر ایسی نرمی برتنے سے شریعت کے اتباع میں فرق آتا ہو۔ تو ایسی نرمی جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنے لگ جائیں گے۔ تو شریعت کے احکام پر عمل ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی نرمی جس سے دین میں مہنت پیدا ہوتی ہو تو وہ حرام ہے

اہم ممبر باقرہ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ اس حُسنًا کا معنی یہ کرتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی اچھی بات کہو، جو تمہیں خود بھی پسند ہے۔ جو خود پسند نہیں کرتے وہ بات دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ فرماتے ہیں کہ اچھی بات میں دعوت الی اللہ، دعوت الی التوحید، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد النبی ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ طوئیک عمل کرتا ہے اور زبان سے یوں کہتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کا مطمح اور فرمانبردار ہوں۔ گویا یہ سب آپ کی بات ہے۔ اسی کو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا
 جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں مجنّد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں
 دیا تو فرمایا: قَوْلَ اللّٰہِ لَآ اَنْ یَّهْدِیَ اللّٰہُ بَیْتَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَکَ
 حُمْرَ النَّعَمِ۔ یعنی اے علی! اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب ہو جائے۔
 تو یہ بات تمہارے لیے عمدہ قسم کے اونٹوں سے بہتر ہے۔ مقصد یہ کہ لڑائی اصل مقصود نہیں بلکہ
 اس کے ذریعے اسلام کے راستے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ یعنی ”وَقَتْلُوهُمْ
 حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِیْہُمْ اَنْفُسٌ کُفْرًا“ سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک تمام فتنے فتنہ زدہ ہوائیں
 گویا لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا بھی قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا میں داخل ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بنی اسرائیل کے عہد کا اگلا حصہ یہ تھا: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی
 نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ نماز بنی عبادت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ نماز اَقْرَبُ الْعِبَادَاتِ
 لِعَقْرِیْبَةِہے۔ یعنی جو عبادات انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی ہیں۔ ان
 کی بنیاد اور جڑ نماز ہے۔ نماز کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنا
 تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نماز کو قائم کرو۔ اس میں کوتاہی نہیں کی جائے
 مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم
 پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بخل کو دور کر کے غریب اور مسکین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ
 تہذیب اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت قرآن پاک کی اس آیت
 سے واضح ہوتی ہے: لَکُمْ مَّا کُلُوا الْیَبْرَحَیْ تَنْفِقُوْا مِنْہَا یُحِبُّوْنَ۔ یعنی تم اُس
 وقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔ اور یہ مقصد زکوٰۃ سے
 بھی حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز روا
 رکھی جائے۔ اگر یہ تمیز اٹھ جائے۔ تو ردعائیت کیسے آئے گی۔ ہمارے ملک میں سارا معاشی نظام
 سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں سود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سود کی موجودگی میں تقویٰ کیسے حاصل

ہوگا۔ اور پاکیزگی کیسے پیدا ہوگی۔

دوسری طرف کفر والحادیہ ہے جس کی بنیاد انکارِ خدا پر ہے۔ ہر دو نظام ہائے معاش کا مقصد حصول دولت، عیاشی اور فحاشی ہے۔ سب کی سوچی دنیائیک ممدود ہے۔ صنعت و حرفت، سائنس اور ٹیکنالوجی غرض مادی ترقی منستے مقصود ہے۔ لہذا انیس انسانیات کی ترقی کا کوئی علم نہیں کہ وہ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے جس پر آخرت اور دائمی زندگی کا دار و مدار ہے۔

بہر حال یہاں پر نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادات کا ذکر ہے۔ ایک جسمانی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت۔ قرآن پاک میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر بتیس مرتبہ آیا ہے۔ بنی اسرائیل کو بھی تاکید تھی کہ ہر حالت میں نماز پڑھو اور اگر مال نصاب تک پہنچ جائے۔ تو اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ نماز کی اس قدر تاکید ہے کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَاجًا أَوْ زُكَّانًا پس اگر کسی قسم کا خوف ہو تو بھی نماز معاف نہیں ہے۔ تم پیدل ہو یا سواری پر ہو۔ نماز بہر حال پڑھنی پڑے گی۔ سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل سے یہی فرمایا لَیْسَ بِیْكُمْ الْقِلْوَةُ وَانْتُمْ الزَّكَاةُ وَاهْتَمُّوا بِرُسُلِیْ وَهَذَا زُكْمُكُمْ یعنی اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے۔ اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے۔ تو میری مہربانیاں تمہارے شامل حال رہیں گی مگر بنی اسرائیل نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہ کی۔ بَلْ كُنتُمْ تَقُولُونَ لَوْ لَئِنَّا كُنَّا نَحْمِلُ غُرَابًا لَّأَقْبَلْنَاهُ فَبِمَا كُنَّا كَافِرِينَ لَمَّا جَاءَنَا مُوسَى بِآيَاتِهِ بَاطِلًا كَذِبًا مگر تم میں سے بہت ٹھوٹے ایسے تھے جو اس عہد پر قائم ہے۔ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ اور تم اعراض کرنے والے ہو۔ تم نے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کیا۔ اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ اس کا نتیجہ کتنا بُرا نکلتے گا۔ اور تمہارا حشر کتنا عبرتناک ہوگا۔

وَلَا تَأْخُذْ بَعِثَاتِ الْفُتُورِ ۚ تَتَّبِعُونَ الْأَمْرَ فَمَا هُوَ لَا تَأْخُذْ بِأُمُورِ الْغَايِبِ ۚ أُولَٰئِكَ يُشْغَوْنَ بِالْأَمْرِ الْكِبَرِ ۚ

۸۵) ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتَرْجُونَ

فَرِيقًا مِنْكُمْ مَنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِإِذْنِكُمْ

وَالْعُدُوَّ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسْرَىٰ تَقْدُواهُمْ وَهِيَ مُحَرَّمَةٌ

عَبْدُكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ

بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ ۸۶

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا

الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ

وَلَهُمْ يُنْصَرُونَ ۝ ۸۷

ج

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پتہ چلایا تھا کہ آپس
 میں غوریزی نہ کر دو گے۔ اور نہ ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نکالو گے۔ پھر تم
 نے اقرار کیا۔ اور تم اس پر گواہ ہو ۝ ۸۵ پھر تم وہی ہو۔ جو ایک دوسرے
 کو قتل کرتے ہو۔ اور نکالتے ہو تم ان کو وطنوں سے۔ تم چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ اور
 زیادتی کے ساتھ۔ اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں۔ تو مذہب دیکر ان کو چھڑا لیتے
 ہو۔ حالانکہ ان کا تھکان بھی تم پر حلیم ہے۔ کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے
 ہو۔ اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پس جو کوئی ایسا کرتا ہے تم میں سے۔ تو
 اس کا بدلہ سوائے اس کے نہیں ہے۔ کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے۔
 اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لٹائے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان باتوں

سے بے خبر نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو (۸۵) یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خریدا ہے۔ پس ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی (۸۶)

بنی اسرائیل کی غمہ شکنیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس عہد کا بیان ہو چکا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی حقوق اور انسانی حقوق سے متعلق بنی اسرائیل سے بذریعہ توراۃ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو پورا بھی نہ کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر چند آدمیوں کے ساتھ سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور تم تو اصرار کرنے والے ہی ہو۔

خون ناحق اور جلا وطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو باتوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا۔ کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاذْخُذْنَا هَيْثَ أَفَكُمُ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا لَا تَقْتُلُونَ دِمَاءَكُمْ کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے۔ جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورۃ نساء سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ فرقان میں آئے گا۔ کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطعاً حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا وَلَا تَحْبِرْ جُورَ الْفُسُكَةِ قَبْلَ دِيَارِكُمْ یعنی تم اپنے ہم ملک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فرمایا أَقْرَبْتُمْ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفاء کریں گے۔ اور توراۃ کے حکام کی پابندی کریں گے۔ وَأَنْتُمْ قَدْ شَهِدْتُمْ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا۔ کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلا وطن کر دو گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم ان قلم تر و عددوں کے باوجود أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ الْفُسُكَةَ یہ تمہیں ہی ہوا جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو

ناحق خون بہاتے ہو۔ وَتُخْرِجُوْنَ فِرْعَوْنَ مِّنْ دِيَارِهِۦ اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بھی نکالتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ ظہر و دل علیہم بالاثم والعُدوان تم ان پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور تعدی کے ساتھ۔ کسی پر حملہ کرنا انہیں جانی اور مالی نقصان پہنچانا گناہ بھی ہے۔ اور مظلوموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اور خلق خدا کے حقوق ضائع کر کے زیادتی کا ارتکاب کیا۔ یہ اثم اور عدوان میں آتا ہے۔

فرمایا تمہاری عجیب ذہنیت ہے کہ جن لوگوں کو تم جلاوطن کرتے ہو وَإِنْ يَأْتُوكُمُ اسْلَٰوِيْ جَبَّ يٰۤی لَوْكُمَاۤیے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تَفْدُوْهُمْ تَمَّ اُنہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو۔ پہلے خود ہی انہیں گھروں سے نکال کر اور پھر ان کا معاوضہ دیکر انہیں واپس لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مُحَرَّرٌ عَلٰیكُمْ اٰخِرَ اَجَلِهِمْ ان کا جلاوطن کرنا ہی تم پر حرام تھا تمہیں ایسا کام کرنا ہی نہ چاہیے تھا جس کی وجہ سے تمہیں فدیہ کا مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دراصل بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے نہیں قیدیوں کی رہائی کی قطعیت کی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی مگر جہاں یہ لوگ اس حکم پر عمل کرتے تھے وہاں دوسرے دو احکام یعنی قتل ناحق اور جلا وطنی کے معاملہ میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفَسَوْۤمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضِہٖ کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ جس حصے پر چاہا عمل کر لیا۔ اور جس کو چاہا چھوڑ دیا۔ فَعَاۤجِزَآءٌ مِّنْ یَّفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ مِثْلُكُمْ تم میں سے ایسا کرنے والوں کی جبر اس کے سوا کچھ نہیں کہ اِلَّا خِزٰی فِی الْحَیٰۃِ الدُّنْیَا دُنْیَا میں انکی جزا ذلت ہوگی۔ وَلَیُّوْہُنَّ نٰعِیْمَةٌ یَّرٰوْنَهَا اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے روز سخت عذاب کی طرف لڑائے جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہود۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور خیبر والے سب ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہوئے۔ بنو قریظہ سخت سازشی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا حشر بہت بُرا ہوا بعض قتل ہوئے اور بعض کو جلاوطن کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ بنو قینقاع والوں نے بھی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ حشر میں

تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو ان کی زندگی میں عذاب ہوا۔ فرمایا آخرت کا عذاب تو سخت ترین ہو گا۔ اور یہ لوگ اس میں بھی مبتلا ہو گئے۔

یہودیوں کی
بامی لڑائیاں

ان آیات میں یہودیوں کی جس بامی جنگ و جدل اور جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق حضرت شیخ المنہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ جو اکثر آپس میں دست گردیاں بستے تھے۔ ان کی آبادی ہزاروں کی تعداد میں پہنچی تھی۔ جب مدینہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو انصار مدینہ کی اکثریت بھی انہیں دو قبلوں میں سے تھی۔ اب بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حامی تھے۔ اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ گویا یہودی اس طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آتا، تو وہ مغلوب کو جلا وطن کر دیتا یا ان کو قتل کر دیتا اور ان کے مکانوں کو گرا دیتا۔ یہ سب ہم مذہب تھے۔ مگر دوسرے قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر یہی لوگ جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا تھا مال اکٹھا کرتے اور ان کا معاوضہ ادا کر کے انہیں قید سے رہائی دلاتے۔ یہ لوگ قیدی کو چھڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کشت و خون اور جلا وطنی کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مفسرین کرام مشرکین کی ایک دوسری لڑائی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ جسے حرب بعاث کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں بھی یہودی مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ایک فریق جنگ کے ساتھ تھا۔ جب کہ دوسرا قبیلہ دوسرے کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں بھی یہودیوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اگر کوئی ہم مذہب بھی سامنے آگیا اُسے بھی مار ڈالتے تھے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مکه ایران کی طرف کسی جہاد میں مصروف تھے۔ اسلامی فوج میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی شامل تھے۔ جو ایک یہودی عالم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے مشرف کیا تھا۔ جب جہاد میں مکہ انوں

کو فتح حاصل ہوئی۔ تو بہت سے قیدی بھی ہاتھ آئے۔ جن میں وہ یہودی بھی شامل تھے۔ جو کہ مجوسیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہودی عورت لونڈی بن کر آئی۔ جسے حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے نو تھوڑے ہم میں خرید لیا۔ جب آپ کو فریسی واپس آئے۔ تو وہاں کے ایک مشہور و معروف یہودی، اس الجالوت سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے یہودی کو وہ لونڈی فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ اور قیمت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اسے نو سو درہم میں خریدا ہے۔ مگر اب میں چار ہزار درہم سے کم پر نہیں دوں گا۔ پہلے تو اس الجالوت اتنی بڑی رقم مینے پر تیار نہ ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے اس کے کان میں توراۃ کی وہی آیت پڑھی **وَإِنْ يَأْتِوكُمُ اسْرٰی تَفْدُوْهُمْ عَمَّاۤیَۤیۡنَ حَتّٰی تَمْلٰکُوْهُمۡ قِیۡدِیۡنَ** بن کر آئے تو اُسے چھڑا لو۔ یہ سُن کر یہودی مجبور ہو گیا۔ اور اُس نے چار ہزار کے بدلے میں ہی خریدنا منظور کر لیا۔ مگر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے دو ہزار درہم سے لے لیا۔ باقی دو ہزار واپس کر دیے۔ اور اس طرح لونڈی اس کے پاس فروخت کر دیں۔ معتمد یہودی قیدیوں کو چھڑانے والے حکم پر سختی سے کار بند تھے۔ اگرچہ در سکرا احکام کی پروا نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کی
حالتِ زار

یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن پاکؑ نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو آج کل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ کہ قرآن پاکؑ کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جاتی ہے۔ دیکھیے کابل والوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ افغانستان پر غیر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہی حال اس سے پہلے سمرقند اور بخارا کا راقی فلسطین میں کیا ہو رہا ہے۔ بکالیوں کو کون سی عزت نصیب ہو رہی ہے۔ یہ سب ذلت و رسوائی نہیں تو اور کیا ہے؟

وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کر لیا۔ جو حکم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و طلاق کہ وہ یا کسی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ عدل احسان اور تقویٰ کو فراموش کر دیتا ہے۔

محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا شرعی یودیوں سے مختلف نہیں ہے۔ جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا، تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ تم اپنے ذاتی معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل کر سکتے ہو؟ مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت کا قانون وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ بسم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادت تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں۔ مگر تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لیے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سیودی اور مسلمان برابر ہیں۔ نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دور بینی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو گا۔

فَرَّيَا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اُس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اُس لیے وہ اسی کے مطابق جزائے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی۔ تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ جب وہ عذاب میں جکڑے جائیں گے فَلَا يَخَفُّ عَنْهُمْ الْعَذَابُ تو پھر ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ
عالم الغیب ہے

الْمَا
درستی و درشتی

البقرة ۲

(آیت ۸۷، ۹۰)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ رَافِقِينَ مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَأَتَيْنَا
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ
رَسُولٌ بِمَا لَمْ تُحْيُوا أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِقْنَا كَذِبْتُمْ
وَفَرِقْنَا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ
بِكُفْرِهِمْ فَهُمْ قَلِيلٌ مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
كِتَابُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ قَلَمًا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا
كَذَّبُوا بِهِ فَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾ بِسْمَا أَشْرُوا بِهِ
أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ
مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا وَبَغَضِبَ عَلَى
غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٩٠﴾

ترجمہ: اور اب اسے تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور ہم نے ان کے
پیچھے بہت سے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بینات (واضح اور کھلی باتیں)
دیں۔ اور ہم نے ان کی پاک روح کے ساتھ تائید کی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس رسول
کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے۔ تو تم نے ٹکڑیاں پس
ایک فرقہ کو تمہارے بھلا دیا، اور ایک کو قتل کر دیا ﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا، ہمارے
دل غلافوں میں ہیں۔ ہمیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ ان کے کفر کی وجہ سے
پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ
کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی، جو ان کے پاس ہے۔ اور اس سے
پہلے وہ کافروں پر فتح مانگتے تھے۔ اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے

انہوں نے پہچان لیا تو اس کے ساتھ کھڑا کیا، پس کھڑے کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے (۸۸) وہ بری چیز ہے جس نے بے انہوں نے پٹ نسروں کو بیچا ہے۔ کہ کھڑے کرتے ہیں اس چیز پر جس کو اللہ نے تار ہے۔ سرکشی کرتے ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارتا ہے۔

پس یہ لوگ غضب پر غضب بے کرنے اور کافروں کے لیے ذلت ناک خدا ہے (۸۹)

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے مختلف عہدوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جن کی پابندی کرنے کا کتاب اور رسول سے یہ قوم قاصر رہی۔ اب بعض دوسرے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے کیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے ان انعامات کے ایک یہ بھی تم کو و لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ یعنی بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب توراہ عطا فرمائی تاکہ بنی اسرائیل اس کے ذریعے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور پھر یہ کہ صرف کتاب پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب میں مذکور احکام کی یاد دہانی کے لیے وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلے درپے رسول بھیجے۔ جو توراہ کی تعلیم کو تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کا مبعوث ہونا بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے انبیاء علیہم السلام لوگوں کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی راہنمائی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قدر پیغمبر بھیجے ان میں سے بعض کا نام بھی قرآن پاک نے ذکر کیا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام یونس علیہ السلام زکریا علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام اور پھر سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح توراہ اور یہودیوں کی دیگر کتب میں بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مجموعی طور پر تقریباً ہزار پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلہ بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ صاحب کتاب اور اللہ تعالیٰ کے عظیم المہرت رسول ہیں چنانچہ آپ کے معلق ارشاد ہوتا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
و معجزات

وَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَاتِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ اور ان سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے۔ اور جو قرآن پاک میں مذکور ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑی کو تندرست کر دینا۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور اُسے ہوا میں اڑا دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ قیامت سے احکام اور دلائل بھی مراد لیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احکام بھی دیے تھے اور دلائل بھی دیے تھے۔

عیسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ عیسیٰ۔ یسوع یا یسوع کا معنی مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام مریم رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کی نانی نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُسے بیٹا عطا کریگا۔ تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقت کر دیگی مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اُس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ ہم نے اُسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ حضرت مریم کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے: **يُصْرِّحُ** **إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰكَ وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفٰكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ** یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے، اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا تصور کرتے تھے۔ بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود خدا، خدا کے بیٹے یا متینوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

روح القدس

فرمایا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عنایت کیں۔ اور اس کے ساتھ **وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ** اس کی تائید ہم نے پاک روح سے کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یعنی ہم نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اس بات کی تائید قرآن پاک کے دو سکر مقام پر بھی ہوتی ہے۔

نزل قرآن کے متعلق ارشاد ہے: نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ ۖ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ
 مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ اس قرآن پاک کو روح الامین یعنی جبرائیل علیہ السلام نے آپ کے قلب
 مبارک پر نازل کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے شاعر حسان بن ثابت کو
 حکم فرماتے: تو وہ مشرکین کو شعروں میں جواب دیتے اور فرماتے روح الامین کی تائید منائے ساتھ
 ہوگی۔ تم ان کا فزوں کو جواب دو۔ تو یہاں بھی روح الامین سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہی ہیں۔
 بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد اسمِ عظیم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء
 میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے انسان کی دعا قبول ہو
 جاتی ہے اور اسی اسمِ عظیم کی برکت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مجربے کا انبار ہوا تھا جب
 آپ مرنے کو زندہ کرتے تھے۔ یا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے۔ تو یہ اسمِ عظیم کی
 برکت سے ہوتا تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ روح القدس ملائکہ اعلیٰ کے فرشتوں کی
 مسلسل توجہ کا نام ہے۔ ان کی حکمت کے مطابق ملائکہ اعلیٰ کے فرشتوں کا حظیۃ القدس
 جیسے پاک مقام پر توجہ کرنا روح القدس کے آداب ہے۔

انبیاء علیہم السلام
 کے ساتھ سلوک

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد بنی اسرائیل کے
 اپنے پیغمبروں کے ساتھ عام طرزِ عمل کا ذکر کیا کہ اے بنی اسرائیل! اَفْكَمًا جَاءَ كُمْ
 رَسُولٌ اٰمَنًا لِّهَقْوٰی اَفْئُكُمْ مُّجِیْبٌ مِّمَّا سَآءَ پَسِ كُوْنِیْ رَسُوْلٌ اِیْسٰی حٰیْزٌ كَرَّیْ
 جَسَ مَہَا نَفْسٌ لِّسَنَہ نِیْسٍ كَرَّیْ تَسَ اَسْتَكْبَرُ كُمْ تَوَقُّمَ تَجَرُّیْ تَجَرُّیْ كِیْ بَیْہَا رِیْ
 اسرائیلیوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ احکام کی نافرمانی، تجراندہشی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔
 فرمایا بنی اسرائیل! تم نے اسی تکبر کی وجہ سے فَفَرِیْقًا كَذَبْتُمْ اَنْبِیَاۥہُمْ اَلِیْمٌ اَلِیْمٌ
 کے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا وَفَرِیْقًا قَتَلْتُمْ اَوَّیْمٌ زَبَدٌ كُوْتَلَّیْہُمْ اَلِیْمٌ اَلِیْمٌ اَلِیْمٌ اَلِیْمٌ
 میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ موجود ہے۔ حدیث شریف میں تو ایسے سینکڑوں نبیوں

ذکر آتا ہے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دگ فغانی خواہشات کی اتباع اور عذائی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

یہودیوں کا
زعم باطل

یہودیوں کو ایک اور غلط زعم تھا۔ کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعویٰ تھا وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔ یہ ان کی خود ستائشی تھی۔ کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا ج سکتا۔ ان کا یہ نظریہ واقعی مبنیٰ پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کر سکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ وہ تو خود اپنا دین بگاڑ پکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات لے کر اجید علیہم السلام آتے۔ وہ انہیں جھٹلاتے یا قتل کر دیتے۔

یہودی پر اللہ تعالیٰ
کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کے دل محفوظ ہیں۔ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ حَقًّا۔ مسلمان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنی رست سے روک کر دیا ہے۔ ان کے قلب مٹکوس ہو چکے ہیں۔ اور فہم الٹ گئے ہیں۔ بہ حق بات کو نہ سمجھتے۔ یہی وجہ ہے فَقِيلَ مَا يُوَسُّوْنَ وَاَنْ كُنْ تَقِيلُ تعقل و ایمان لانے۔ سورۃ مائدہ میں کسی چیز کو فرمایا وَاَنْ كُنْ تَقِيلُ یعنی تم میں سے اکثر منافق ہیں۔ اگرچہ سلسلے کے سائے نافرمان نہیں تھے۔ بائیں انہیں بلکہ نہیں ہوئیں۔ لَيْسُوا سَوَاءً مگر اکثریت ملعون ہی تھی۔ ایمان کی روایت چند لوگوں کے پاس ہی رہی تھی۔

یہودیوں اور
نزدول قرآن

یہ تذکرہ تو یہودیوں کی اپنی کتاب تورات کا تھا کہ انہوں نے اس کے احکام کی اس نہایت پابندی کی کہ اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے سارے نبیوں نے کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ قَالُوا هَذَا كِتَابٌ مِّنْ سِوَاكَ نَحْنُ كَافِرُونَ۔ ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جَوَانِ کِتَابُوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتب میں زبور، تورات، انجیل اور دیگر صحیفہ کا یہ ہیں یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا۔ کَفَرُوا بِآيَاتِهِ۔ تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ تاکہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتبوں کی حدیث کر رہا ہے۔

لفظ "كَفَرُوا بِآيَاتِهِ" بعد میں آتا ہے۔ آیت کے درمیان تفسیر یہودیوں کی ایک روایت کا ذکر ہے۔ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یعنی نزول قرآن سے پہلے وہ کفار پر فتح مانگتے تھے۔ مغربین کہتے ہیں کہ یَسْتَفْتِحُونَ کے دو معنی ہیں۔ فتح کے معنی کھولنے کے ہوتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے تفسیر یہ ہے۔ بنی اسرائیل کفار پر اس بات کو کھولتے تھے۔ یعنی بیان کرتے تھے کہ تمہاری بنی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب آنے والی ہے۔ اُس پر ایمان لانا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ الَّذِي يَجْذُوْنَا ذَٰلِكَ مَكْتُوبًا عِنْدَ مَوْلَانَا۔ وَارِثُ الْخَيْلِ۔ یعنی وہ اپنی کتابوں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ کہ آخر بنی اسرائیل نے وارث ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے صیغہ میں بھی بشارت ہے کہ میں تمہارے میں آئی بنی بھیجوں گا۔

یَسْتَفْتِحُونَ کا دوسرا معنی فتح یا کامیابی ہے مغربین کا یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کافروں کے مقابلے میں فتح یا کامیابی طلب کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ یا اللہ ہمیں اس آئے والے بنی کی برکت سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما۔ تاکہ جب وہ بنی آئے تو ہم اس کی اتباع کر سکیں۔ گویا بنی آخر الزماں کے توسل سے مانگتے تھے

نظر توکل

نظر توکل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی عرج نہیں۔ کیونکہ مانگی تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اُس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے۔ ہاں شرک اس وقت ہوگا جب اس کے توکل کی بجائے خود اُسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح شمع سمجھے یا اس کو مختار مطلق سمجھے کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

بہر حال پہلے تو یہ لوگ اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور وعدہ کرتے تھے کہ اے نبی! یہ ایمان لائیں گے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ پس جب وہ چیز آگئی جس کے وہ منتظر تھے۔ مَاعَرَفُوا اور اُسے انہوں نے پہچان بھی لیا کَفَرُوا بِہ اس کے باوجود اس کا انکار کر دیا ان کی اس مٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَعَنَهُ اللہُ عَلَى الْكَافِرِينَ ایسے منکرین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

بنی آخر الزمان
صلی اللہ علیہ وسلم
سے نہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ظالموں نے ایسی بُری حرکات کر کے کیا کھایا۔ بِسْمَا اسْتَمُوا بِہ اَنْفُسُہُمْ انہوں نے نہایت ہی بُری چیز کے بدلے اپنی جانوں کو بیچا وہ کون سی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے خریدی اَنْ یَّکْفُرُوا بِمَا اَنْزَلَ اللہُ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی کا انکار کر دیا۔ اور یہ محض اس لیے بغیاً شرارت کرتے ہوئے۔ کہ بنی آخر الزمان دوسری قوم میں کیوں آگیا۔ وہ تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تھا۔ وہ بنو اسماعیل میں کیسے آگیا۔ چنانچہ قرآن پاک نے جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ آخری نبی ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے اَنْ یُّنَزِّلَ اللہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ اتار دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی بھیجے۔ مگر بنی آخر الزمان کی بعثت بنی اسماعیل میں مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ وہیں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جب کہ آخری نبی آگئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کا

فرمن تھا کہ وہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لاتے اور ان کا اتباع کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے غاندانی تفوق کا دم بھرنے لگے جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

بنی اسرائیل کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَبَاءُ وَبِغَضِبِ عَلٰی غَضِبِ وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ منہ پر محو کا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ و جال کہا۔ انہیں ایذا پہنچائی۔ کتب کا وہ یہ میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اور جیلے بانوں سے خدائی احکام کو مٹا لایا۔ اور پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب بنی آخر الزمان علیہ السلام تشریف لائے اور آخری کتاب نازل ہوئی تو ان کا انکار کر دیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْيَهُودُ مَعْصُوبٌ وَ النَّصَارَى صَدَلٌ یعنی یہود معضوب علیہ ہیں اور نہ ماری گمراہ۔

معضوب اُسے کہتے ہیں جو دیدہ دانستہ احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ شریعت برحق ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔ یہی خرابی بنی اسرائیل میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ پہچانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ آخری نبی اور آخری کتاب ہے مگر ایمان نہیں لائے۔ علاوہ ازیں ضلال وہ ہے۔ جسکے فہم میں خرابی آجائے۔ اور وہ بھٹک جائے۔ نصاریٰ ضلال ہیں۔ یہ غلطی کرنے والے ہیں۔ فرمایا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ یاد رکھو! انکار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دردناک عذاب تیار ہے اگر اس عذاب سے پہنچا ہے تو آج بھی راہ راست پر آجاؤ۔ ورنہ تو تمہارے مقتدر میں ہوجکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے حالات منکشف کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر رہے ہیں کہ تم بھی یہودیوں کی روش اختیار نہ کر لینا۔ بلکہ ان کی خرابیوں کا ذکر سن کر اپنی اصلاح کر لینا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا تَوُفُّ مِنْ بِنَا أَنْزَلَ
 عَلَيْنَا وَيكْفُرُونَ بِمَا وَرَدَتْهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ
 قَدْ فِيهِ تَقْتُنُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
 ⑨۱ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اخْتَلَفْتُمْ إِلَيْهِ مِنْ
 بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ⑨۲ وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا
 فَوْقَكُمْ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا
 وَعَصَيْنَا وَأُثِرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلُ بِكُفْرِهِمْ قُلْ
 بِسْمَايَا مُرْكُمُ بِهِ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ⑨۳ قُلْ
 إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ
 النَّاسِ فَمَتَمَنُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑨۴ وَلَنْ
 يَتَمَنَّوهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ
 ⑨۵ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ وَمِنَ الَّذِينَ
 أَشْرَكُوا يُوَدُّ أَحَدُهُمْ أَنْ يُعَمَّرَ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ
 بِمُرْضِيهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا
 يَعْمَلُونَ ⑨۶

مع
 عند
 العذاب
 ۹۶

ترجمہ: اور جب ان (اہل کتاب) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس
 چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ (یعنی قرآن) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز
 پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ (یعنی تورات) اور اس کے سوا
 کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے۔ اور تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو
 ان کے پاس ہے۔ آپ فرمادیکھئے، پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالیٰ

کے انبیاء کو اس سے پہلے اگر تم ایمان دالے ہو ﴿۹۱﴾ البتہ تحقیق تمہارے پاس
 موسیٰ (علیہ السلام) کبھی نشانیاں لائے۔ پھر اس کے بعد تم نے کچھڑے کو معبود بنالیا۔
 اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۹۲﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عمل لیا۔ اللہ ہم نے
 تمہارے اوپر کوہ طور کو اٹھایا۔ خبر دو جو ہم نے دیاست تم کو مضبوطی کے ساتھ اور سنو۔
 انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور ان کے دلوں میں کچھڑے کی محبت پڑادی
 گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ بُری بات ہے جس کے لیے تمہارا
 ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔ اگر تم ایمان دالے ہو ﴿۹۳﴾ آپ فرم دیجئے کہ اگر اللہ
 کے نزدیک نہ ت کہ تمہارے لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے غاص ہے
 پس تم موتوں میں نہ رہو، اگر تم چتے ہو ﴿۹۴﴾ اور وہ اس موت کی ہرگز متا نہیں
 نہیں گئے کبھی بھی۔ اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ
 تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ﴿۹۵﴾ اور البتہ تم ان لوگوں کو زندگی پر
 زیادہ عرصے پانے لوگوں سے بھی اور ان سے بھی زیادہ عرصے جنہوں نے شرک
 کیا ان میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دے دی جائے۔ حالانکہ
 عمر اسے خدا کے عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے اگر اس کو اتنی عمر دے
 دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ یہ کام کرتے ہیں ﴿۹۶﴾

یہودیوں کی قباحتیں اور ان کی سزائیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں
 یہودیوں کی بڑائیوں اور ان کے کفر پر اصرار کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ غلام البینین سالی علیہم
 کی آمد سے پہلے یہودی ان کے منتظر تھے کہ جب وہ بنی آخر الزمان آئے گا۔ تو اس کا ساتھ دیں
 گے۔ یہودی لوگ آپ کی برکت سے مشرکین پر غلبہ حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور اس کے
 لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ مگر جب وہ رسول آگیا جس کا انتظار تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آفندی نہ آ
 بھی آگئی اور ان لوگوں نے پہچان بھی لیا، تو پھر انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دوبرے غضب
 میں مبتلا ہونے۔

ان آیات میں بھی یہودیوں کی مہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ البتہ یہاں ان کو قرآن پاک دعوت ایمان

اور ایمان کی دعوت دے گی۔ ارشاد ہوتا ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ
 جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک
 کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کر لو۔ قَالُوا نَفَرْنَا مِنْكُمْ إِنَّمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا آيَاتٍ
 ہوتا ہے کہ تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی توراہ۔ کہتے ہیں کہ ہم
 تو صرف توراہ کو ماننے میں دیکھتے ہیں کہ وَيَكْفُرُونَ بِمَا دَرَأَوْا۔ اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔
 حالانکہ وہ الحق قرآن پاک بحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور هُصْصَ قَالِمًا
مَعَهُمْ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ یعنی توراہ۔ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا
 توراہ پر ایمان لانے کا دعوے بھی جھوٹا ہے۔ اگر ان بدبختوں کا توراہ پر ایمان ہوتا تو یہ حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہذا
 یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام کتابوں
 پر ایمان نہیں دے گی، وہ مومن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام کتب سماویہ کی بنیادی تعلیم تو ایک ہی ہے
 یعنی ایمانیات اور عبادت کے معاملہ میں تمام کتابیں مادی ہیں شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ
مَا وَصَّي بِهِ نُوحًا یعنی تمہارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام
 اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ مختلف زمان و مکان کے
 لحاظ سے شریعت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ جیسے فرمایا: بِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ
شُرْعَةً وَ مِنْهَا حَا

قتل انبیاء
 علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے جھوٹے ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے۔
 ان سے پوچھے کہ اگر توراہ پر تمہارا ایمان ہے قُلْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنَّمَا اللَّهُ مِّنْ
قَبْلُ ان گنت مومنین تو تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا
 ہے۔ قتل انبیاء علیہم السلام تمہاری کون سی کتاب جائز قرار دیتی ہے۔ یہ تو نہایت کھڑے
 نطف کی بات یہ ہے کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل قاتلان انبیاء اپنے اباؤ اباء پر فخر
 کرتے تھے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اپنے تئوں کے

جرم میں تم بھی شریک ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہودی بھی اپنے
 اباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔
 اس سلسلہ میں مدینہ کے یہودیوں نے کتنی سازشیں کیں۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا گیا۔ اسی
 لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل تمنا! دعویٰ ہے کہ تورہ پر تمنا! ایمان ہے۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ قتل
 انبیاء علیہم السلام تورہ میں کیا لکھا ہے۔ تمنا! دعوت ایمان باطل ہے۔ اگر تم ایمان دالے ہو
 تو قتل انبیاء علیہم السلام میں کیوں موٹا ہوتے ہیں۔

فرمایا تمنا! یہ دعویٰ درست نہیں کہ تم تورہ پر ایمان رکھتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ وَلَقَدْ
 جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ جِب مَوْسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاضْحَ لثَانِيَا لِعَيْنِي مَعْجَزَاتِ لے کر آئے
 تو تم نے ان پر ایمان لائے کبھے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ تَمَّ لے
 پکھڑے کو معبود بنایا۔ یہ صریح شرک تھا جو تمام آسمانی کتابوں کے مطابق گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے
 وَأَنْتُمْ طُلُعُونَ اور تم یا تمنا! سے اباؤ اجداد ظلم کرنے والے تھے۔

دیکھو! تم نے بار بار عہد پیمان کو توڑا۔ از خود شریعت کا مطالبہ کیا اور پھر جب قانون تمہارے پاس گیا۔ تو جیسے مٹانے کے لئے
 مٹا پاؤ اور کہو یا کہ اس پر عمل ممکن نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ
 اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور تمہارے سرِ دل پر کوہ طور
 کو معلق کر دیا۔ اور حکم دیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَأَسْمِعُوا جو کچھ ہم عطا کر رہے ہیں
 اُسے مضبوطی سے تھام لو اور سنو۔ یعنی اس پر کما حقہ عمل کرو۔ مگر تم نے اُس ہی جواب دیا قَالُوا
 سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا بظاہر تو عمل کا وعدہ کیا۔ مگر باطن میں کہا کہ ہم نے سن لیا مگر ہم نے
 اُسے تسلیم نہیں کیا۔ یعنی زبان سے اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اسی
 وجہ یہ بھی وَأَشْرِكُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ان کے دلوں میں پکھڑے کی
 محبت گھر کر چکی تھی۔ یہ ان کے کفر کی وجہ تھا کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا انکا
 یہ دعوئے کہ تورہ کو مٹاتے ہیں۔ غلط ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے بِسْمَا يَا مُرْكُم بِهِ
 بِصَانُكُمْ وہ بہت ہی بُری چیز ہے۔ جس کے لیے تمنا! ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور تم کو سالہ پرستی بھی کرتے ہو۔ یہ تو بہت ہی
 بری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ایمان کبھی قتلِ انبیاء علیہم السلام کا حکم نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی
 پتھرے کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ توراہ پر مبنی ایمان ہی نہیں ہے۔ ورنہ
 اس قسم کی بری حرکات کے مرتکب نہ ہوتے۔

موت کی آرزو

پہلے آیت گزشتہ ہے۔ اور آگے بھی آئی۔ یہ دو نصاریٰ دونوں اس زعمِ باطل میں مبتلا
 تھے کہ جنت صرف انہیں کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری قوم اس میں داخل نہیں
 ہوگی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا
 اَوْ نَصْرًا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ
 الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ اے نبی علیہ السلام! آپ ان کو فرمادیں کہ اگر
 اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر محض تمہارے ہی لیے ہے۔ تمہارا یہ یقین ہے۔ کہ تم
 ضرور جنت میں جاؤ گے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ تو پھر ذرا موت
 کی تمنا کر دو۔ تمہاری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ ظاہر ہے جسے آخرت میں اپنی کامیابی کا یقین
 ہوگا۔ وہ تو چاہے گا کہ کب موت آئے اور کب وہ دائمی آرام و راحت سے مستفید ہو۔ البتہ
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب ان کے زبانی بخوہے ہیں۔ کہ ہم جنت میں پہنچنے کے
 لیے جس ذریعہ یعنی موت کی ضرورت ہے۔ اس کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ
 أَبَدًا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں پر وہ کس قسم کی کرتوتیں کر رہے ہیں بِمَا قَدْ مَتَّ
 أَيْدِيَهُمْ اُن کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔ اگر اپنی کامیابی پر انہیں یقین ہوتا تو
 ضرور موت کی تمنا کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللَّهُ عَلَيْهِم بِالْظَلِمِينَ اللہ تعالیٰ
 ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ کیا ظہر کر رہے ہیں۔ اور ان کے باطن میں کیا پوشیدہ ہے۔
 حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن پاک کا چیلنج قبول
 کر کے مجھوٹ موت بھی موت کی تمنا کر بیٹھتے تو ہلاک ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے ایسا نہیں

کیا۔ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو یہ بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ یہودیوں نے قرآن پاک کا چیلنج قبول نہ کیا۔ وہ لوگ تو موت سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ اس کی تمنا کیسے کر سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ بھی مباہلے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بھی مقابلے میں آجاتا اور ہار جاتا تو وہ خود اور ان کے گھر بار سب ملک ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کی موت کی تمنا کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ طویل العمری کے خواہشمند ہیں۔ وَلَيَجِدُنَهُمْ آخِرِينَ عَلَى حَيَاةٍ اَبَدٍ آپ انہیں زندگی پر لوگوں سے زیادہ عرصے میں رہیں پائیں گے وَمِنَ الَّذِينَ اَشْرَكُوا اَن لَّوْگوں سے بھی زیادہ عرصے جو مشرک ہیں مشرک کے زیادہ آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ لہذا ان کا زندگی پر حرص کرنا تو واضح ہے۔ مگر یہ یہودی آخرت کو ملتے ہوئے بھی دنیوی زندگی کی خواہش کرتے ہیں۔ اور موت سے ڈرتے ہیں۔ حارثہ جو لوگ صحابہ ایمان میں وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ بھی بہ کراہ کے حالات بہانے ملتے ہیں۔ وہ تو موت کو ابدی راحتوں کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور ہر وقت موت کے انتظار میں رہتے تھے کہ کب اس پل کو عبور کر کے جنت کی وادیوں میں پہنچ جائیں۔ حضرت مدینہ منورہ میں موت میں مبتلا ہونے کو کہتے تھے جَلَدٌ حَبِيبٌ عَلَى فَنَاقِدٍ۔ ضرورت اور حاجت کے وقت آنے والی چیز یعنی موت آگوار ہے۔ لَا اَفْلَحُ لِيَوْمٍ مَّا نَدَمُ اَن جَوَادِمَ ہوا۔ اُسے کبھی فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ گویا ہم موت سے ڈرتے نہیں مگر اس سے محبت کرتے ہیں۔ کہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر خداوند سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔

جنت مہین میں حضرت علیؑ چغہ پسنے ہوئے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت حسنؑ نے کہا کہ اے ابوجان! یہ لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ یہ جنتی لباس تو نہیں ہے زمانے کے تاجیے! مجھے اس چیز کا خوف نہیں ہے۔ کہ موت مجھ پر گرتی یا میں موت

پوگروں۔ ہمیں تو شادیت کی تمنا ہے۔ موت ہمیں خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ حضرت عمرؓ بھی ایسا ہی کہتے تھے عَذَا فَلَقِيَ الْحَبَابَ مُحْضَدًا وَحَزْبًا كُلُّ يَتِيمًا هَمُّهُ بِنِيسٍ مِّنْ مِّسْ لِّسٍ
 ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گروہ سے ملنے والے ہیں۔ ہمیں موت کا ڈر نہیں۔
 ظاہری طور پر موت بڑی خوفناک چیز ہے۔ مگر مومن اپنے ایمان اور
 عقل سے سمجھتا ہے کہ یہ یقینی ہے۔ ڈر والی شے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے
 جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ تو اُسے معلوم ہو گا کہ دنیا کی زندگی
 کتنی حقیر چیز ہے۔

دست و حیات
 کی طلب

ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر دنیا میں کوئی تکلیف پیش آجائے تو اس سے دل
 برداشت ہو کر موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔ جھنور علیہ السلام نے
 فرمایا لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ لِيَصْرَ نَزْلَ بِهِ كَوْنِ شَخْصٍ مُحَضَّرٍ بِتَكْلِيفٍ كِي وَجْهٍ
 سے موت کا طالب نہ ہو۔ بلکہ یوں دعا کرے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا ذَلَّتْ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ
 اے اللہ! جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو تو مجھے زندہ رکھ و اَمْتِنِيْ مَا كَانَتِ الْمَوْتُ خَيْرًا لِّيْ
 اور جب میرے لیے موت بہتر ہو۔ تو وہ دے دے۔

فرمایا يَبُوْدُ أَحَدُهُمْ اَنْ لِّرْكَوْنِ كِي حَالَتِ يَهْ كِي اَنْ مِّنْ سِيْ بَرَاكِيْ خَيْرًا لِّيْ
 کرتا ہے۔ لَوْ يَمُتُّ اَلْفَ سَنَةٍ كِي اَنْ مِّنْ سِيْ بَرَاكِيْ خَيْرًا لِّيْ۔ فرمایا اگر ان کی یہ
 یہ خواہش پوری بھی ہو جائے۔ یعنی انہیں ہزار سالہ زندگی میسر آجائے۔ اس کے باوجود وَمَا هُوَ
 بِمُزْخَرَجٍ مِّنَ الْعَذَابِ اَنْ يَمُتُّ اتنی لمبی عمر بھی انہیں عذاب سے نہیں
 بچا سکتی۔ وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ کیونکہ یہ صندی اور عنادی لوگ ہیں۔ یہ
 لوگ کفر میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے قبا حیس اور شرور اکٹھے کر رکھے ہیں۔ اور اپنی روحانیت
 تباہ کر رہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ بِمُتَّبِعٍ كِي اَنْ مِّنْ سِيْ بَرَاكِيْ خَيْرًا لِّيْ۔
 کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ وہ ان کے عقائد اور اعمال اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ لوگ
 کسی طرف بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
 اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ
 ۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ
 فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۹۸ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ
 وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۹۹ أَوْ كَلَّمَآ عَاهِدُوا عَهْدًا ثَابِتًا
 فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۱۰۰ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
 رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ
 لَا يَعْلَمُونَ ۱۰۱

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے جو شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ پس بے شک یہ
 (قرآن پاک) اُسی نے آپ کے دل پر نازل کیا، اللہ کے حکم سے۔ یہ تصدیق کرنے
 والا ہے ان کتابوں کی۔ جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت
 اور خوشخبری ہے ۹۷ جو شخص دشمن ہو، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے
 رسولوں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ
 دشمنی رکھنے والا ہے ۹۸ اللہ البتہ تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل
 کیں۔ اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے مگر منافقان لوگ ۹۹ کیا جب بھی انہوں نے
 کوئی عہد کیا۔ اس کو ان میں سے ایک گروہ نے عیناً دیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر
 ایمان نہیں لائے ۱۰۰ اور جب ان کی طرف اللہ کی طرف سے رسول آیا۔ جو
 تصدیق کرتا ہے۔ اُس چیز کی جو ان کے پاس ہے۔ تو کتاب یا فتنہ لوگوں میں سے
 ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ۱۰۱

یہودیوں کی خرابیوں کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ آیات زیر درجہ کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت بنی علیہ السلام کی ہجرت مدینہ کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں بہت سے یہودی آباد تھے۔ یہودی علماء میں سے صرف ایک عالم حضرت عبد اللہ بن سلام ایمان لائے باقی سب محروم ہی رہے۔ ان میں سے ابن صوریہ ایک چشم تھا۔ وہ بعض دوسرے یہودیوں کے ہمراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آیا۔ اور آپ سے مختلف سوال کیے۔ اُس نے کہا کہ آخری نبی کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں۔ آپ اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي یعنی میری آنکھیں تو میٹک سوتی ہیں۔ مگر دل کبھی نہیں سوتا۔ اس کی اُس نے تصدیق کی کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخر الزمان کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔

اس شخص نے دوسرے سوال کیا کہ رحمہ در میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے۔ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کون سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد کا مادہ منویہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اور عورت کے رحم کی رطوبت زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ فرمایا مباشرت کی وقت جس مادہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بچے کی شکل و صورت اس کے موافق ہوتی ہے۔ باقی یہ بات کہ غلبے سے کیا مراد ہے، مقدار میں غلبہ ہوتا ہے۔ یا خورن میں سبقت ہوتی ہے۔ یا کسی صفت میں غلبہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مشابہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بھی آپ نے درست جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا کہ جب تم میرے جوابات سے مطمئن ہو تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگے ہم ایک اور سوال پوچھیں گے حضرت! یہ فرمائیے۔

کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔ انہیں سب سے پہلے کوئی خوراک پیش کی جائیگی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنتوں کی اولین خوراک مچھلی ہے۔ پھر کا زائد حصہ ہوگا۔ اور پھر دوسرے نمبر پر ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا۔ جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا ہے۔

اب حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں۔ تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ایک بات اور بتائیے کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے۔ آپ نے فرمایا مجھ پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ وحی لاتا ہے تو ہم اس کو نہیں مانتے۔ ہاں اگر میکائیل وحی لاتا تو ہم مان لیتے۔ کہنے لگے جبرائیل کو دو وجوہات کی بنا پر ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اول یہ کہ یہ قوموں پر عذاب لاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی تھی۔ اس کی تائید انہوں نے یوں بیان کی کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا کہ بخت نصر نامی بادشاہ ہمیں تباہ و برباد کرے گا۔ لہذا اُسے پھینک دینا چاہیے۔ اس کی نشانیاں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ وہ اداس عمر میں فلاں جگہ پر پڑے گا۔ اور فلاں کام کرتا ہوگا۔ چنانچہ ہمارے سرورِ دین نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی بھیج دیے۔ اور انہوں نے شہر بابل میں انہی نشانیوں کے ساتھ بخت نصر کو تلاش کر لیا۔ جب اُسے ہلاک کرنے لگے تو جبرائیل علیہ السلام سامنے آکر اُڑے ہوئے اور کہنے لگے تم اس کو کیوں مارتے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے۔ اور ہمارا تباہی کا باعث بنے گا۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ واقعی قاتل ہے۔ تو تم اُسے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔ تو خواہ مخواہ خونِ ناحق کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس طرح جبرائیل علیہ السلام نے بخت نصر کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ وہی بخت نصر جب بڑا ہوا۔ تو اُس نے شام اور فلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی۔ اور بیت المقدس کو گرا دیا۔ توراہ کو جلایا۔ یہودیوں کو قتل کیا اور ان کو غلام اور لونڈیاں بنایا۔ چنانچہ یہ لوگ سو سال تک غلامی میں مبتلا رہے اور بڑی ذلت و رسوائی اٹھائی۔

یہودیوں نے کہا کہ جبرائیل علیہ السلام پر ہمارا اور اعتراض یہ ہے کہ یہ آپ کے

ہاں ہماری چغیاں کھاتے ہیں۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور ان کی گندی ذہنیت کا رد فرمایا۔ اور بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ لہذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر کے مترادف ہے۔

جبرائیل، سرف ان تینوں لفظوں کا معنی عبد، بندہ یا مردِ خدا ہے۔ اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ گویا دونوں لفظ مل کر عبد اللہ کا معنی دیتے ہیں۔ اس طرح جبرائیل میکائیل اور اسرافیل کا معنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوا۔ ان میں عزرائیل کا نام شامل نہیں ہے۔ بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ عزرائیل ملک الموت کا لقب ہے۔

الغرض! جب یہودیوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِیْلِ كَمَا كُنِيَ جِبْرِیْلٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ كَادُثْمُنَ هَیْ۔ فَإِنَّہٗ سَدَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰہِ اس نے تو قرآن پاک آپ کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے۔

نمودل وحی کی مختلف صورتیں میں عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رو ہوتی تھی جس کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اُسے خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ خواب بتا دی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الہی پیش کرتا تھا۔ تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔

نمودل وحی کی
مختلف صورتیں

ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا: کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: مَا مَنَعَكَ نَزْلُ لَا يَأْتِيكَ رَبُّكَ تَوَسُّفَ آپ کے رکے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، ہم حاضر ہو جاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آ سکتے۔

حدیث شریفین میں آتا ہے: کہ ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ کو بتایا کہ اب کی دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے بہت ہی قریب پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جبرائیل یہ تو بتاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب پہنچ گئے عرض کیا کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار پروں کا حجاب رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ کے مقربین فرشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے: کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کو ہر روز اجازت ہوتی ہے کہ جنت کی سرکونڈ میں غوطہ لگائیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے غیر محدود روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے مختلف القاب میں ناموس عظیم، روح عظیم، روح القدس اور روح الامین وغیرہ شامل ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر ان حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے ہی آتی رہی ہے۔

میکائیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو سر تکوینی امور کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے بنی نوع انسان کی روزی رسانی اور بارش کا نزول وغیرہ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام عالم کے فتنے کے لیے بھل بجانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عزرائیل علیہ السلام جن کا لقب ملک الموت ہے وہ جانداروں کی روح قبض کرنے پر آمور ہیں قُلْ يَتُوفِكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

۱۔ بخاری ص ۶۹۱، ۲۔ زجاجة المصابیح ص ۲۰۹، مشکوٰۃ ص ۲۵۹، تفسیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹

۳۔ تفسیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹، ص ۲۵۹، ص ۲۵۹، حضرت شاہ رفیع الدین ص ۳

حریث میں جن چار مہینوں فرشتوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی فرشتے ہیں۔ قیامت کے دن عرش الہی کو
تھلنے والے آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ان چار کے ساتھ چار اور معاون ہو جائیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام
سے دشمنی

الغرض فرمایا۔ سَبَّحْنِي اسْرَائِيلَ۔ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تمہاری دشمنی بلا وجہ ہے
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ آپ فرمائیے۔ جو جبرائیل کا دشمن ہے۔ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ
عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ اُس نے تو پر کلام الہی تمہارے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل
کیا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتا ہے۔ خواہ وہ تیرے تمہاری موافقت میں جائے یا مخالفت
میں جائے۔ اور پھر یہ کلام بھی ایسا ہے۔ جو قطعاً تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو مصدقاً
لِعَابِئِن مَّيْدَةٍ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ سابقہ
کتاب کی تعلیمات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے مقام پر مُفْهِمًا کا لفظ آتا ہے۔
قرآن پاک سابقہ کتب کا مضمون ہے۔ ان کا پورا اس آخری کتاب میں آگیا ہے۔ اسی طرح
پہلی کتابوں میں جو حادثات ہو چکے ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہذا ایسی پاک کتاب کا اکار
اور اس کے نئے نئے دشمنی رکھنا کیسے جائز ہے۔ بلکہ یہ تو نہایت ہی قیمتی فعل ہے۔
یہ تو ایسی عظیم الشان کتاب لانا ہے۔ جس کے لیے نوع انسان ہمیشہ دعا گو رہا ہے۔ کہ
اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اے اللہ! ہم کو راہِ راست دکھا دے اور اس پر چلا دے
فرمایا یہ کلام ایسا ہے۔ جو کہ وَهْدَىٰ وَبَشَّرَ لِلْمُؤْمِنِينَ ہے اس کے ذریعے

اہل ایمان کے
لیے بشارت

اللہ نوع انسان کو بہایت بخشتا ہے۔ اور پھر اس بہایت کی روشنی میں جو لوگ ایمان قبول کر
لیتے ہیں۔ ان کے لیے دائمی کامیابی کی بشارت بھی سناتا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے
بَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اہل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں
کو خوشخبری دے دیں۔ مگر کن نعمتوں کی خوشخبری اس کا ذکر قرآن پاک نے بار بار کیا ہے۔ کہیں
فرمایا أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ان کے لیے باغات ہیں جن
کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی۔ کہیں فرمایا فِي مَقْعَدٍ صَدُوقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ
مُتَشَدِّدٍ وہ اللہ رب العزت کی بیٹھک یعنی اس کے حضور میں بیٹھے ہوں گے، دوسری
جگہ بشارت اس طرح ہے فَإِنْ تَطِيعُوا أَوْثِقُكُمْ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا اگر اطاعت

کر دے، تو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔ بہر حال اہل ایمان کو اصلاح اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اب بتاؤ ایسا پاک کلام لانے والے جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی کا کیا معنی ہے۔

فرشتوں سے
دشمنی اللہ تعالیٰ
سے دشمنی ہے

فَرَمَا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ
فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں جبرائیل، میکائیل وغیرہ سے
دشمنی رکھنا تو خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ گویا یہ لوگ فرشتوں کے دشمن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ
کے دشمن ہیں۔ فرمایا اگر ایسی بات ہے۔ ترجمہ من لو کہ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ
بھی کافروں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام تو عالم بالا یعنی خطیرۃ القدس
کے ترجمان ہیں۔ ان کے ساتھ دشمنی بڑی منگی پڑے گی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے۔
لفظ ملائکہ ملو کہ یا الو کہ سے مشتق ہے۔ اور ملوک عربی میں پیغام کو کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت
عرب کے قدیم شاعر عدی بن زید عبادی کے کلام سے ملتا ہے۔ اُسے نعمان شاہ عراق نے کسی
بات پر خفا ہو کر قید میں ڈال دیا۔ بادشاہ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ بہر حال اس نے اپنے شعروں
میں نعمان کو پیغام بھیجا تھا۔

ۛ أَبْلَغَ النُّعْمَانَ عَنِّي مَا لَمْ يَكُنْ ۚ إِنَّكَ قَدْ طَلَّ حَبْسِي وَأَنْتَ بَارِدِي ۚ

نعمان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ اس نے بلا وجہ مجھے لہجہ قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کے
حکم کا منتظر ہوں۔ کہ کب رہائی ملتی ہے۔ یہ کافی لمبا قصیدہ ہے۔

عرب کے ایک شاعر کے کلام میں بھی ایسا ہی ملتا ہے۔ عربوں میں بہت مشہور تھا۔
اور اُسے عربوں کا ہمارا کہا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا شعر بہت شہرت حاصل کرتا تھا۔ اور
پورے عرب میں فوراً پھیل جاتا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام کا زمانہ نبیاً ہے۔ وہ شخص ایمان
لانے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آ رہا تھا۔ کہ کفار نے مدینہ کے ذریعے اُسے راستے
میں ہی روک لیا۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی واپس نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دورانِ سفر ہی اونٹ سے گر کر
ہلک ہو گیا۔ وہ بھی کتا ہے۔

ۛ أَبْلَغَ يُزَيْدُ بَنِي شَيْبَانَ مَا لَمْ يَكُنْ ۚ أَبَا شَيْبٍ أَمَا تَعْلَمُ تَأْتِيكَ

کتاب اللہ
سورہ مدثر

فرمایا ان کعبختوں کی فطرت: یہ بن چکی ہے کہ اَوَکَلَمَاعِلٰہُمْ ذَوَاعِلٰہُمْ ان میں سے جب بھی کسی نے کوئی عہد کیا تبذہ فَرِیْقٌ مِّنْہُمْ ان میں سے ایک فریق نے اس عہد کو توڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بَلْ اَکْثَرُہُمْ لَا یُوْمِنُوْنَ ان کی اکثریت ایمان لانے سے قاصر رہی ہے۔ حقیقہ کہ وَلَمَّا جَاءَہُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ جب ان کے پاس رسول عظیم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعِہُمْ جو اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی زبور، توراۃ، انجیل۔ دیگر تمام صحیفہ سماویہ۔ شرائع الہیہ وغیرہ۔ تو پھر یہ ہوا کہ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ کِتٰبَ اللّٰہِ اللہ کی کتاب کو وَدَّآ ظُہُوْرَہُمْ پس پشت یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا یا الفاظ کے معنی الٹ دے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا کَا تَہْمُ لَا یَعْلَمُوْنَ گروہ جاننے ہی نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول علیہ السلام کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا تو وہ دونوں چیزوں کو بلا شک و شبہ پہچان لیتے۔ اس کے بعد یہودیوں کے بحر وغیرہ کا ذکر آئے گا۔

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ
وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّحَرَةَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ وَما رُوتَ وَمَا يَعْلَمُ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى
يَقُولَا إِنَّمَا خُنْ فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرْ فَيَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا يَفْتَرِقُونَ
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَعْلَمُونَ مَا يُضْرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ
عَلِمُوا لَعْنِ اشْتَرَاهُ مَا لَدَىٰ الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ ثُمَّ وَلَّيُوا
مَآسِرَ رَايَةٍ أَنفُسُهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا
وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

ترجمہ: اور انہوں نے اُس چیز کا تابع کیا، جو شیاطین سلیمان (علیہ السلام) کی بادشاہی میں پڑھتے تھے۔ اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور لوگوں کو جادو دکھاتے تھے۔ اور وہ چیز جو اتاری گئی تھی بابل کے مقام پر دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر۔ اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں کہتے تھے: بیشک ہم تو آزمائش ہیں۔ پس تم کفر نہ کرنا۔ پس لوگ ان دونوں سے ایسی چیزیں لکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان مہائی ڈالتے تھے۔ اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ان سے ایسی چیزیں لکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ورنہ وہ ہیں پہنچاتی رہتے۔ البتہ تحقیق انہوں نے جان یا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدا ہے۔ اُس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ بُری چیز ہے۔ جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ اگر ان کو سمجھ جوتی (۱۰۲) اگر یہ لوگ ایمان لاتے

اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا۔ اگر

یہ سمجھتے (۱۰۳)

شیطان کا
اتباع

ان آیات میں بنی اسرائیل کی انتہائی پستی اور ان کے انحطاط کا ذکر ہو رہا ہے۔ گذشتہ آیت میں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طور پر پشت ڈال دیا کہ اُس سے بالکل لا تعلق ہو گئے۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کتاب اللہ کی تلاوت اور اس پر عمل درآمد کی بجائے وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيمٍ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں اور انہوں کا اختلاط ہوتا تھا۔ کیونکہ جن بھی آپ کے ماتحت تھے۔ لہذا اس دور میں جو کلام یا دیگر چیزیں جن پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان کا اتباع کیا۔ اس طرح کھریا جادو انہیں تک پہنچ گیا۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل شیاطین یا جنوں کی تلاوت کی۔ وہ چیزوں کی پیروی کرنے لگے۔ گویا جادو میں ملوث ہو گئے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
پر جادوگر بونٹا الزام

جادو کو شیطانی کھیل جان کر کھیلے بستے تو اور بات تھی مگر بنی اسرائیل نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اس جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا صریحاً کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَمَا كَفَرُ سُلَيْمٰنٌ سَلٰمٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے کفر نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے یہ جادو وغیرہ تمہیں نہیں سکھایا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِیْنَ كَفَرُوْا بلکہ یہ تو شیطانوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ جنہوں نے لوگوں کو جادو سکھایا ہے۔

سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا بنی اسرائیل کا قبیح فعل ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحب شریعت رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اور شیاطین کو آپ کے مطیع کر دیا تھا۔ اور ہوا کو آپ کے سحر کر دیا تھا۔ فَسَحَرْنَا سحر مجھے آپ ان چیزوں سے حسب مشا کام لیتے تھے۔ وہ کیسے جادو سکھا سکے تھے۔ اور بن جریر نے ایک روایت

سے تفسیر طبری ص ۲۵۱

بیان کی ہے۔ قَالَ بَعْضُ أَحْبَابِ الْيَهُودِ يَهُودِيَّوْنَ كَمَا لَا تَعْجِبُونَ مِنْ مُحَقِّدِ لُغُو! تم محمد پر تعجب نہیں کرتے۔ يَزْعَمُ أَنَّ ابْنَ دَاوُدَ كَانَ نَبِيًّا جَوِي سَكْتِے ہیں۔ کہ ابن داؤد (سیمان علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حالانکہ مَا كَانَ إِلَّا سَاحِرًا وہ توجادوگر تھے۔ گویا یہودیوں کا حضرت سیمان علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد تھا۔ اس لیے فرمایا کہ سیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو کہ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ الْخَيْرَ لوگوں کا جادو کا علم سکھاتے تھے۔ اس بات کو حضرت سیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا صریح کفر ہے۔

مفسرین کرم فرماتے ہیں کہ جادو دوزخ سے دنیا میں آیا۔ اس کا پہلا ذریعہ توجنات میں یعنی حضرت سیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو شیاطین سے انسانوں میں رائج ہوا۔ جادو کا دوسرا ذریعہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دنیا پر بھیجا۔ اسی کے متعلق فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ عام مفسرین نے یہی لکھا ہے۔ کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بابل کے مقام پر اتارا۔ یہ بابل شہر ہی ہے۔ جو کلدانیوں کا دارالسلطنت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جلنے پیدائش ہے۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام اور فلسطین پہنچے۔ اور پھر حجاز میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ بہر حال لفظ مَلَكَيْنِ سے مراد دو فرشتے ہی ہیں کیونکہ مَلَكٌ فرشتے کو کہتے ہیں۔

جادو کے ذرائع

ہاروت اور ماروت کون تھے

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام یا کسی اور نبی کے زمانہ میں دنیا پر معصیت عام تھی۔ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے، تو آسمان پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کی کہ مولا کریم! تو نے یہ کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اس قدر گناہ میں ملوث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انسان میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں جیسے قوت شہوانیہ، قوت بسمیہ اور قوت غضبیہ وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے اس لیے

تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ اگر گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کچھ نیکو کار بھی ہیں۔ کہو ان کے اندر ساری
 قوتیں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے فرشتوں کو میں نے قوت ملکوتی سے نوازا ہے۔ اگر تم تجربہ
 کرنا چاہتے ہو تو میں تم کو زمین پر بھیجتا ہوں۔ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرو۔ پھر دیکھیں گے
 کہ وہ کس طرح گناہ سے بچتے ہیں۔ الغرض فرشتوں نے اس آزمائش کے لیے ہاروت اور
 امدوت کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوت شہوانیہ بھی رکھ دی۔ اور پھر انہیں بابل کے
 مقام پر اتار دیا۔ انہیں خاص طور پر نصیحت کی گئی کہ بُرائی سے باز رہنا۔ زنا اور دیگر معصیت سے
 اجتناب کرنا اور عدل و انصاف سے وقت گزارنا۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک خوبصورت عورت ایک چمکڑے پر سوار جا رہی
 تھی۔ اُس نے کسی ضرورت کے تحت سڑک سے کپڑا ہٹایا، تو اُسے دیکھ کر فرشتے بے قابو
 ہو گئے۔ یہ ان کی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ انہوں نے اُس عورت سے فرصت میں ملاقات کی
 خواہش کی۔ جسے اُس نے منظور کر لیا۔ بوقت ملاقات فرشتوں نے اُس سے لفظی خواہش
 کی تکمیل کی درخواست کی۔ اُس عورت نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ شرط پیش کی کہ
 مجھے وہ اسمِ عظیم سکھی دو جسے پڑھ کر تم آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور پھر واپس آ جاتے ہو۔
 فرشتوں نے اسمِ عظیم اُس عورت کو سکھا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اس کو قتل
 کر دو۔ ورنہ یہ ہمارا زنا فاش کر دے گا۔ فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔ عورت نے
 کہا۔ اچھا یہ شراب ہی پی لو۔ یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔ فرشتوں نے شراب پی لی۔ پھر نٹے میں آکر
 انہوں نے لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور زنا کے مرتکب بھی ہوئے۔ گویا سڑک معاصی میں مبتلا ہو گئے۔
 عورت تو اسمِ عظیم پڑھ کر اوپر چلی گئی کتے ہیں کہ زہرہ تاسے میں جا کر باود ہو گئی اور فرشتے سڑک میں
 مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ان گناہوں کی سزا دنیا میں بھگتنا چاہتے ہو یا آخرت میں
 انہوں نے دنیا کی سزا کو پسند کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں کسی تاریک
 اور عمیق کنوئیں میں ڈال ڈالا۔ آج تک وہ اُسی میں لٹکے ہوئے ہیں ان کے تنے سے دھواں
 اُٹھ رہا ہے۔ اور وہ سخت اذیت پہنچ رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی۔ تو اس وقت وہ اس
 عذاب سے نجات پائیں گے۔ دیگر اسرائیلی رشتہ مندوں کی طرح یہ بھی ایک اسرائیلی بدیت ہے

تاجم اس کی سچائی پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ماروت اور روت
کی معنی شاد

امام ابن منذرؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی عبدالملک بن مرداسی کے ساتھ تھکے پر بیٹھا تھا۔ نووار دنے تعجب کیا کہ یہ کون آدمی ہے۔ جو خلیعہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ آدمی ماروت اور روت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ لہذا اس کی عربت افزائی کی گئی ہے۔ اُس شخص نے آگے بڑھ کر بزرگ آدمی کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت ماروت اور روت سے ملاقات کا کچھ حال مجھے بھی سناؤ۔ اس پر اس شخص کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اُس نے واقعہ یوں سُنانا شروع کیا کہ بھائی! میں ابھی بچہ تھا۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ جسے میں فراخ دلی سے خرچ کرتا۔ جب باپ فوت ہو گیا۔ تو ماں سے دولت حاصل کرتا اور خوب اُڑاتا۔ ایک دن میں نے ماں سے دریافت کیا کہ ماں یہ تو بتائیں کہ ہمارے پاس یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا۔ جو اتنا خرچ کرنے سے بھی کم نہیں ہوتا۔ ماں نے کہا بیٹا تم جتنی چاہو دولت لٹاؤ یہ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ پھر اُس نے مجھے دولت سے بھرے ہوئے گھرے دکھائے۔ لڑکے میں شہور پیدا ہو چکا تھا۔ اُس نے دوسرا سوال کیا کہ میرے باپ نے یہ مال کس طریقے سے کمایا تھا۔ ماں نے بتایا کہ تیرا باپ ساحر تھا اور اس نے یہ ساری دولت سحر کی وجہ سے کمائی۔ لڑکے کو خیال آیا کیوں نہ میں بھی وہی چیز لیکھ لوں جس کی وجہ سے میرے باپ نے اتنا مال پیدا کیا۔ اُس نے سوچا کہ سحر کا علم اس کے باپ نے اپنے کسی شاگرد کو بھی سکھایا تھا۔ اس کا پتہ کر کے اُس سے یہ علم سیکھنا چاہیے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر اُسے ایک شخص مل گیا۔ جو اُس کے باپ کا شاگرد تھا۔ لڑکے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کہنے لگا یہ بڑا خطرناک علم ہے۔ اُسے نہ ہی سیکھو تو بہتر ہے لڑکے نے اصرار کیا تو اُس نے کہا کہ اچھا اگر تم ضرور ہی یہ علم سیکھنا چاہتے ہو۔ تو میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ مگر یاد رکھو۔ جہاں ہم جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر خدا کا نام نہ لینا۔ لڑکا بیان کرتا ہے کہ میں اپنے باپ کے شاگرد کے پیچھے ہوں۔ حتیٰ کہ ہم ایک غار پر پہنچے اور اس میں اتر گئے۔ ہم تین سو سیڑھیاں نیچے اترے تو وہاں ایک کنواں نظر آیا۔

کنوئیں کے اندر دو شخص نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے ٹک ہے تھے، ان کی شکلیں عجیب
عجیب تھیں، ان کی آنکھیں ڈھال کی طرح بڑی بڑی اور بڑی چمکدار تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل
میں خوف پیدا ہوا اور میری زبان سے بے ساختہ کلمہ لا الہ الا اللہ نکل گیا۔ یہ کلمہ سن کر وہ شخص
اور زیادہ مضطرب ہوئے۔ میں پھر گھبرایا اور میرے منہ سے پھر وہی کلمہ نکلا۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا
تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر میں نے ان سے
پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور اس حال میں کس وجہ سے ہو؟ ————— اس پر
انہوں نے بتایا کہ ہم ہر دوت اور مار دوت ہیں۔ اور یہاں سزا جگت ہے جس میں پھر انہوں نے پوچھا
کہ تم کس امت میں ہو۔ تو میں نے بتایا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہوں۔
انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آخری نبی کا ظہور ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
انہوں نے کچھ علامتیں بھی دریافت کیں۔ جو میں نے ان کو بتائیں۔ وہ دونوں بعض علامات
پر خوش ہوئے۔ اور بعض پر ناراض ہوئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ہم ان
علامت پر خوش ہوئے ہیں، جو قرب قیامت سے متعلق ہیں۔ کیونکہ قیامت برپا ہونے پر
ہم اس عذاب سے رہائی پالیں گے۔

الغرض! وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی وجہ سے سحر سے تو محروم ہو گیا، مابہم
میں حقیقت معلوم ہو گئی۔ اور وہ ہر دوت اور دوت کا عینی شاہد بن گیا۔

ہر دوت اور دوت
کے واقعات

بعض مفسرین کرم فرماتے ہیں۔ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ
وَمَا رُودَتَ میں لفظ ہاروت وماروت کے مقام پر ہر دوت اور دوت پر کوئی چیز نہیں
اتاری گئی۔ یہ سب جھوٹے قصے ہیں۔ جو بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ان مفسرین کی ذاتی تخیل ہے
بعض اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر دوت اور دوت کا سارا قصہ کہانی محض ہے چنانچہ
بشار ابن برد شاعر سے کسی نے پوچھا کیا آپ نے آل سیمان سادات خاندان کے متعلق بھی
کوئی قصیدہ لکھا ہے؟ یہ اپنے رب سے شاعر تھا۔ کہنے لگا۔ اُس خاندان کے متعلق کچھ زیادہ

ترتیب لکھا۔ صرف یہ دو شعر کہ ہیں:

وَيُنَادِي السُّلَمَانُ وَدُرُّهُمْ هُمْ كَبَابِلِيَّيْنِ حَفَا بِالْعَفَارِ يَت
لَا يُرْجِيَانِ وَلَا يُرْجِي لَوْلَاهُمَا كَمَا سَمِعْتَ بِهَارُوتَ وَمَارُوتَ
آل سلیمان بڑے کنجوس لوگ ہیں۔ ان کے درہم و دینار ایسے ہیں۔ جیسے دو بابلیوں کے ارد گرد
بست سے بھوت جمع ہوں۔ اور وہ کسی کو نظر بھی نہ آئیں۔ اس طرح آل سلیمان کا مال و دولت
بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ نہ ان سے کسی عیٹے کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے درہم و دینار کو دیکھنے
کی امید۔ ان کی دولت ایسے ہی ہے جیسے تم نے ہاروت ماروت کا نام تو سن رکھا ہے۔
مگر ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ غرضیکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ہاروت ماروت کے قصے کو
افسانے زیادہ حیثیت نہیں دیتے

سحر کی ہے

آہم اکثر مغربین کہتے ہیں۔ کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔ اگرچہ زہرہ والا واقعہ
مصدقہ نہیں ہے۔ مگر ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سحر کا علم دیکر نازل کیا تھا۔ تاکہ سحر اور
مہجرت میں فرق قائم کیا جاسکے۔ لغوی اعتبار سے سحر کا معنی لطیف، باریک یا مخفی شئی ہے۔
سحر میں چونکہ کوئی چیز ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اُسے سحر کہتے ہیں۔

سحر کا دوسرا معنی غذا ہے۔ جب انسان کوئی بھی غذا کھاتا ہے تو ہضم ہو کر باریک باریک
رگوں کے ذریعے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتی ہے۔ یہ لطیف بھی ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ گویا
اس میں انفار اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ایک مشور شاہراہ القیس کا کتبہ ہے
اُرَنَا مُوَضِّعِينَ لَا مُرْغَبَ وَنَحْنُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ مگر کسی ایسی منزل کی طرف۔ جس کا ہمیں علم
نہیں۔ یعنی پردہ غیب میں ہے اور اُدھر ہم پر کھانے پینے کے ذریعے سحر کیا جاتا ہے۔ یعنی
خوراک کھا کر ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جسم میں تیز رفتاری سے سواریاں دوڑا رہے ہیں۔
جسم کی مشینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہے گویا ہزاروں میل کی رفتار سے چلنے والے ہوئی جہاز

سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے۔ لیکن یہ سب کچھ پردہ غیب میں ہے۔
اسی طرح ایک شخص یوں کہتا ہے۔

فَإِنْ تَنبَيْتُنَا فِيمَ غَدُنُ فَإِنَّ عَصَا فَيْزٍ مِنْ هَذَا الزَّانِمِ الْمُسْتَعْرِ

اگر تو ہم سے پوچھے کہ ہم کس حال میں ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ ہم تو محرزہ مخلوق میں سے چڑیوں کی
مانند ہیں۔ جو کھانے پینے کے ذریعے اڑتے پھرتے بستے ہیں۔

عربی زبان میں سحر کا ایک معنی پھیپھڑا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لہذا
اس لحاظ سے بھی سحر میں اخفا کا معنی پایا جاتا ہے۔

کیا ہاروت ماروت
انسان تھے؟

بعض فرماتے ہیں کہ ہاروت ماروت فرشتے نہیں۔ بلکہ انسان تھے اور نیک آدمی تھے
ان کے متعلق رَجُلَيْنِ صَالِحَيْنِ کے لفظ آتے ہیں۔ وہ بابل میں بستے تھے۔ اور سحر کا
علم جانتے تھے۔ تاہم جب وہ لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے۔ تو انہیں خبردار بھی کرتے تھے کہ یہ علم
اچھا نہیں ہے۔ اس سے بچ جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ کیونکہ سحر پر اعتقاد رکھنا
اور اس پر عمل کرنا کفر میں داخل ہے۔ تاہم اس علم کے نزول میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ یہ
ایک علم ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہاروت ماروت مَلَکَيْنِ (فرشتے) نہیں۔ بلکہ مَلَکَيْنِ یعنی بادشاہ
تھے۔ اور بڑی سطنت کے مالک تھے۔ ان کے پاس یہ علم تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مَلَکٌ
کا اطلاق فرشتوں کے علاوہ نیک آدمیوں پر بھی ہوتا ہے جیسے سیدہ یوسف میں مَلَکٌ کا لفظ
یوسف علیہ السلام کے لیے بھی بولا گیا ہے اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ وہ انسان نہیں
بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدیؒ اور ابوالحسن اشعریؒ تیسری چوتھی صدی کے بلند پایہ اہم گنہ گے ہیں۔
یہ اہم عظیم گنہ گار دوں کے شاگرد ہیں۔ آپ بڑے حکم ہیں اور علم کلام میں آپ کو بڑا مرتبہ
حاصل ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ سحر کو مطلقاً کفر کناہ دست نہیں۔ کیونکہ اسکی

کیا سارا جادو
کفر ہے

بعض قسمیں کفر ہیں۔ بعض فسق اور بعض بدعت۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں: کہ سحر اُسی صورت میں کفر ہے جب کہ اس میں کفریہ یا شرکیہ کلمات پائے جائیں مثلاً استعانت باشیاطین ہو یا مافوق الاسباب ذرائع سے مدد طلب کی جائے۔ تو ایسا سحر کفر ہوگا۔ کیونکہ غائبانہ استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے روا ہے۔ کسی دوسرے سے طلب نہیں کی جاسکتی۔ اِنَّكَ نَفْبُدُوْا اِيَّاكَ تَسْتَعِيْنُ کا یہی مطلب ہے کہ مافوق الاسباب استعانت اُسی ذاتِ خداوندی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسی استعانت خواہ شیاطین سے ہو۔ کواکب سے ہو۔ اَصْنَام یا بتوں سے مطلوب ہو۔ سب مشرک میں داخل ہے۔ ارواحِ نجسہ کی تعظیم غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا۔ یہ بھی کفر و شرک میں داخل ہے۔ اگر ایسا کرے گا، تو یقیناً کفر کا مرتکب ہوگا۔

اگر سحر میں پڑھے جانے والے کلمات شرکیہ نہ ہوں بلکہ مباح یا جائز کلام ہو۔ تو پھر اس کی حیثیت مختلف ہوگی۔ اگر اُس سحر کے ذریعے کوئی خلافِ شرع کام مطلوب ہے۔ کسی کی ایذا رسانی مقصود ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ سحر فسق اور معصیت ہوگا۔ اور اگر سحر کے کلمات بھی مباح ہیں۔ شرکیہ نہیں ہیں۔ اور اس سے غرض بھی فاسد نہیں ہے۔ خلافِ شرع نہیں ہے۔ تو اس صورت میں سحر تو بہر حال ناجائز ہوگا۔ مگر اسے زیادہ سے زیادہ بدعت کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اُسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم یہ کفر و شرک کے زمرہ میں نہیں آئے گا اور اگر کلمات مباح ہیں۔ ایذا رسانی بھی مقصود نہیں اور مطلوب کام بھی جائز ہے تو اس کو سحر نہیں کہیں گے۔ بلکہ اس کو عام اصطلاح میں عملیات اور عزیمت کہتے ہیں۔ جھاڑ پھونک، گنڈا تعویذ وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں۔

فقہاء اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اگر جادو کے نتیجے میں کسی کی جان ضائع ہو جائے تو اس کے بدلے میں ساحر کو قتل کر دینا چاہیے۔ اگر سحر کی وجہ سے جان بچ گئی ہے۔ کوئی دوسرا نقصان ہو رہا ہے۔ تو نقصان کی مناسبت سے ساحر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

جادوگر کی سزا

ساحر کو پکڑنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب تک مکمل ثبوت نہ ہو کسی پر جادو کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم اگر ایسا ممکن ہو یا ساحر خود اقرار کر لے تو پھر مذکورہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ بشرطیکہ ثبوت بھی اسلامی ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اگر ساحرہ عورت ہو تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مردہ عورت کو قتل کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ بلکہ اُسے قید میں رکھا جاتا ہے اسی طرح ساحرہ کو بھی قید کر دیا جائے گا۔ البتہ بعض ائمہ عورت کو بھی قتل کرنے کے حق میں ہیں۔ اگر ان فی جان کے تلف سے کم تر نقصان ہوا ہے۔ یعنی لخص ایذا رسانی کا ارتکاب ہوا ہے۔ تو ساحر کو وہی سزا دی جائے گی۔ جو ذکیہ کے مقدمہ میں دی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے ڈاکو کے لیے چار قسم کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ یعنی سولی پر شکانا، قتل کرنا، لٹے سیدھے ہتھ اور پاؤں کاٹنا، اور جس یعنی قید میں ڈال دینا۔ لہذا ساحر کو بھی اُس کے جرم کے مطابق اسی قسم کی سزا دی جائے گی۔

میاں بیوی
میں جہانی

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يُعْلِمُنْ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَ اِنَّكَ غَنٌّ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ وہ دو فرشتے باروت اور ماروت جب کسی انسان کو جادو کا علم سکھاتے تھے۔ تو اُسے واضح کر دیتے تھے۔ کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ تم یہ کھڑ نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ مگر اس کے باوجود لوگ اُن سے جادو کا علم سیکھتے تھے۔ جن میں اہل کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا اور وہ ان فرشتوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے مَا يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ جن کے ذریعے وہ میاں بیوی میں جہانی ڈال دیتے تھے۔ یہ ایسا برا عمل ہے۔ جس پر شیطان بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ تاہم کچھ بھی ایک فن ہے۔ جس طرح دیگر فنون ہیں جیسے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ وغیرہ وغیرہ۔

نافع اور
ضار علم

فرمایا اگرچہ جادو ایذا رسانی کا ذریعہ ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔ کہ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ایسا عمل کرنے والے سام

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر از خود کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم جادو کرنا، اس پر یقین رکھنا۔ چونکہ قیامت سے خالی نہیں۔ یہ معجزہ ہے۔ مفید نہیں۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَلَمٍ لَا یَنْفَعُ اِنَّ اللّٰہَ اَمْرٌ لِّیْ عِلْمٌ پناہ مانگتا ہوں۔ جو نفع مند نہ ہو۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ عَلَّمَنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ اِنَّ اللّٰہَ اَجْمَعُ وہ علم عطا کر جو نفع بخش ہو۔ دنیا میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آخرت میں بھی فائدہ مند ہو۔ اسی بات کو فرمایا وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یُضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ یَا لَوْ اَنَّ الْاِنْسَانَ عَلَّمُ سیکھتے ہیں۔ جو نفع کی بجائے انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔

فرمایا وَلَقَدْ عَلَّمُوا لَمَنْ اَشْكُرْهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ نَّصِیْہِ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے اس علم کے ذریعے کیا مزید ہے۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ کہ آخرت میں ساحر کو اس علم کا کیا فائدہ ہوگا وہ تو اٹا غذاب میں مبتلا ہوگا۔ خاص طور پر اگر اس نے ایسا جادو کیا ہے۔ جس میں کفر و شرک پایا جاتا ہے۔ تو وہ یقیناً آخرت سے محروم ہے گا۔ اگے فرمایا وَلِبِئْسَ مَا شَرُّوا بِہٖ اَنْفُسُہُمْ انہوں نے بہت ہی بُری چیز کے بدلے میں اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ ان کا یہ سودا بہت ہی خسارے کا سودا ہے۔ لَوْ کَانُوا یَعْلَمُوْنَ اگر ان میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو ایسا کام نہ کرتے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہودیوں کی بد اعمالیوں کا ذکر فرمایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امت محمدیہ کا حال بھی اُن سے زیادہ مختلف نہیں ہے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہو جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تنہی دامن ہو جائیں۔ تو پھر پستی کی طرف ہی جانا ہوگا۔ آج انڈیا پاک میں دیکھ لیں۔ دیگر ممالک پر نظر ڈال لیں۔ ہر طرف گنہ گری پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب الہی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور دین کے لیے سعی و جہد کو ترک کر دیا گیا ہے۔ دین کا دار و مدار

یہودیوں سے
موافقت

عملیات پر رہ گیا ہے۔ اس کام کے لیے یہ عمل کر لو۔ اس کام کے لیے وہ وظیفہ کافی ہے
علم و عمل ختم ہو چکا ہے۔ علمائے حق کا ایک مدہم سادہ ہٹھکلا ہے۔ در نہ ساری دنیا کفر و
ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی طرح ہماری امت میں بھی حق و باطل غلط ملط ہو چکا ہے۔ صحیح اور غلط
کی پہچان ایک عام شخص کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ دیہات میں حالات اور بھی خراب ہیں
جہاں کے امام کے فرائض میں نماز پڑھنا بھی ہے۔ اور مرنے کو غسل دینا بھی۔ بچے کی پیدائش
پر کان میں اذان بھی دہی کہتے ہیں۔ حقیقت کے لیے جانور ذبح کرنا ہو۔ تو امام صاحب کو بلایا جاتا
ہے۔ اور اگر تعویذ گنڈے کی ضرورت پڑ جائے تو بھی میاں صاحب دیں گے۔ ان کا علم خطبہ
جموعہ تعارفی مسائل تک ہوتا ہے۔ دین کے علم سے بچے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ
حالت یہودیت سے مشابہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت بھی
پیلے لوگوں کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلے گی۔ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مشابہ
ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

بعض علاقوں میں چار چار بکروں کا ایک ہی امام ہے۔ بلکہ ہم نے خود سفر میں ملاحظہ کیا۔ کہ
ایک علاقہ میں پندرہ سات گاؤں کا ایک ہی امام تھا۔ کہیں نکاح کرنا ہو۔ جنازہ پڑھنا ہو۔ وہی
مولوی صاحب انجام دیں گے۔ تعویذ گنڈے کا کاروبار چل رہا ہے۔ نقش سلیمانی والی کتابیں ہیں۔
لکھنؤ والے کی کتاب نفع المخلاتی ہے۔ یہ تعویذ گنڈے والی دہلوی کی کتاب۔ فائدہ ہے۔
کسی مسئلہ کا حل مطلوب ہو۔ کتاب کھول کر معلوم کر لو۔ حتیٰ کہ چوری تک کی تفتیش عملیات کے
ذریعے ہوتی ہے۔ یہ کالام حجاب چھونک وغیرہ سفلی عملیات ہیں۔ یہ چیزیں یہودیوں میں رائج
تھیں اور آج ہم میں بھی یہی پائی جاتی ہیں بعض سمجھ و طاقت بھی ہیں۔ جیسے سورۃ یسین کا ورد
ہے۔ سورہ منزل کی روزانہ تلاوت ہے۔ رزق کی فراوانی کسی جائز چیز کے حصول یا کسی
مسیبت سے رہائی کے لیے کسی کو کوئی اچھی بات بتادی۔ مگر عام طور پر یہ گنڈے تعویذ
یہودیوں والے ہیں۔ ذرا کھوم پھر کے دیکھ لیں۔ ماہرین عملیات کے ہاں غورتوں کی جہاز ہے
کوئی نہیں دیکھا کہ مقصد جائز ہے۔ یا ناجائز۔ کھر بے یا شرک۔ سب ایک ہی گاڑی میں

سوار چلے جائے ہیں۔ یہی یہودیت کی موافقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّكُمْ اٰمَنْتُمْ وَاتَّقَوْا اَکْرِمَ لَوْگ جادو کا کاروبار چلانے
کی بجائے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ شرک و بدعات سے اجتناب کھیتے
لَمْثُوبَةٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ تُوَدَّ اللّٰهُ تَعَالٰی کے بہتر اجر و ثواب کے مستحق
ہوتے۔ لَوْ کَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اَکْرِمَ لَوْگ علم ہوتا۔

الف
درس چل و دو

البقرة

آیت ۱۰۴ تا ۱۰۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا
وَالْكَافِرِينَ عَذَابٌ إِلَيْهِمْ ۝۱۰۴ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ
رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصِرُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ۝۱۰۵ مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا
أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۰۶
أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۱۰۷

ترجمہ: اے ایمان والو! امت کو راعن کہو یا انکو نظرنا اور سنو اور کفر کرنے

والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۱۰۴ اہل کتاب اور مشرکین میں سے

جنہوں نے کفر کیا، وہ نہیں پسند کرتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی

بھلائی اتاری جائے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ اس

کو کتاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۝۱۰۵ جو ہم کسی آیت کو

منسوخ کرتے ہیں یا بھلایتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی

آتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۝۱۰۶

کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اس کے سوا کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار ۝۱۰۷

رابطہ آیات

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی پستی اور غلطی کا ذکر تھا۔ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ دین کی سر بلندی کے کام کو ترک کر دیا۔ جہاد سے منہ موڑ گئے

اور سحر جادو کرنے لگے جیسے سفلی اعمال کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے ان برائیوں

خاص طور پر پھر کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا جو کہ ان کی ذلت کا انتہائی درجہ تھا۔
 ان آیات میں اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کا ذکر فرمایا ہے جس کے
 ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو ذہنی تعصیف پہنچاتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی
 اس ذلیل حرکت کا ارتکاب نہ صرف سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کیا۔ بلکہ حضور
 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں بھی اس حرکت سے باز نہ آئے۔ اور آپ
 کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس حرکت کا تذکرہ کر کے
 اہل اسلام کو خبردار کیا کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے معاذ اللہ نبی علیہ السلام کی توہین
 کا پہلو نکلتا ہو۔

بنی اسرائیل کی
 اخلاقی پستی

اس مقام پر جس خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہودی آپ کی
 مجلس میں آتے تھے۔ تو آپ کی توجہ بند دل کرانے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے
 جو کہ اُنْظُرْنَا کا ہم معنی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف
 توجہ فرمائیں۔ اُنْظُرْنَا کا معنی بھی یہی ہے آپ ہماری طرف توجہ دیجیے، نظر کریں۔ ہماری بات
 غور سے سنیں۔ بظاہر دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے۔ مگر یہودی اپنی گندی ذہنیت کے
 اظہار کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر اس لفظ کو کھینچ کر اور گھما کر رَاعِنَا
 بولتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: لَيَّا بِأَلْسِنَتِهِمْ زَبَانَ مِمَّنْ يَحْمِلُ كِرَامًا
 کرتے تھے جس کی وجہ سے رَاعِنَا کہتے۔ یعنی ہمارا چہرہ واہ۔ مزید براں یہودیوں کی زبان میں
 یہ لفظ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کا معنی احمق اور بیوقوف ہے۔ گویا اس طرح یہ
 لوگ اپنی گندی ذہنیت کا اظہار کرتے تھے۔

مذہبی تعصبات
 کا اثر

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا کہ تم اہل کتاب کی پیروی نہ کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ۖ اٰيْمَانُ وَالْوَاٰجِبُ اَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ اِلٰهَ اَبْنِيْكُمْ
 اپنی طرف مقلد کرنا چاہو۔ تو رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو کیونکہ اس سے نفوذ باللہ نبی علیہ السلام

کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور نبی کی توہین کفر کے مترادف ہے۔

سورۃ مجادلہ میں یہودیوں کی ایک اور قبیح حرکت کو بھی ذکر آتا ہے جب یہ بد بخت حضور علیہ السلام کی مجلس میں آتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السام علیکم کہتے تھے۔ سام کا معنی موت یا ہلاکت ہے۔ گویا السلام کا لفظ نجس بنا کر السام کہتے تھے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب یہودی سلام کریں ان کے سلام کا جواب دے لیں السلام کی بجائے صرف علیکم دیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ تم نے کہا۔ وہ تم پر ہی ہو یعنی اگر السلام کی بجائے السام بولا جائے۔ تو یہ ہلاکت تمہیں نصیب ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی حرکت کے متعلق فرمایا حَتَّىٰ يَكُونَ لَكُمْ يُحْيِيكَ بِهِ اللَّهُ تِلْكَ لُوكَ آبٍ كَالِاسِي وَعَلَيْتَ هِي۔ جو اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔ ہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ جس سے آپ کی شان اقدس میں فرق آنے کا احتمال ہو۔ وَقُولُوا انْظُرْنَا اور رَاعِنَا کی بجائے انْظُرْنَا کہو۔ یعنی ہماری طرف نظر کر م فرمائیں۔

اہل ایمان
کو خطاب

سورۃ بقرہ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے عام لوگوں کو خطاب ہوتا رہا ہے۔ جیسے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ۔ اے نوح انسان! اپنے رب کی عبادت کرو۔ یا بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا يٰبَنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔ اب یہاں سے اہل ایمان سے خطاب ہو رہا ہے۔ اور پورے قرآن پاک میں اٹھائی مرتبہ اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ شاد عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ میں اہل ایمان سے براہ راست خطاب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا تھا۔ جو آگے اپنی اپنی امت تک حکم الہی کو پہنچاتے تھے یہ صرف آخری امت کو شرف حاصل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست اہل ایمان کو خطاب کیا ہے۔

زولہمذہب میں یہ رویت ہے۔ اور اہل اہلبیت نے اسے شعب الایمان میں بھی بیان کیا ہے۔
 کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! مجھے کوئی نصیحت
 فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اے عبداللہ! جب تم قرآن میں یہ خطاب پڑھو **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**
 تو پورے دل کے ساتھ توجہ ہو جا یا کرو۔ یہ سمجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم سے براہ راست خطاب فرماتا
 ہے۔ اس سے بڑی نصیحت اور وصیت کیا ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ایسی اعلیٰ چیز ہے کہ
 پوری توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر سنا کہ کہ اللہ تعالیٰ کیا حکم فرما رہے ہیں۔ کس چیز کے کرنے کا
 حکم ہے۔ اور کس چیز سے رک جانے کی بات ہے۔

الغرض! اس خطاب میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی توجہ بند دل کھلنے
 کے لیے **رَاعُوا** کا لفظ استعمال نہ کرو ورنہ **الْأَنْظُرُنَا** سے خطاب کیا کہ اس خطاب میں
 امر اور نہی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاکید فرمایا **وَأَسْمَعُوا** یعنی جو حکم ہو
 رہا ہے۔ اُسے خوب غور سے سنو۔ کیونکہ یہ ایک بڑا اہم حکم ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ عام گفتگو میں مشتبہ الفاظ استعمال نہ کرو۔ کوئی شخص اپنے
 غلام یا لونڈی کو **عَبْدِي** اور **اَهْلِي** کہہ کر نہ پکارتے۔ لفظ **عَبْد** سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ
 پیارنے والا شاید اپنے آپ کو **مُجُود** مجبور کہے۔ حالانکہ **مُجُود** تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے
عَبْد کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر معاملہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رہنا
 چاہیے۔ اسی طرح **لُونْدِي** کو **بندی** کہہ کر نہ پکارتے کی بجائے **لُونْدِي** کہہ کر پکارو۔ غلام اور **لُونْدِي** کو
فَتَا اور **فَتَاة** کہہ کر بھی بلایا جاسکتا ہے۔ یعنی اے جوان یا اے **لُونْدِي**۔ حضور علیہ السلام نے
 فرمایا۔ **عَبْد** کا لفظ اس لیے مناسب نہیں کہ **كُلُّكُمْ عِبْدُ اللَّهِ** کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندے
 ہو۔ اسی طرح ساری عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں۔ یہ کسی انسان کے بندے یا بندیاں نہیں ہیں۔
 لفظ **مَوْلٰی** بھی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بلا تخصیص ہر جگہ استعمال کرنا
 اشتباہ پیدا کر سکتا ہے۔ **مَوْلٰی** کے کئی معنی ہیں جیسے دوست، صاحب، آقا، غلام، غلام

مشتبہ الفاظ کے
 استعمال کی ممانعت

آزاد کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی کہ اس لفظ کو غلط طور
 مت استعمال کرو۔ جس سے شبہ پیدا ہوتا ہو۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے: حضور علیہ السلام
 نے فرمایا لَا تَقُولُوا لِلْعَنْبِ الْكَرْمِ یعنی انگور کو کرم مت کہو بلکہ عنب کہو۔ یا جلد کہہ سکتے ہو۔
 اس کی وجہ یہ ہے کہ کرم تو مومن کا بدلہ ہے۔ جس میں ایمان پایا جاتا ہے۔ اور جس میں اخلاق حسنہ
 ہوتے ہیں۔ ایسی چیز کو انگور کے معنوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ انگور سے عام طور پر شراب
 تیار کی جاتی ہے۔ جب لوگ شراب کی تعریف کرتے ہیں۔ تو اس میں جب کرم کا نام آتا ہے
 تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شراب کرم یعنی بخشش اور فیاضی سے کشیدہ کی گئی ہے۔ گویا اس
 لفظ سے بالواسطہ شراب کی تعریف ہوتی ہے۔ لہذا انگور کے لیے کرم کا لفظ استعمال کرنے
 سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
 کے لیے لفظ لیدر
 کا استعمال درست
 نہیں

لیدر کا لفظ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی راہنمائی کرنے والا ہے۔ بلاشبہ پیغمبر بھی امت
 کی راہنمائی کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے جو ہر قسم کے راہنما کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
 عام طور پر اس کا اطلاق سیاسی لوگوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی اقدار اور دیانتداری سے بے بہرہ
 ہوں اور خواہ ان کی فکر بھی فاسد ہو۔ اہل اسلام میں سے ہوں یا غیر مسلم۔ متقی ہوں یا فاسق فاجر
 یہ لفظ سب کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی طور پر یہ لفظ چرچل، برٹنٹ
 ٹریڈ مارک، ریجن وغیرہ قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کا مشتبہ لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ
 وسلم کے ہرگز شایان شان نہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے اپنی تصانیف میں یہ لفظ
 حضور علیہ السلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو قطعاً نامناسب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
 کہ مشتبہ لفظ کسی عام چیز کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے چہ جائیکہ خود حضور والاصفات علیہ السلام
 کی ذات اقدس کے لیے ایسا لفظ بولا جائے۔ پیغمبر کے لیے انگریزی کے متبب دل الفاظ

MESSSENGER پیغمبر یا پرافٹ (PROPHIT) وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

الغرض فرمایا کہ نبی علیہ السلام کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کر۔ جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔ اگر

کوئی ایسا کرے تو زیادہ کمزور و نیکو بن عذاب الیم کہہ کر کفر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب
 تیار کر رکھا ہے۔

فَرَا مَا يَوْعَدُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ
 عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ هَا اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ
 نہیں پسند کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بہتری کی چیز اتاری جائے۔ مشرکین کو
 میں ابو جہل، ابولسب، عقبہ اور شیبہ جیسے بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ حضور علیہ السلام سے حسد
 کرتے تھے کہ اگر وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری حضور علیہ السلام کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اور وہ
 بڑے غم خویش و نا پسند ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف اہل کتاب تھے جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ نبی
 آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ جب آخری نبی ہونے کا دعویٰ بنو اسماعیل کے قبیلہ قریش
 میں سے ہوا۔ تو وہ بھی حسد کی آگ میں جلنے لگے لہذا انہوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی تسلیم
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی رکوع میں آگے آئے گا حَکْدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ
 انہوں نے حسد کیا اور ایمان کی دولت سے محروم ہے اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین
 نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک آپ پر نازل ہو۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں پر تمہاری خواہشات اور
 توقعات کی بات نہیں بلکہ واللہ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ اللہ تعالیٰ
 بے چارہ ہے اپنی رحمت کیلئے مناسب لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس نے یہ پسند کیا کہ اپنی رحمت
 خاصہ بنو اسماعیل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر نازل فرمائے۔ اس سے پہلے
 اللہ تعالیٰ بنو اسماعیل پر بے شمار رحمتیں نازل کر چکا ہے۔ اس قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور
 علیل القدر مول بھیجے۔ اِذْ جَعَلْ فِيْكُمْ اَنْبِيَاً وَجَعَلَكُمْ مَّقْلُوْكَاتٍ کا
 تفصیلی تذکرہ کسی گذشتہ درس میں گذر چکا ہے۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی
 مبعوث فرمائے۔ اور کتنوں کو بادشاہت بھی عنایت کی۔ ایسی حکومت اور بادشاہت
 جو دنیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو اب کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے
 کہ نبوت بنو اسماعیل سے باہر نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں ہے کہ سلسلہ نبوت

کو بنو اسماعیل پر ختم کرنا تھا۔ لہذا اس میں بوجہ حق کے لیے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات
کی وجوہات

بنی اسرائیل اور مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ پہلی کتابوں کا مصدق بھی ہے۔ تو پھر یہ سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر کے نئی تربیت کیوں نافذ کرتا ہے۔ نیز اپنے ہی احکام کو بعض اوقات تبدیل کر دیتا ہے۔ بقول ان کے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ معاذ اللہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو معاملے کا پوری طرح علم نہیں ہوتا تو حکم جاری کر دیتا ہے۔ مگر جب اس کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ تو حکم میں ترمیم کر دیتا ہے۔

دیانہ سرسوتی بند و ذل کی آریہ سماج تنظیم کا مشہور لیڈر ہوا ہے۔ اپنی نوعیت کا شہرت پسند آدمی تھا۔ یہی اعتراض — اُس نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا کہ کسی پٹنے ہی حکم کو منسوخ کر دینا جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا کہ احکام کی تفسیر جہالت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم و حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حکم حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جب حالات متقاضی ہوتے ہیں۔ تو پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو صبح کے لیے اور دوا دیتا ہے اور شام کے لیے دوسری۔ یا ایک ہفتہ ایک دوا استعمال کراتا ہے تو دوسرے ہفتے کے لیے کوئی اور تجویز کرتا ہے۔ کیا ڈاکٹر بوقوف ہے یا جاہل جو مختلف اوقات کے لیے مختلف دوا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے حالات کے مطابق دوا کو منسوخ کر دیتا ہے یا تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات کے تقاضے کے مطابق احکام نازل فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض احکام کو تبدیل کر دیتے ہیں یا اپنی حکمت کی بنا پر احکام میں ترمیم کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ تمام اقوام کے لیے خصال طور پر نافذ العمل ہے۔ لہذا اس نے

پہلے شرائع کو منسوخ کر کے بعدی احکام نافذ کر دیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ البتہ مختلف شرائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ہماری شریعت میں حلال ہے۔

کسی شریعت میں درگئی نہیں ایک نسخ میں آ سکتی تھیں یہاں ہاں حرام ہے۔ اَنْ تَجْمَعُوا بِكُمْ لَوْحَةً يَنْتِ الْبَنَاءِ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں گئے۔ فیصح آیات کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کوئی نئی امور میں جوں جوں حالات بدلتے ہیں۔ احکام بھی بدلتے جاتے ہیں۔ جب انسان بچہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ضرورت اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب جوان ہوتا ہے۔ تو اس پر دوسرے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اقوام عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

الغرض ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا لَكُمْ كَيْتُ كُ
منسوخ نہیں کرتے یا اُسے نہیں بھلا دیتے۔ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا لَكُمْ كَيْتُ كُ
آیت یا حکم لے آتے ہیں اور مثلاً یا کم از کم اُس جیسا ہی لے آتے ہیں۔ نیا حکم بہر حال پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ کمتر نہیں ہوتا۔ بہتر سے مراد یہ ہے کہ نیا حکم پہلے کی نسبت اجر میں بہتر ہوتا ہے۔ آیت یا حکم بھلائیے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے ذہن سے ایسی آیت فراموش کر دی جائے
آیات کا یاد کرنا یا بھلانا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں فرمایا سَنُقْرِئُكَ
فَلَا تَنْسَىٰ هُمْ غَفِيرٌ آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں اَلَا هَآءَا
اللہ ہاں جس کو اللہ بھلانا چاہیں۔ وہ آپ بھول جائیں گے یہاں یہ بھی نَسِیَہَا کا مطلب
یہی ہے کہ جس حکم کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے اُسے نَقِیْتُ منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یا اُسے

پیغمبر علیہ السلام کے ذہن سے محو کر دیا جاتا ہے۔ **فَرَأَى الْآلَمَ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنی حکمت اور فشار کے مطابق آیت نازل کرتا ہے۔ بعض کو قائم رکھتا ہے۔ اور بعض کو منسوخ کر دیتا ہے پھر ان سے بہتر یا ان جیسی اور بے آفات۔ ایسا کرنا نخل و نقل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اعتراض کرنا حماقت کی نشانی ہے۔

پھر **فَرَأَى الْآلَمَ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** اے مخاطب! کیا تم جانتے نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ جب وہ ہاک الملک ہے۔ تو کیا اُسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے۔ معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے۔ اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لہذا وہ تینے احکام پر پلیدی طرح قادر ہے۔ اور یہ اس کا حق بھی ہے۔

فرمایا **ادْرِكُوا اَكْبَارَ مَا لَا تَعْلَمُونَ** اے لوگو! ان بڑی باتوں کو یاد رکھو جو تم کو معلوم نہیں۔ اس کے سوا اعتبار کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے۔ اہم بیضادی فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے۔ جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ مگر نصیر وہ ہوتا ہے۔ جو فی الواقع مدد کے قابل ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی وہ ہوتا ہے جو زبانی طور پر مدد کرتا ہے۔ اور نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق بھی ہے اور عظیم کل بھی ہے۔ جو نہ حکم چاہے نافذ کر دے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مغل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے۔ اور اپنی ہی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس پر اعتراض ناممکن ہے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ
وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ
⑩ وَكَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ
إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ أَفْئِدَةٍ
مَّا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑪ وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
وَمَّا تَقَدَّمُوا إِلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ
إِنْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ⑫

ترجمہ: کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح سوال کرو جس
طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ اور جو شخص ایمان کے نزلے میں کفر
اختیار کرے گا وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا ⑩ اہل کتاب میں سے بہت
سے پسند کرتے ہیں کہ مومن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ اپنے
نفوس میں حسد کرتے ہوئے۔ بعد اس کے کہ ان کے لیے حق ظاہر ہو گیا ہے۔
پس درگزر کرو اور معاف کر دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر قادر ہے ⑪ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے ہو اور بھلائی میں سے
جو کچھ تم اپنے نفوس کے لیے آگے بھیجو گے۔ اس کو اللہ کے پاس پا لو گے۔
اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے۔ ⑫

بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ
نے اہل ایمان کو راعنا کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بجائے اُنظُرْنَا
استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہودی دیدہ دانستہ راعنا کا لفظ بولتے تھے جس سے

ربط آیات

نے تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا۔ کہنے لگے اَرِنَا اللّٰهَ جَهَنَّمَ اَیُّ الشَّیْءِ نَعْلَمُ
سے ہماری بالمشافہ ملاقات کرائیں۔ تب ہم مانیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اتاری ہے
سورۃ بقرہ میں بھی اس قسم کے سوالات گزر چکے ہیں۔

مشرکین کے
سوالات

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطبین اہل کتاب کے علاوہ مشرکین
بھی ہیں۔ ان کے بیودہ سوالات کا تذکرہ بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔
سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق انہوں نے نبی علیہ السلام سے فرشتہ کی کہ آپ یسوعیٰ لگا کر ایمان
پر چڑھ جائیں۔ اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ مکے کی سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔
آپ کے ارد گرد فرشتوں کی جماعت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آکر
آپ کی رسالت کی تصدیق کرے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام سوالات
کا ایک ہی جواب دیا۔ قَدْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُکُمْ یعنی
میں انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں قادر مطلق
ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا
ہے۔ مقصد یہ کہ یہود کی طرح مشرکین بھی طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ اس قسم کے سوالات
کا مقصد محض ختمہ چینی ہوتا ہے اور کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے

صریح گمراہی

فرمایا اس طرح کے بے معنی سوالات نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔
وَمَنْ یَّتَّبِعْکَ الْکَافِرُ یَا دِیْمَانٍ جو کوئی ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کرے گا۔
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ
اعتراض برائے اعتراض اور وہ بھی ایذا رسانی کے لیے کھلی گمراہی اور کفر ہے۔ یہاں پر
اگر یہ روئے سخن اہل کتاب اور مشرکین کی طرف ہے۔ تاہم بات اہل ایمان کو بھی سمجھانی
جاری ہے کہ جو بھی اس قسم کے بیودہ سوالات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ بہر حال راستے سے بھٹک جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اَمْرٌ تَرْبِیُّہُ دُنَّ کے مخاطب اہل ایمان میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو یہود اور مشرکین کی روش سے خبردار کیا ہے۔ کہ تم ان کے طریقوں کو نہ اپنانا یعنی تم بھی اپنے نبی آخر الزماں علیہ السلام بلا وجہ سوالات نہ کرنا جس طرح اس سے پہلے اہل کتاب لے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے اور ان سوالات کی وجہ انہیں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ غزوہ جینن کے موقع پر حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ مشرکین ایک خاص قسم کے درخت کو تبرک خیال کرتے ہیں۔ اس درخت کے ساتھ اپنے اسلحہ جات لٹکاتے تھے۔ اس کو ذات النواط کہتے تھے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضرت! اَجْعَلْ لِّذَا ذَاتِ النَّوَاطِ اَپَ ہمارے لیے کسی درخت کو ذات النواط مقرر فرما دیں جس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں۔ جیسا کہ مشرک کرتے ہیں۔ آپ یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا سُبْحَانَ اللہ یہ تو اس قسم والی بات ہو گئی۔ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بکھرے قلمزم عبور کیا تو ان میں ایک قوم کو یہاں یَعْلَمُونَ عَنْ اَصْنَابِ لَہُمْ عُرُجٌ جو اپنے معبودوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے بنی حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے عرض کیا یٰمُوسٰی اَجْعَلْ لِّذَا اِلٰہًا کَمَا لَہُمْ اِلٰہَةٌ جس طرح ان لوگوں نے اپنے معبود بنائے کھے ہیں، اسی طرح ہمارے لیے بھی معبود مقرر کر دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ناراض ہوئے اور کہائے یہ تو قوت قوم! یہ لوگ تو کفر میں مبتلا ہیں۔ کیا تم بھی اسی ہلاکت میں پڑنا چاہتے ہو۔ ابھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں طاقتور دشمن سے آزادی دلائی ہے۔ تو پھر کفر و شرک میں مبتلا ہونا چاہتے ہو۔ بلا وجہ ناجائز سوال نہ کیا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بہت کم سوال کیا کرتے تھے۔ کیونکہ سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سوال سے منع فرمادیا۔

سحر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں شبہ ڈالنا مقصود تھا۔ تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے معنی سوال نہ پوچھ کر دو۔

اہل کتاب کے
باطنی ارادے

مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے ارادے بڑے خفا ناک میں وَدَّ كَيْدُ قَوْمٍ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كَفَّارًا مَخْلَصًا۔ بات سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان کمزور ہو جائیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ بھی اپنے سابقہ دین پر پلٹ جائیں۔ یہ تو نزول قرآن کے زمانہ کی بات ہے کہ اہل کتاب مسلمانوں کو پھلتا چھوٹا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی یہ کوشش سبج ہم جا رہی ہے۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی طرف لوٹا دیا جائے۔ دنیا میں جتنی مشایاں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی کام کے لیے ہیں۔ دوسرے مقام پر آئے ہیں فَتَكُونُونَ سَوَاءً۔ سب برابر ہو جائیں۔ جس طرح وہ خود گمراہ ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان کی رہنمائی پر چل نکلیں۔ جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا۔ اسی طرح مسلمان ان کی باتیں کریں گے۔ اہل کتاب کی دلی خواہش یہی ہے۔

فرمایا اہل کتاب کی اس گندہ فہمیت کے نیچے ان کی ایک اور خباثت کا ذکر فرمایا۔ یعنی حَدَّ اَمِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ۔ ان کے نفسوں میں چھپا ہوا حسد ہے۔ جو انہیں مسلمانوں کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ ایسا کسی خطہ فہمی یا لاعلمی کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ قَدْ بَعَثْنَا مِنْهُمُ الْخَوَافِیْنَ۔ سب کچھ حق کے اظہار کے بعد کہہ رہے ہیں۔ انہیں حق اور باطل میں تمیز ہو چکی ہے۔ مگر حسد اس بات پر کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم بنوا مغل کی بجائے بنو اسحاق میں کیوں نہیں آیا۔

حسد جہترین
بیماری ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حسد و دبدبہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ فلاں نعمت فلاں

لو کہیں ملی ہے اور پھر اس کے زوال کی تمنا کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ فتنہ نعمت اس کی بجائے مجھے ملنی چاہیئے، ایسی خواہش کرنا حرام ہے، یہ اخلاقی بیماری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: **إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ** یعنی حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔ حسد اتنی بڑی چیز ہے۔

امیر بن ابی صلت عرب کا عظیم شاعر اور حکیم تھا۔ خدا کو مانتا تھا، قیامت کا تصور ذہن میں موجود تھا۔ اسی لیے سنی مذہب کا متلاشی تھا۔ کبھی تو رات کا مطالعہ کرتا کبھی انجیل پڑھتا کبھی اہل کتاب سے گفتگو کرتا، تاکہ حق کو پاس کرے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تو یہ شخص حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ یہ بات تھا کہ وحی اس پر نازل ہوتی، محض حسد کی وجہ سے دین خاص کا مخالف ہو گیا، اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

حسد کو قطعاً حرام ہے۔ البتہ غبطہ یا رشک جائز ہے۔ غبطہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس نعمت دیکھ کر تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ایسی نعمت سے سرفراز فرمائے حسد کا معنی تو یہ ہے کہ جس کو کوئی بستی ملی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے، مگر غبطہ میں کسی کے زوال کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔

بزرگان دین فرماتے ہیں **مَا خَلَقَ جَسَدًا عَنْ حَسَدٍ** عام طور پر کوئی جسم حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لیے تعویذ کی تلقین کی گئی ہے: **وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ** اے اللہ میں حاسد کے حسد سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ہر حال حسد ایک بہت بڑی بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

جیسا کہ عرض کیا، غیر مسلم اقوام میں مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بجھ کر رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ کی عیسائی طاقتیں اربوں روپیہ اس مقصد کے لیے خرچ کر رہی ہیں

غیر مسلم
حسادت

کہ کسی طرح کمان قوم کا تعلق قرآن پاک سے منقطع کر دیا جائے۔ مستشرقین کا فتنہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے الحاضری العالم الاسلامی جو ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یورپی عیسائیوں اور یہودیوں نے بغیر اصلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو نسخہ کرنے اور قرآن پاک کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اگر عیسائیت نہ بھی قبول کریں تو کم از کم مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہیں۔ مشنری سکول، ہسپتال وغیرہ سب اسی مقصد کے لیے چل رہے ہیں۔ لوگوں کو لالچ دیکر عیسائیت کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی حسد کی بنا پر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلق اپنے نبی سے کٹ جائے۔ اور یہ قرآن پاک کی تعلیمات کو چھوڑ دیں۔

صدر رحم
پر اعتراض

صدر رحم کا انکا بھی یہودیت کا شاخہ نہ ہے۔ اس شخص کی خباثت کی داد دوس نے فیڈرل شریعت کورٹ میں دعویٰ دائر کیا ہے۔ کہ رحم کی سزا کو کالعدم قرار دیا جائے۔ کیونکہ بقول اس کے یہ شرعی مد نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ لوگ شوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے بیزار ہو جائیں۔ غارتیوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ اور آج کے زمانے کے پرویزی اور چکراونی بھی اسی قماش سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں رحم کی سزا نہیں ہے۔ بمبئی! صحیح سنت میں تو موجود ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں رحم کے متعدد کیس ہوئے۔ صحت یہ کہ ام غم کے زمانے میں رحم کی سزا دی گئی۔ اگرچہ عام طور پر رحم کی سزا قرار جرم پر ہی دی گئی۔ تاہم اکتے دس گئے ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ جن میں گواہی کی بنیاد پر رحم کی سزا دی گئی۔ اس زمانے میں کسی کو رحم کی سزا ملی ہو یا نہ۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس کے شرعی مد ہونے سے مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے
خلاف سازش

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکالر کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نسخہ چینی کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو جائیں۔ ٹیمڈ سٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بڑا کھانا کھا۔ کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی تواریک انسانیت کی دشمن میں (العیاذ باللہ) اُس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کھانا کھا۔ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ یہ دنیا مہذب نہیں بن سکتی۔ لہذا

اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہوگی۔ اس کا مطلب یہی تھا۔ کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے۔ جو فحاشی سے روکتی ہے۔ اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی۔ ان کے نزدیک انسان مہذب نہیں کہلا سکتا۔ لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے۔ کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے محو کر دیا جائے۔

فرمایا بہت سے اہل کتاب یہ پسند کرتے ہیں کہ تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ ایمان کے بعد احمد کرتے ہوئے بعد اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو یقین کی جارہی ہے۔ کہ اہل کتاب کے خلاف کسی قسم کا انتقامی جذبہ ذہن میں نہیں رکھنا۔ بلکہ فَاَعْتَنُوا لِنَفْسِكُمْ اور وَاَصْلَحُوا اور وَرَكُوزُكُمْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سے آئے۔ گویا مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کی بجائے حکم الہی کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ اور مدینہ طیبہ بلکہ پورے عرب کو یہودیوں اور نصاریوں سے پاک کر دیا گیا۔ فرمایا إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وقت آنے پر وہ ان بدبختوں سے مواخذہ کرے گا۔

نماز اور زکوٰۃ

اہل کتاب کی طرف سے جو کس بننے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کار بند بننے کی تلقین بھی فرمائی۔ وَأَقِمْوُا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ تمہاری طاقت کا منہج یہی دو چیزیں ہیں۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ تمہاری تمام تر قوت کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے۔ اور غار۔ زکوٰۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔ اسے وقت پر ادا کرتے رہو۔ اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرو۔ بخل جیسی۔ قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے۔ اسے کبھی نظر انداز نہ کرو۔ غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں۔ اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی۔ اگر تم یہ ہدف قائم کرو کہ چاس برس میں امریکہ کے برابر مادی ترقی حاصل کر لو گے۔ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک مہرہ تم سے پچاس سال مزید آگے نکل چکا ہوگا۔ لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے۔ انہیں کے ذریعے اندر ایمان اور روحانیت پیدا ہوگی تعلق باللہ قائم ہوگا۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

فرمایا، یاد رکھو، وَمَا تَقْدَمُوا مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ
 تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے۔ کوئی نیکی، کوئی نیک عمل، صدقہ خیرات کر دو گے
 نماز ادا کر دو گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اس کا واضح
 اعلان ہے: مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ اَللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ
 ہو گا۔ بلکہ انسان اپنا برا چھپایا برا عمل قیامت کے دن دیکھ لے گا۔ یہاں بھی فرمایا کہ جو کچھ تم
 اعمال کے ذریعے آگے بھیجو گے تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ اُسے اللہ کے ہاں پا لو گے۔ ہر چیز
 کا نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو
 دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کوئی کام کس
 نیت اور ارادے سے انجام دے رہے ہو۔

آلہ

درس چل و چار

البقرة ۲

(آیت ۱۱۲ تا ۱۱۳)

وَقَالُوا لَوْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ
 آمَانَتُهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ
 مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ
 وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل ہرگہ جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا
 نصرانی ہو۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے، الا وہ اپنی دلیل اگر تم مجھے ہر
 ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں۔ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سامنے جمع کیا دیا۔ اور وہ نیک کام
 کرنے والا ہو۔ پس اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بدلہ ہے یوں لوگوں پر
 نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۱۲﴾

اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے فضول سوال کرتے
 تھے۔ ”پھر ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان کی روش سے
 منع فرمایا۔ کہ تم یہودیوں والے کام نہ کرنا۔ اور ان کے بکاوے میں آکر دین میں شک نہ کرنے
 لگنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اہل ایمان پھر کفر کی طرف پلٹ آئیں۔ اہل کتاب حاسد ہیں۔ اسی بنا
 پر وہ انبیاء علیہم السلام پر ہتکتے چینی کرتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں نقص نکالتے ہیں۔ تاکہ مسلمان
 اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ الغرض: بنی اسرائیل کی یہ خرابیاں یَسْبِغْنَ لِرَأْسِ زَيْدٍ
 اُذْکُرُوا اِنْعَمَتِیَ اَلَّتِیْ سَے لے کر لگے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ ان کی ملت
 اور خانہ کعبہ کے ذکر تک چلی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان خرابیوں سے بچنے کی تلقین کی
 جا رہی ہے۔

یہود و نصاریٰ اہل کتاب میں یہودی اور نصرانی دونوں فرقے پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کی نسبت
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کی

ظرف منسوب کرتے ہیں۔ محض حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان ہے اور نہ تورات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریر کر کے اس کا علیحدہ بگاڑ دیا۔ اس بات کا تذکرہ گذشتہ دروس میں آچکا ہے۔ آج کل یہودیوں کو صیہون بھی کہا جاتا ہے۔ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ ان نسبت سے انہیں صیہونی کہتے ہیں۔

نصاری اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی طرف کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بستی کا نام ناصروت ہے۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ تاہم مسلمان مغربین کو رطلہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا تھا مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ يَعْنِي اللَّهُ كَيْ رَاسْتِي فِي مِيرِي كُون مَد كَرَسِي كَا۔ تو توراتیوں نے کہا تھا بَخْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ بِمِ اللَّهِ كَيْ دِينَ كِي مَد كَرَسِي وَلَسِي فِي۔ اس لحاظ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ نہ تو اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل پر ایمان ہے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہنے کی بجائے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ بعض تین خداؤں میں انہیں تیسرا کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں عواں کر گیا تھا۔ سورۃ مائدہ میں وضاحت موجود ہے "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ بْنُ مَرْيَمَ" یعنی وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ہے جو تینوں میں تیسرا ہے۔ وہ قطعی طور پر ملعون ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے والے بھی کلمہ کفر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے "سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ" اللہ تعالیٰ ایسی تمام شرکیہ چیزوں سے منزہ ہے۔ نصاریوں نے انجیل کو بھی تحریر کے ذریعے بگاڑ دیا ہے اب ایک کی بجائے ایک سو پچیس انجیلیں بن چکی ہیں۔ عام مشہور چار انجیلیں ماتی، مرقا، لوقا اور مرقس تو بائبل کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچویں انجیل برناباس بھی ہر جگہ دستیاب ہے

اصلاً بخیل سرکاری زبان میں نازل ہوئی تھی مگر نصرا نوں نے اس کے تراجم کر کے اصل متن کو باطل ضائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی حالت پر قائم نہیں ہے۔

نجات کا دار و مدار

الغرض! یہود و نصاریٰ دونوں فرسوں کا یہ عقیدہ اور دعویٰ تھا کہ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اَنْفُسُنَا اور نصاریٰ یعنی صرف یہودی اور نصرا ہی جنت میں جائیں گے باقی سب کے لیے جنت کے دروازے بند ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر دوزخ آریس میں بھی معافی نہیں تھی۔ بلکہ یہودی کہتے تھے کہ جو یہودی ہو گا وہ جنت میں جاتا ہے۔ اور نصرا ان کہتے تھے جو نصرا ہی پارٹی کا ممبر ہے۔ صرف وہی جنت میں جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنت پر اور کسی کا حق نہیں ہے۔ اسی دعوے کے جواب میں اللہ جل شانہ نے فرمایا۔ بَلْكَ اَهْلِيْهُمْ یہ ان کی بھل تر اشتات ہیں۔ مگر نہ اس دعوے کی حقیقت کچھ بھی نہیں گویا انہوں نے اپنی خواہشات کو عقیدے کا درجہ دے دیا۔ پہلے کسی درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب امت کا علم عمل کا رشتہ پیغمبر سے کٹ جاتا ہے۔ تو امت کی خواہشات عقیدہ بن جاتی ہیں۔ اس سے پہلے یہودیوں کے ایک اور باطل عقیدے کا بھی ذکر آچکا ہے کہ کوئی اسرائیلی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اگر بالفرض چھٹی گیا تو صرف اتنے ایام کے لیے جائے گا۔ جتنے دنوں ان کے آباء و اجداد نے بھڑے کی پوجا کی تھی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدے کو اسخ کیا تھا۔ اور پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس نبی پر وحی کی تھی۔ کہ اسرائیلی جو پاپ ہیں کرتے پھریں۔ وہ چند دن کے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے وہی بات دہرائی ہے۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْوَدَّعَاقِبَةَ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو کوئی دلیل دو۔ برہان دلیل یا سند کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع براہین آتی ہے۔ اور دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے۔ جسے سمجھ العقل آدمی تسلیم کرے۔ دعویٰ کسی بھی قسم کا ہو۔ جب تک اس کے پیچھے دلیل نہیں ہوگی۔ وہ باطل سمجھا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے متعلق کہنا لَا يَرْجُوْا كُنْزًا کہ یہ فاسق و فاجر ہیں

عِندَ رَبِّهِمْ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ پس اس کا حساب ان کے رب کے پاس
جا کر ہی ہو گا۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔ زیادہ سے
زیادہ یہ لوگ رواج کو بطور دلیل پیش کر بات کہتے ہیں۔ باوجودیوں کرتے ہیں۔ ہمارے
قوم کا یہ رواج تھا۔ ہمارے علمائے دین اس بات کو نہانتے تھے۔ برخلاف اس کے توحید کے
ہزاروں کھڑوں دلائل آپ کے مشاہدہ کے یہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ نجات غلط ہے۔ یہ شخص مخصوص فرقہ
کی بنیاد پر جنت میں نہیں جاسکتے۔ نجات کا یہ قانون ہرگز نہیں ہے۔

فرمایا بکلی کیوں نہیں یہ جنت ایجاب ہے۔ اور یہ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرتا ہے۔ اتباع خداوندی
اپنے دعویٰ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے سوا جنت میں کوئی نہیں داخل ہو گا۔ فرمایا کیوں نہیں ہو گا۔
بلکہ جنت میں داخل ہو گا۔ مگر وہ مَن اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ جس نے اپنے چہرے کو
اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ ذکر چہرے کا ہے مگر مراد اس سے ذات ہے۔ کہ جس شخص نے
اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دیا۔ وہ جنت میں ضرور داخل ہو گا۔ وَجْهَهُ
کا یہ معنی دوسرے مقام پر بھی آتا ہے جیسے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" ہر چیز فنا
ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ذات خداوندی۔ حتیٰ۔ قیوم ہے۔ وہ دائم۔ قائم۔ انہی
اور ابدی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز بے فعل فانی ہے فنا ہو چکی ہے۔ یا آئندہ فنا ہو جائے گی۔
قائم اور دائم ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

مَن اسْلَمَ جس نے تابع کر دیا۔ اسلام کا معنی منقاد ہو جانا یا تابع ہو جانا۔ آگے
آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فرمایا "اسْلِمُوا"
یعنی طبع ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا "اسْلَمْتُ لِلرَّبِّ الْعَلِيمِ" میں ظاہر
باطن طریقے سے اللہ، بے تعین کافر مانہ دار ہوں۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے
لیے سرلمحتیا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔
یہاں سے تہمت کر کے قلعیدہ بنے باؤ آپ نے تعمیل کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ غار کعبہ
تعمیر کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ بیوی بچوں کو دین

چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ گویا انہوں نے اَسْلَمْتُ لِلرَّبِّ الْعَلِیِّیْنَ
میں نے جو اقرار کیا تھا اسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔

نیک نیتی

فرمایا جنت میں جانے کا معیار یہ ہے۔ مَنْ اَسْلَمَ یعنی جو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو گیا۔ مقصد
یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل میں کمر بستہ ہو جائے۔ اس کا اعتقاد درست ہو جائے۔ اس
کی فکر پاک ہو جائے۔ اس کا ایمان مکمل ہو جائے جس کا تعلق نیت اور نیت سے ہے۔ ایمان
کا تعلق چونکہ باطن سے ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انسان کی باطنی طہارت کی ضرورت ہے
اس کے قلب و روح میں اللہ تعالیٰ کی دامنیت سرایت کر جائے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی
شریک ہے۔ اور نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے۔ اگر دل کے کسی گوشے میں شرک کا
معمولی سا شائبہ بھی موجود ہے تو ایسا شخص مومنہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شرک ہے یا منافق ہے یا شک
کرنے والا ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی حدیث ہے۔ حُضْرَ عَلِیِّہِ السَّلَام نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ
لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُورِکُمْ وَلَا لَوَاسِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ
یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری شہوں اور رنگوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے
کس شخص کے اعمال کا دار مدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ فَادْعُوا
اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ اللہ کو پکارو۔ خاص انہی کی اطاعت کرنے والے ہیں جاؤ۔
حدیث شریف میں ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اِنما اپنے باطن کو درست کرو۔
جنت میں داخلے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

امام رزمیؒ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک
ایماندار آدمی بھوک میں مبتلا تھا۔ سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر
آئے۔ اُس نے کہا، کاش میرے پاس ریت کے ان ٹیلوں کے برابر اناج ہوتا۔ تو میں سب
بھوکوں میں تقسیم کر دیتا۔ چونکہ خود اس وقت بھوکا تھا۔ اُسے بھوک کا تعریف محسوس ہوئی تو اس
نے دست بھوکوں کو خیال میں لاتے ہوئے یہ بات کی۔ کہنے لگا اللہ تعالیٰ کو کئی بات پسند

آئی۔ چنانچہ اس وقت کے نبی پر وہی بھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تیری اس خالص نیت کو قبول کر کے تجھے ریت کے ٹیلوں کے برابر غلط تقسیم کرنے کا ثواب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ جیسی تمہاری اچھی نیت تھی۔ ہم نے دیا ہی اچھا اجر عطا کیا ہے جنت میں داخلے کا جو اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ اس کا پہلا جزیرہ تھا کہ داخلے کا خواہشمند شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس کا دوسرا جزیرہ یہ تھا کہ فَهُوَ مُحْسِنٌ اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ مقصد یہ کہ جنت میں داخلہ کسی فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی کہلاتا ہو۔ بلکہ نجات کا قانون اس مقام پر یہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اسکی نیت اور ارادہ درست ہو۔ اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اور پھر دوسرا جزیرہ وہ اعمال صالحہ کرنے والا ہو۔ ایسا شخص یقیناً جنت کا حقدار ہوگا۔ اور اس کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

اعمال صالحہ

فرقہ بندی
ذریعہ نجات نہیں ہے

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ یاد رکھو نجات کا دار و مدار اکابر پر ہے۔ نہ کہ انبیا پر۔ نسب کے لحاظ سے کوئی کہتے ہیں آپ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا باطنی طور پر ایمان اور عقیدہ درست نہ ہو۔ اور ظاہری طور پر اعمال صالحہ نہ انجام دیتا ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سی فرقہ بنیادیں پائی جاتی ہیں۔ بعض جاہل یا کم فہم لوگ کسی خاص فرقے یا گروہ کو ہی نجات یافتہ تصور کرتے ہیں کہ فلاں مسلک والے جنت میں جائیں گے۔ دوسرے نہیں جائیں گے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ان میں کتنے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی باتھ تعصب رکھتے ہیں۔ بعض حنفی، خاں کے ساتھ یا شافعی، مالکیوں کے ساتھ عناد رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف ہم ہی جنت کے وارث ہیں۔ دوسرے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کے سلسلے ہیں۔ جیسے چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی وغیرہ۔ ان میں سے بھی بعض ایک دوسرے کے خلاف عناد رکھتے ہیں اور جنت کو صرف اپنی وارث سمجھتے ہیں باقی سب لوگوں کو جہنمی خیال کرتے ہیں۔ یہ تو محض فردی اختلافات ہیں بنیادی طور پر چاروں مسلک یا سلسلہ ہائے تصوف میں کوئی اختلاف نہیں۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: کہ یہ چیزیں فروعات دین میں سے ہیں۔ دین میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ مگر اس کی بنا پر دوست و فرقہ و گروہ کو جہنمی قرار دینا جاہالت محض ہے۔ دین میں جتنے مسک اور بھٹنے سوک ہیں۔ سب کا مقصد واحد ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی۔ کوئی حنفی بویا شافعی، مالکی بویا حنبلی، چشتی بویا قادری، منزلی مقصد تو سب کی ایک ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ طریقہ تعلیم مختلف ہے۔ مگر مقصد تو مختلف نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو جہنمی اور دوست کو جہنمی کہنا بات خود گمراہی کی علامت ہے اس میں اور یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس غلط فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ فروعات میں اختلاف رائے عین فطری امر ہے۔ اور اس کی گنجائش ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دو ڈاکٹر یا حکیم ایک ہی قسم کے مریض کے لیے مختلف درائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ فلاں ڈاکٹر بوقوف ہے۔ اور فلاں حکیم درست ہے۔ انہیں سب درست ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی مریض کی صحت یا بی مقصود ہے۔ دیکھو کوئی بھی تجویز کی جا سکتی ہے۔ جو اس کے مناسب حال ہو۔ لہذا دین کے معاملہ میں ایسا تعصب کیوں اختیار کیا جائے۔ کہ فلاں فرقہ ایسا ہے یا فلاں اہم ایسا ہے۔ بجائی یہ سب ایک ہی اللہ تعالیٰ کو رہنے والے تو ہیں۔ ان کے متعلق کسی گروہ میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

اب دیکھئے ملک میں فوجداری قانون رائج ہے۔ کسی ملزم کو ایک جج، سزائے موت دیتا ہے۔ تو دوسرا اسی قانون کے مطابق اُسے بری کر دیتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے کسی جج کو غلط نہیں کہا۔ کیونکہ قانون میں مختلف فیصلہ جات کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح دین کے قانون کو مننے والے سائے ہی ہیں۔ خواہ کوئی حنفی بویا شافعی۔ لہذا ان کے پیروکاروں میں بھی تعصب نہیں آنا چاہیے۔ یہ کہنا کہ فلاں فرقے والے اس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز نہیں ہوتی۔ وہ جہنمی ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ یہ زودیت اور نفرت ہے۔ قرآن پاک نے اس کی مذمت بیان

فرمان ہے۔

اعز من! فرمایا قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ جو شخص مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰہِ وَهُوَ مُحْسِنٌ قاننِ نجات جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنالیا۔ اور وہ نیک کام کرنے والا ہے۔ مجتہد و صاحبِ فرمتے ہیں۔ کہ جب اَمْسُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد بڑی بڑی چار عبادتیں ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس کے بعد پانچویں درجے میں جہاد آتا ہے۔ علاوہ ان کے ساتھ دوسری نیکیاں بھی ہیں۔ اس کو یوں بیان فرمایا فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْلَ الصَّالِحَاتِ جو کوئی بھی نیک کام کرے گا۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اس کا معنی یہ صحیح ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی عمل کی ناقصی نہیں فرمائیں گے۔ اپنے ہر کام کا بدلہ وہ پائے گا۔ ہاں! اگر ایمان ہی مغفود ہے۔ معنی یہ صحیح نہیں ہے۔ تو پھاڑوں بتنی بڑی بڑی نیکیاں بھی گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی۔ لَا يَقْدِرُونَ عَمَّا كَسَبُوا ان کی کھائی میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ان کی نیکیاں گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ گویا کہ وہ رکھ کے ذرات تھے۔ جو آندھی کے آگے بالکل نہ ٹھہر سکے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ بڑے بڑے عامل، ریاستیں اور تختیں کرنے والے۔ کام کر کے تھک جانے والے ہوں گے۔ مگر قیامت کے روز تَصْلٰی نَارَ حَرَمِیَّةٍ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم تھے۔ سب نیکیاں ریت کاں جائیں گی۔ ہر حال قانونِ نجات فرقہ بندی نہیں بلکہ اتباعِ خداوندی اور اعمالِ صالحہ ہیں۔

فرمایا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر لیا۔ اور پھر وہ نیکی کرنا لایا فَلَدَّ اَحْزَرَهُ عِنْدَ رَبِّہٖ پس ایسے شخص کے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے۔ نیکی کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ ایسے اشخاص مقبل میں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ان پر ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کم از کم موت کا ڈر تو اسے ہر وقت لگا رہتا ہے۔ گویا موت ہر وقت اس کے پیش نظر ہے۔ پھر دولتِ ابد صحت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ پتا

نہیں یہ بولت مہائے پاس ہے گی یا نہیں۔ پتا نہیں کل کو صحت بھی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ تو اس قسم کے خوف انسان کے ہمیشہ دامن گیر رہتے ہیں۔ مگر جن کا عقیدہ صحیح ہوگا۔ جو اعمال اچھے کرنے والے ہوں گے۔ وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہیں نہ پینے ماضی پر افسوس ہوگا اور نہ انہیں مستقبل کا کوئی خدشہ ہوگا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے کوئی کمائی نہیں کی۔ زندگی کی پونجی کو ضائع کر دیا۔ وہ افسوس کریں گے۔ کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دی تھی۔ مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نہ عقیدہ درست کیا اور نہ نیکی کا کوئی کام کیا۔ ایمان سے محروم ہے۔ ایسے لوگ خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اور پینے کے پیر ہمیشہ افسوس کرتے رہیں گے۔

الْمَآءِ

درس چل و پل ۲۵

البقرة ۲

(آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ
يُذَكَّرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الذُّنُوبِ خِزْيٌ وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ
فَإِنَّمَا تُكَلَّفُ شِمَةٌ وَمِثْلُ اللَّهِ أَنْ لِلَّهِ وَاسِعٌ عَلَيْهِ ﴿١١٥﴾

ترجمہ: یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ
یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان کا دین صحیح نہیں ہے) حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں
اسی طریقے سے اہل لوگوں کی جو جانتے نہیں (جابل ہیں) ان جیسی بات پس اللہ تعالیٰ
ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف
کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں
سے منع کرتا ہے۔ کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اور ان کی بربادی میں کوشش
کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ کہ نہیں ہے ان کے لیے کہ داخل ہوں۔ ان
گھروں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان
کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب
پس ہر بھی تم نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا
ہو سب کچھ جانتے والا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

یہودی و نصاریٰ
آئینے منہ

یہودیوں اور نصاریٰ کی بجلہ خرابیوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایک گروہ

دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ مشرکین کا ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کو باطل کہہ کر اپنے آپ کو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے۔ تو گویا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کا ابطال کرتے ہیں۔ ان آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ نصرائی کسی چیز پر نہیں ہیں وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں۔ یعنی ان کا دین سچا نہیں ہے۔ اس طرح جب یہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا اعتراض یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کفر کیا۔ اور عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے نہ صرف ان کا انکار کیا۔ بلکہ انجیل کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہذا یہ گمراہ ہوئے۔ فرمایا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ وَهُمْ يَسْتَلُونُ الْكِتَابَ عِلَالًا یہ دونوں گروہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

کتبِ سادہ
برحق ہیں

حقیقت یہ ہے کہ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن پاک اور دیگر صحائف سب کے سب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اصل دین اپنی کتب کے ذریعے نازل فرمایا۔ مگر ان بہنجتوں نے تحریف کر کے دین کو مسخ کر دیا تاہم اصل دین ان کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے۔ جنہیں یہ پڑھتے ہیں۔ لہذا کسی کتاب کا بالکل انکار کر دینا کہ اس میں کچھ سچی باتیں ہیں۔ انصاف کے خلاف ہے۔ اور اہل کتاب کی مٹ دھرمی کی دلیل ہے۔ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا اصل دین تو نمیک تھا۔ مگر انہوں نے خرابیاں پیدا کر دیں۔ یا انصاف ہی کہ دین اور کتاب برحق ہے مگر ان کی تحریفات نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک دوسرے مذہب کو بالکل ہی باطل قرار دینا درست نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
پر الزام تراشی

جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے توراۃ اور انجیل کی تفسیق کی کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے علاوہ تمام صحیفہ سادہ کی بھی تصدیق کی۔ البتہ قرآن پاک نے ان مقامات کی ضرورت نہ رہی کی۔ جہاں جہاں سے یہ لوگ بھٹکے ہیں

اور جہاں جہاں انہوں نے کتب میں تحریر کی ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہودیوں نے حضرت
 سیمان علیہ السلام کی طرف کفر کا کلمہ فسوب کیا۔ اور کہا کہ اُن کی سھنت بحر پر قائم تھی۔ لہذا ہم بھی
 ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بحر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے
 فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ ۚ يَعْنِي سَيْمُنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نے جادو کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ انہوں
 نے خود کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت سیمان علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے صاحبِ شریعت رسول تھے
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو بمثال حکومت عطا کی تھی۔ اُن سے بحر کی لوث نہ ابعید نہ قیاس ہے۔ انہوں
 نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي
 یا اللہ مجھے ایسی سطنت عطا کر جو میرے بعد کسی کو عطا نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو
 شرف قبولیت بخشا اور آپ کے لیے ہوا اور جنات کو منحصر کر دیا۔ مگر ان ظالموں نے سمجھا کہ یہ جادو
 کا اثر ہے۔ العیاذ باللہ۔

مشرکین کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُدھر شرکین کا حال بھی یہود و نصاریٰ سے کم نہیں۔ کَذٰلِكَ
 قَالَ الْاٰدِیْنَ لَا يَفْلَحُنَا مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ عَرَبٌ كَثُرَتْ ۚ
 کرتے ہیں۔ جو اہل کتاب نے کی۔ یہ کہتے ہیں کہ نہ یہود و نصاریٰ حق پر ہیں اور نہ مسلمان۔
 حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ تو جابلِ علق میں۔ نہ ان کے پاس
 کوئی کتاب ہے جس سے یہ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور نہ ہی دو ہزار سال کے عرصہ میں ان
 کے پاس کوئی نبی آیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جدِ تقدیر یا ڈیڑھ ہزار سال تک عرب
 غارتہ، براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے زین پر قائم رہے۔ اس کے بعد ان میں بھڑ
 پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور پھر اہل وقت بھی آیا کہ سب کے سب شرک کی طرف مائل ہو گئے۔
 ہزاروں میں سے کوئی اکا دکا ہی موصدق تھا۔ ورنہ سب دین سے ہٹ چکے تھے۔

آخری فیصلہ

عدالت الہی میں جج

الغرض! یہود، نصاریٰ اور مشرکین تمہوں گروہوں نے ایک دوسرے کی تکذیب کی۔
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جو کچھ چاہتے اور کرتے رہیں۔ قَالَ اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
 يَوْمَ الْقِيَمَةِ قِيَامَتِ كے دن اللہ تعالیٰ ہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ کہ کون حق
 پر ہے۔ اور کون اصل دین سے چرچکا ہے۔ ان کا فیصلہ ہر اس معاملہ میں ہو جائے گا۔

فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فرمایا ان کے درمیان قطعی فیصلہ
 قیامت کو ہوگا۔ تاہم جہاں تک ہدایت اور گمراہی کا تعلق ہے۔ تو اس کے متعلق اسی سورۃ میں
 آئے آیت: قَدْ تَبَيَّنَ التَّشَدُّ مِنَ الْغَيِّ ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہیں۔
 دنیا میں حق کے متلاشی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع پیدا فرمادیے ہیں۔ وہ حق و صداقت
 کی پہچان کر سکتا ہے۔ سورۃ انفال میں ہے: وَيُخَيِّجُ مَنْ حَتَّى عَنْ أَبِي بَكْرٍ جَوَاطِكُ ہوا
 وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ اور جو زندہ ہے وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ زندہ ہے حق و باطل کی تفریق ہو چکی ہے نہ شک کے محض
 یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس واضح دلیل نہیں آئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے
 پاس اللہ تعالیٰ کا نبی آیا، اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی مگر انہوں نے انکار کر کے مقابلہ کیا اور مذاک ہوئے
 مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں باعتبار دلیل و عقل، دستور اور قانون ہدایت اور گمراہی
 کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم قطعی اور اٹل فیصلہ اللہ تعالیٰ
 کی عدالت میں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضرت علیؓ سے مروی ہے اِنْ اَوَّلُ مَنْ يَخْشَوْ
 بَيْنَ يَدَي الرَّحْمَنِ كَسْتُمْ ہیں کہ قیامت کے دن میں گھٹنے ٹیک کر رحمن کے سامنے
 بیٹھوں گا اور درخواست کروں گا کہ اے پروردگار! آپ ان بدد والوں سے پوچھیں کہ یہ
 ہم سے کیوں لڑے تھے گویا اس دن حق و باطل کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں
 ہوں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کو باطل فرقہ کہنے والوں کا فیصلہ بھی اُسی روز ہوگا۔

اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی تفریق کے لیے تمام محنت پوری کر دی ہے
 اِمَّا بَيِّنَاتٍ لِّهٖدٰنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے
 انسان کو عقل و ضمیر عطا کی۔ انبیاء علیہم السلام معجزات فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائیں اب کون سا
 عذر باقی رہ گیا ہے۔ قیامت کو کون کہے گا: مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ
 کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اب تو بشیر و نذیر آچکے۔ لہذا قیامت
 کے دن کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضرت زبیرؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔

اَتَكْذُرُ عَلَيْنَا الْخُصُومَةَ مُحَضَّرَاتٍ! قیامت کو ہمارا اور ان کا جھگڑا دوبارہ قیامت ہو گا۔
فرمایا: ہاں! جن تنازعات کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہوا۔ ان کا فیصلہ رب العزت کی بارگاہ میں
حضور ہو گا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: یہ تینوں فرقے یعنی یہود، نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے
کو گمراہ کہتے ہیں۔ یہ خود سائے کے سائے گمراہ ہیں۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مارنے
سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا۔ اور جب قریب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام
دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے۔ تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے
علماء بھی ہوں گے۔ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے۔ اور اس
کو مسیح سمجھیں گے۔ یہی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پر
لٹکانے کیلئے لے گئے۔ ان کھمبھتوں کا یہ حال ہے۔

جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو سورہ بقرہ ۱۴۱ میں بتلایا
کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہوئے۔ مقصد یہود کی دُجوئی تھی۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے قریب ہوں
اور دین کی طرف راغب ہو سکیں۔ تحویل قبلہ کی آیات قرآن پاک کے دو سر پارہ کی ابتداء سے
تشریع ہوتی ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی یہودیوں نے بہت دھرمی کا ثبوت دیا۔ اپنے تعصب
میں مبتلا تھے۔ اور مسلمانوں کے قریب نہ آئے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہی تھی کہ
مسلمانوں کے لیے بیت اللہ قبلہ قرار ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تحویل قبلہ کا حکم
دے دیا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اسی
طرح یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام سے اور دور ہو گئے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اس قدر
عنادی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي

خَرْابِهَا اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا

نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الحداد

فرماتے ہیں: کہ اس آیت کے مصداق نصاریٰ ہیں۔ جنہوں نے یسوع کا مقابلہ کر کے توراۃ کو جلا
تھا۔ اور بیت المقدس کو دیران کیا تھا۔ یہ آیت مشرکین مکہ پر بھی صادق آتی ہے۔ جنہوں نے ۵۶
میں مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیا تھا۔ اور حرم پاک میں عمرہ ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ حالانکہ
مسلمان محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان کا لڑائی کر نیکا ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو اس وقت
کے واقعات ہیں۔ یہ آیت آج بھی اُسی طرح نافذ ہے۔ جس طرح یہ اپنے نزول کے وقت تھی
آج بھی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے۔ مسجد کی بربادی کا عہد
ہوتا ہے۔ وہ اس آیت کی رو سے بہت بڑا ظالم ہے۔

یسودی اور نصرانی ہمیشہ ایک دوسرے کو مسجد میں جا کر عبادت کرنے سے روکتے رہے
ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب بھی یسوع کو موقع ملا انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ ہی سوک کیا۔
اور جب نصاریٰ کو فلبہ محل ہوا۔ تو ان ظالموں نے بیت المقدس کو اکھاڑ دیا۔ گودا کو تندر آتش
کیا۔ اور عبادت خانوں کو برباد کیا۔ مشرکین مکہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سوک کیا۔ مکی
زندگی میں حضور علیہ السلام خانہ کعبہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو سخت اذیتیں
دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی پٹائی کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ ابو جہل کی حرکات
کا ذکر خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿اَرَاَيْتَ الْكَذِبِيْنَ هُمْ﴾ ۹ ﴿عَبْدًا
اِذَا هَمَّ بِشَيْءٍ﴾ ۱۰ کیا تم نے اس بد بخت شخص کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کے بندے کو نماز پڑھنے
سے روکتا ہے۔

دوسرے مقام پر جھوٹے مدعی نبوت کو بڑا ظالم کہا گیا ہے۔ کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہو
سکتا ہے۔ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہے جس کے
پاس خدا تعالیٰ کا نبی آئے۔ ہدایت کی بات پیش کرے اور وہ اس سے انکار کر دے۔
تاہم اس مقام پر خدا کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کی مسجد میں عبادت
کرنے سے، نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ یہ تو ظاہری رکاوٹ ہے۔ کہ کسی کو عبادت کرنے

سے روک دیا جائے۔ یہ عبادت خانے کی بربادی کے مصداق ہے۔ اس کے علاوہ ایک
 باطنی بربادی بھی ہے۔ کہ وہاں پر غیر اللہ کی پرستش کی جائے۔ بہ عات کو فروغ دیا۔ ایسا کرنے
 سے نظامِ عبادت خانہ آباد ہو گا۔ مگر باطنی طور پر بیت سے خالی ہو گا اور باطنی قربانی ہے۔
 سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت خانہ زبرد کا ہو انصاری یا کسی اور کا۔ اسے
 گرانے کا حکم نہیں۔ مسلمانوں کی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو گرانے یا ان کی بے حرمتی کرنے
 کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر دیکھ لیجئے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت کیا کچھ ہوا۔ مشرقی پنجاب
 میں پچاس ہزار مساجد کی بے حرمتی ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ دوسرے مغربی پنجاب
 میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کتنے نہ۔ ننھے جمنیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ دونوں فریقوں نے غلط کام کیا۔
 عبادت خانے خواہ کسی سے متعلق ہوں۔ ان کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت جہاں قبائل شرک سے تائب ہو کر ایمان کی دولت کے ذرا
 ہوئے۔ انہوں نے اپنے مندر اور بت خانے گرا دیے تھے۔ اور وہاں پر مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ یہاں
 سہارا نہ رہا۔ کہ ان لوگوں نے اپنے ہی تہذیب پر ردہ معاہد کی جگہ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ عبادت خانے
 کی جگہ عبادت خانہ ہی تعمیر ہوا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی غیر مسلم اقوام کی
 عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ محمد بن قاسم جب سندھ پر حملہ آور ہوا۔ تو ہندوؤں کے بعض
 مندروں کو نقصان پہنچا تھا۔ مسلمانوں نے خود اس نقصان کی مدافعت کی۔ ورنہ نقصان زدہ مندروں کو
 دوبارہ تعمیر کر دیا۔ کیونکہ کسی کے عبادت خانے کو گرانے کا حکم ہرگز نہیں ہے۔

ابنہ سلطان محمود غزنوی نے سومات کے مندر کو ٹھکانہ کوئی چھپا کاہ نہیں کیا تھا۔ دقیق طور
 پر وہاں مسجد بھی بنادی۔ مگر وہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے پھر وہاں
 پر مندر تعمیر کیا۔ راجندر پراشد نے سوالا کھ روپے کے عوض کابل سے مندر کا گیسٹ بھی واپس منخوا کر
 اسی جگہ نصب کیا۔ جہاں سے اکھاڑا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ غلط کام کا نتیجہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔
 ترکوں نے بھی اپنے دور میں ابا صوفیہ کا مندر جاکر وہاں مسجد تعمیر کر لی۔ جب اخیر

کو وہاں غلبہ حاصل ہوا۔ تو وہاں پر گرجا بنایا۔ اب چیتختے ہیں۔ کہ ہماری مسجد تھی۔ بہت بڑی لاٹھری تھی۔ جو غنائے ہو گئی مگر جس طرح مرنے کی۔ اسی طرح کا جواب انہوں نے دیا۔ اب چیتختے چلانے کا کیا مطلب۔ وہاں اگر عیسائی خود عثمان ہو کر اپنے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیں۔ تو وہ جائز ہے۔ مگر کسی کے عبادت خانے کو زبردستی گرجا بنا کر بالکل نامناسب ہے۔

مسجد کے نواب

جس طرح مسجد کا ظاہری طور پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسجد کو باطنی خرابی سے محفوظ رکھنا بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ ————— باطنی خرابی یہ ہے۔ کہ مسجد کو اس کے اصل مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسجد عبادت خانہ ہے۔ اس میں نماز، تلاوت، ذکر و اذکار ہونا چاہیے۔ نہ کہ دنیا کے دوسرے کاروبار۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے مسجد میں حد قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسجد میں کسی مقدمے کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر طرم کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ کہ اس سے مسجد کی بھیر مٹی ہوتی ہے۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا، فحش کلامی۔ گالی گلوچ کرنا، گندگی پھینکنا، تجارت یا لین دین کرنا۔ یہ سب مسجد کے آداب کے خلاف ہے۔ حضور علیہ السلام نے گندہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا۔ بلکہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں گندگی کا اعلان کرے۔ اس کے حق میں یوں دعا کرو۔ کہ اللہ تعالیٰ تیری پیز تجھے واپس لوٹائے۔ تو نے آداب مسجد کا خیال نہیں رکھا۔ اسی طرح فرمایا۔ کہ مسجد میں تجدد کرنے والے کے حق میں کہو کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس تجارت میں نفع نہ دے۔

مسجد میں شعر گوئی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ ایسی شعر گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان بن ثابت سے منقول ہے۔ مگر موجودہ زمانے کی طرح مسجد میں ہر قسم کی شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ جن میں عشقیہ غزلیں گائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاشد الاشعار سے منع فرمایا۔

۱۔ ابوداؤد ص ۲۶۱ ۲۔ ترمذی ص ۴۷ ۳۔ مسلم ص ۲۱۱

۴۔ ترمذی ص ۲۶۱، دارمی ص ۲۶۶ ۵۔ ترمذی ص ۴۷ ۶۔

مسجد کی بے ادبی کے بعض دوسرے ذرائع سے بھی منع کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ماجہ شریف کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ چھوٹے بچوں یا کسی پاگل کو مسجد میں نہ آنے دو۔ وہ مسجد کی بھڑکتی کابست بن سکتے ہیں، چھوٹے بچے مشابہت نہایت دیر کر سکتے گا۔ وہ ابھی شور نہیں رکھتا اس جب بچہ پانچ سات سال کا ہو جائے تو مسجد میں آ سکتا ہے۔

الغرض! فرمایا اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ اور مسجدوں کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فَمَا بَأْسُ الْيَهُودِ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ أَنْ يَكُنْ خُلُوعًا لِّأَخِيهِمْ ان لوگوں کا اصل میں حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر خوف کہتے ہوئے۔ یعنی کفار اس لائق ہی نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوں۔

الْأَخِيَاءُ کہ عیب یہ بھی ہے کہ مسجد میں خشوع و خضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ آواز کو بلند کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔ مسجد میں جھنجھو پکار اور ایسی ایسی دنیوی باتیں کرنے کی ممانعت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے إِذَا مَرَرْتُمْ بِرِجَالِ الْجَنَّةِ فَأَنْتَعُوا جب تم جنت کے باغوں میں جاؤ، تو وہاں چرچہ مچگیا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا جب تم مسجد میں جاؤ تو وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اس کی تسبیح و تہلیل بیان کرو۔ تلاوت کرو۔ درود پاک کا ورد کرو۔ معتکف ہو کر خاموشی سے بیٹھو۔ اگر اعتکاف کی نیت کر کے بالکل خاموش بھی بیٹھ گئے۔ تو باہر کی باتوں اور کئی گناہوں سے بچے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر بھی پائے گا۔ مگر لوگ اکثر ایسا نہیں کرتے۔ مسجد میں فضول کہیں مانتے ہیں۔ خشوع و خضوع سے محروم ہوتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب خشوع و خضوع اٹھ جائے گا۔ آپ ایک بڑی مسجد میں داخل ہوں گے، وہاں پانچو آدمی موجود ہوں گے۔ مگر ان میں ایک

بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جس کے چہرے پر خشوع و عاجزی کے آثار نظر آتے ہوں۔ سب فضول
حرکات میں مصروف ہوں گے۔

فرمایا جو شخص مساجد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکتا ہے۔ اور مسجد کی بربادی چاہتا ہے
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ لِّیْلے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کے لیے آخرت میں بھی سخت عذاب ہوگا۔
اہل ایمان کو مکہ چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ چہرہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز
پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی۔ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ مَشْرِقُ
اور مغرب سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ فَاِیْسَمَاعُوْا لَوْ اَتَمَّ جِدَّہُ رُخَّ کِرُوْکے فَشَعَّ
وَجْہُ اللّٰہِ تم اللہ کی توجہ اُدھر ہی پاؤ گے۔ لہذا تم کسی قسم کی گنجائش محسوس نہ کرو۔ وَلِلّٰہِ
ہر وقت تمہاری ساری طاقت ہے۔

استقبال قبلہ

استقبال کعبہ کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ سفر کے دوران اذھیری رات
یا طوفان باد و باران میں اگر قبلہ کا رخ معلوم نہ ہوتا، تو ہر شخص جس طرف رُخ ہوتا اُنہی طرح
نماز ادا کر لیتا۔ ترمذی شریف میں آتا ہے۔ کہ ایسا ہی کوئی واقعہ صحابہ کرام کو پیش آیا جب
حضور علیہ السلام کو پتا چلا تو یہی آیت تلاوت فرمائی فَاِیْسَمَاعُوْا لَوْ اَتَمَّ جِدَّہُ رُخَّ کِرُوْکے فَشَعَّ
اللّٰہُ یعنی
تم نے جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ سب کی نماز درست ہے۔ اللہ تعالیٰ
کے ہاں مقبول ہے۔ اگر قبلہ کا رخ درست نہیں تھا تب بھی نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو۔ تو جس طرف بھی وہ جا رہا ہے اسی طرف نفلی نماز ادا کر سکتا ہے
صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سفر پر تھے۔ اگرچہ آپ کا رخ مبارک قبلہ کی طرف
نہیں تھا۔ پھر بھی آپ نفلی نماز ادا کر لیتے تھے۔ تو ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا کہ تمہارا رُخ تبطون
بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اُدھر ہی متوجہ ہے اِنَّ اللّٰہَ وَابِعٌ عَلَیْہِ اللّٰہُ تعالیٰ بڑی وسعت والا
اور سب کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَدُلْ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ لَّهُ قَانُونٌ ۝۱۱۶ بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝۱۱۷ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝۱۱۸ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۱۹

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے کہ اللہ نے بیٹا بنالیا۔ پاک ہے اس کی ذات، بلکہ اُسی کے لیے بن۔ جو پہلے آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُسی کی اطاعت کرنے والے ہیں ۝۱۱۶ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اُسے آتا ہے۔ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے ۝۱۱۷ اور کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کلام کرتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح کہا ان سے پہلے لوگوں نے ان کی بات کی طرح۔ ان کے دل آپس میں جڑے جلتے ہیں۔ تحقیق ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات بیان کر دی ہیں جو یقین رکھتے ہیں ۝۱۱۸ بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور آپ سے درجہ والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا ۝۱۱۹

اللہ تعالیٰ والہ
سے پاک ہے

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے۔ ان آیات میں ان کی ایک اور بدعتیہ گئی کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے۔
قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا اس غلط عقیدے میں یہ قیمنوں مگر وہ شامل ہیں۔ یعنی

یہود، نصاریٰ اور مشرکین قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لٹتی ہے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے کہ یہودیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا ہے؟ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ بْنُ اللَّهِ اگرچہ تمام یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا ہے جو اہل کتاب میں شامل ہے۔ مگر عقیدہ یہ رکھتا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا عقیدہ تو واضح ہے۔ کہ یہ کھل کر کہتے ہیں الْمَسِيحُ بْنُ اللَّهِ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ قرآن پاک نے یہ بات تصریح کے ساتھ بیان کی ہے۔ کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا بنانا اتنا قبیح فعل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، اس کے حکم سے زمین و آسمان پھٹ جائے۔ اور خدا تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا بڑی بیہودہ بات ہے مشرکین عرب کے متعلق تصریح موجود ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے وَجَعَلُوا الصَّلَاطَ الْاِذْنَ هُمْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ اِنَّا نَاۤءُ

اس باطل عقیدے کے رتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَجْحَنَةً اللہ کی ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے۔ بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے محبوب ہے۔ اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے۔ اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، فردانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔

مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے معیوب نہیں کہ مخلوق عاجز ہے۔ اسے اولاد کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے محروم ہوتے ہیں۔ برخلاف اسے اللہ تعالیٰ تو احد ہے۔ اس کی صفت تو یغنی ہے۔ وہ صمد ہے۔ وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے۔ لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بُری بات ہے۔

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بچے کی صورت میں لڑکے کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کو طرف کرنا بہت

قیح حرکت ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے۔ سُبْحَانَہ سے یہی مراد ہے۔
 جب انسان کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں نقصان
 آتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو تشبیہ آتی ہے۔ یا تہک یہ ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ
 مخلوق کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائے۔ مثلاً لَدُنَّہُ ہرنا مخلوق کی صفت ہے اگر
 یہی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے تو یہ تشبیہ کا ارتکاب ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفت
 مختصہ کو مخلوق میں ثابت کیا جائے، تو شرک ہو جائے گا۔ مثلاً قَادِرٌ مطلق، علیم کل اللہ تعالیٰ کی
 ذات ہے۔ اور اگر یہی صفت کسی مخلوق میں مانی جائے۔ تو شرک ہوگا۔ سُبْحَانَہ کا لفظ
 اللہ تعالیٰ کی اسی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔

تشبیہ و شرک

صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے سُبْحَانَہ کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا:
 تَنْزِيَهُ اللّٰهِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ بِرَقْمٍ كِي بَدَلِ رَجَبٍ سے پاکیزگی۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن
 عباسؓ سے دریافت کیا کہ حضرت اللہ جل شانہ کا معنی تو ہم جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے
 بڑا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب جی سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں الْحَمْدُ لِلَّهِ
 کا معنی یہ ہے کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ حضرت سُبْحَانَہ کا مطلب
 آپ سمجھادیں۔ آپ نے جواب دیا۔ یہ کون سی شکل بات ہے۔ سُبْحَانَہ اللہ ایک ایسا کلمہ ہے۔
 جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے۔ کہ اس کلمے
 کے ساتھ میری تعریف کیا کرو۔ الغرض! یہ چاروں کلمات یعنی اللَّهُ أَكْبَرُ۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔
 الْحَمْدُ لِلَّهِ اور سُبْحَانَہ اللہ خدا تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ مطلب یہ
 ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ تمام تعریضیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

مالک اور مملوک

فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بَلَّ لَّہُ مَا فِی السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں
 اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے۔ مگر یا اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں

ہے۔ بلکہ ملک اور ملک کی نسبت ہے۔ اور ہر ملک ہی یہاں ہے جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کُلُّ لَدُنَّا قَائِلُونَ۔ سب اس کے اطاعت کرنے والے ہیں۔ اس کے تعویذی حکم کی خلاف ورزی کسی میں محال نہیں۔ وہ کسی کو بیمار کرنے، یہ کو تندرست کرنے کسی کی موت طاری کرنے، اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری کرنی ہوگی۔ ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں جسے ان ٹال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نماز پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ جہاد کرو۔ ان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے تعویذی حکم کے سامنے سب کو تسلیم ختم کرنا پڑے گا۔ جب موت کے فرشتے آجاتے ہیں۔ تو پھر کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹال سکے۔ خود مرنے والا اور اس کے سامنے حمایتی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا تعویذی حکم پورا ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر ہوا۔ اول یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے۔ جو چاہے کرے اس کے راستے میں کوئی حادثہ نہیں آتی۔

صفت ابداع

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ابداع کا ذکر بھی ہے۔ فَرَّادٌ بَدَلُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ آسَمَانُونَ اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے۔ ابداع اس تخلیق کو کہتے ہیں جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ کہ جسے دیکھ کر کوئی چیز تیار کی جاسکے۔ اور پھر موجد بھی ایسا ہے کہ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا جِبَّ كَسَىٰ کام کے کرنے۔۔۔ کا فیصلہ کرتا ہے۔ فَرَّادٌ يَقُولُ لَدُنْ تَوَدَّ كَسَا ہے ہو جائے کوئی پس وہ ہو جاتی ہے۔ یہ کُنْ ایسا لفظ ہے۔ جس میں سرعت اور تیزی کا حکم پایا جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کُنْ فرماتے ہیں۔ تو کسی چیز کے معرض وجود میں آنے کے لیے نہ کسی۔ ذرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ ڈیرائن مطلوب ہوتا ہے۔ اور نہ کسی کاریگر یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ کُنْ کا لفظ بھی محض تعبیر کے لیے ہے۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتے ہیں، کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے۔ تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف خلوت

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا سخت بے ادب اور گستاخی ہے۔ یہ بے محل اور فضول بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔ اس کی چار صفات کا بیان بھی

ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ
يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ اِنَّ اِنْسَانَ مُجْبِلًا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔ اور
انسان مجبور کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اس کے مناسب حال نہیں۔ پھر فرمایا کہ فَاصْطَكْ
تَكَذِّبُنِي اَيُّهَا اَسْكُوْتُ اِنَّمَا اَسْكُوْتُ لَكَ اِنَّمَا اَسْكُوْتُ لَكَ اِنَّمَا اَسْكُوْتُ لَكَ اِنَّمَا اَسْكُوْتُ لَكَ
کہ مجھے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ جس طرح کہ پہلی مرتبہ کیا۔ یعنی انسان قیامت کا منکر ہے
یہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اور گالی اس لحاظ سے دیتا ہے کہ وہ میری طرف
اولاد کی نسبت کرتا ہے۔ حالانکہ میری بیوی ہے اور نہ اولاد ہے۔ اور نہ ہی مجھے انکی
ضرورت ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ تو وہ گویا اللہ تعالیٰ
کو گالی دیتا ہے۔ لَقَوْلُهُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَلِكَ

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تو وہ خدا کا جبر ہو گا
اگر خدا تعالیٰ کا جبر مانا جائے گا۔ تو خدا تعالیٰ خود بھی حادث ہو گا۔ بسیط نہیں ہے گا۔ اسی طرح
مجازاً بھی کسی کو خدا کا بیٹا نہیں کہہ سکتے۔ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا اس قدر قرب حاصل کرے
کہ بیٹے کی طرح ہو جائے۔ بیٹا چونکہ متصرف ہوتا ہے۔ وہ باپ کی مرضی کے خلاف بھی کوئی کام
کر سکتا ہے۔ بعض اوقات باپ کو مجبوراً بیٹے کی بات ماننا پڑتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صفت
تو یہ ہے كُلُّ لَهٗ قَانِتُوْنَ سب کے سب اُس کے مطیع ہیں۔ اُس پر کوئی بھی تصرف نہیں
کر سکتا۔ لہذا یہ بات بھی غلط ہے۔ کہ کسی کو مقرب الہی ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کر لیا
جائے۔ جیسا کہ عیسائیوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔

ایک اور غلط بات جو بعض لوگ کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
علم سے عاری، جاہل لوگ کہتے ہیں لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اللّٰهُ تعالیٰ ہر دم براہِ راست
کلام کیوں نہیں کرتا۔ اَوْ تَأْتِيُنَا آيَةٌ مِّنْ رَبِّنَا اِنَّمَا يَأْتِيَنَّاسُ كَیْفَ اَرَادَ اللّٰهُ
ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کی کتاب کی تصدیق کر سکیں مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ مشرکین میں

سے ایک شخص رافع بن حرمید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کھنے لگا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کلام کرے۔ یا وہ کوئی خاص نشانی ہمارے پاس بھیجے۔ جسے دیکھ کر ہم تصدیق کریں۔ فرمایا: یوقونی اور حماقت کا سوال ہے۔ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اس طرح کی باتیں تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پُرانا یہودہ بول رہا ہے۔ آج کے دور کے کافر، مشرک اور جاہل لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں نشانی ہونی چاہیے۔ یا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا: تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ اس قماش کے تمام اگھے پچھلے لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور لایعنی سوال پیش کرتے ہیں۔

حضور علیہ السلام
کے معجزات

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ کون سی نشانی طلب کرتے ہیں حالانکہ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ہم نے تو یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں یا معجزات دکھائیے ہیں۔ کسی ایک آدمی کو نشانی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر تقریباً تین ہزار معجزات ظاہر فرمائے۔ اور یہ سارے ان لوگوں کے سامنے ہیں۔ کیا شوق القمہ نامجزہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے۔ کیا ان لوگوں نے کھجور کے خشک تنے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی نریں جاری ہو جانا کس کے علم میں نہیں یہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہے۔ مگر یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیچھے نبی ہیں اور جن کے دل میں عناد ہے اس قسم کی بے معنی باتیں وہی کرتے ہیں۔ البتہ نبی کے دل میں تکلیف ہوگی۔ غم لاحق ہوگا۔ کہ اتنی واضح نشانیاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے براہ راست باتیں کر کے فرشتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے برابر سمجھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ یہ سب ناجائز مطالبات ہیں

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ تو یقیناً دل میں فوس

حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام ایسے نسل

پیدا ہوگا۔ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلیت ہوئے فرمایا۔
 رَمَّا سَلَكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا اے پیغمبر! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول
 بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں۔ یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری
 سناتے ہیں۔ اور مشرکین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں۔ جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لازماً
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ آپ ان کی حرکات پر غلظتیں نہ ہوں۔ اور نہ ہی ان کے
 دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں۔ کیونکہ وَلَا تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ
 آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے۔ بلکہ اُن
 سے سوال ہوگا: "مَا سَأَلَكُمْ فِي سَفَرٍ" اللہ تعالیٰ پوچھے گا۔ تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ
 تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مسکین سے ہمدردی نہیں
 کرتے تھے۔ فضولیات میں گسے ہتے تھے۔ اور روزِ قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔ لہذا آپ
 اُن کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ آپ کا کام صرف تبلیغ ہے
 باقی ان سے ہم خود نپٹیں گے۔

الہ

دریں چل و رفت

البقرة ۲

(آیت ۱۲۳، ۱۲۴)

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مَتَابَهُمْ قُلْ
 إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هِيَ الْهُدَىٰ وَلَكِنْ اتَّبَعْتُ أَهْوَاءَ هُمْ بَعْدَ
 الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ
 (۱۲۳) الَّذِينَ اتَّيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ
 يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ تَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَافُونَ (۱۲۴)
 لَيْسَ لِي سُلْطَانٌ عَلَيْكَ أَذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (۱۲۵) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ
 عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
 وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۱۲۶)

ترجمہ: اور ہرگز اسی نہ ہونگے آپ سے یہودی اور نصرانی یہاں تک کہ آپ ان کی
 امت کا اتباع کریں۔ آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور
 آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا۔ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا
 ہے۔ تو نہیں ہوگا۔ آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار (۱۲۳)
 جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تلاوت
 کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا
 پس یہی لوگ نقصان اٹھائیولے ہیں (۱۲۴) اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں
 یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ اور یہ بات کہ بیشک میں نے تم کو جہانِ دلوں پر
 نصیبت بخشی (۱۲۵) اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی
 طرف سے ذرا بھی۔ اور نہ قبول کیا جائے گا اُس سے بدلہ۔ اور نہ اُس کو سفارش فائدہ
 دے گی۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی (۱۲۶)

یہود و نصاریٰ کی ضربیاں مختلف انداز میں بیان ہو رہی ہیں اس سے پیشتر اس بات کا ذکر بھی آچکے ہے کہ اہل کتاب پابستے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ بھی پہلے دین یعنی یہودیت یا نصاریت کی طرف پلٹ آئیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اہل ایمان کمزور ہو جائیں۔ اگرچہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے۔ تاہم وہ حسد کی بنا پر بنی آخر الزماں یہ ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض باتوں میں مخالفت میں رہے تھے۔ یہ بھی کہ شاید یہ لوگ ہمارے ہو کر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ ماہ قبلہ بیت المقدس ہی رہا۔ مگر بعد میں یہی معلوم ہوا کہ مشرک تو نادانی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اہل کتاب حسد اور غنا کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرک یا تو ختم ہو گئے یا ایمان قبول کر لیا۔ مگر یہود و نصاریٰ باطل پر لڑتے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان مقسم پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ اہل کتاب سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ یہ دین خود راستہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ يَهُودِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ آپ پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے حَتَّىٰ تَبْغِ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع نہ کریں۔ ان کا مذہب اختیار نہ کریں۔ ان کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاکیدی نفی کے لیے آتا ہے۔ یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہل کتاب کو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے خوف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اہل کتاب کی جملہ ضربیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری ہتھیار کی کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایمان لے آئیں گے۔ بلکہ یہ تو اٹل مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں۔ جو کہ ناممکن ہے۔

فرمایا یہ لوگ جس ملت پر آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی خود ساختہ بات ہے قَدْ آپ ان سے فرما دیجئے إِنْ هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهَدَىٰ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اگر آپ ہدایت الہی کو چھوڑ کر ان کی ملت کا اتباع کریں گے تو یہ ہوا کی پیروی بن جائیگی۔ جو کہ ہدایت کی ضد ہے۔ اور اگر حق واضح ہونے اور علم آ جانے کے بعد آپ ان کی خواہش

گزشتہ صفحہ پر

ضمندی کے لیے
اہل کتاب کی طرف

ہدایت الہی
اصل ہدایت ہے

اتباع کرنے لگیں وَلَٰكِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمۡ بَعْدَ الَّذِيۡ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
 تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرَ اللہ کی طرف سے آپ کے کوئی
 حمایتی ہوگا اور نہ مددگار۔ یعنی اے نبی علیہ السلام اور اہل ایمان اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آخری
 کتاب ہدایت آچکی ہے۔ اگر اس کو چھوڑ کر اہل کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے۔ تو پھر
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ آپ کے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں تاہم قانون
 کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ اسی
 کی پیروی کرنا ہے۔ اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا۔ یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ اور اس سے
 کوئی بھی بری الذمہ نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا
 وَلَٰكِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اگر آپ سے بھی شرک
 سرزد ہو گیا، تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اور آپ نقصان اٹھانے
 والوں میں ہوں گے۔ یہ اصول صرف حضور علیہ السلام کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام
 انبیاء علیہم السلام پر یہی وحی بھیجی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ لہذا آپ حق کی پیروی کرتے
 رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔

یسود و نصاریٰ کا دین اسلذا تو کتاب الہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا۔ اور وہ برحق تھا۔ مگر
 اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگڑ چکی تھی۔ لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی۔ بلکہ اب تو
 آخری نبی کا دین غالب آئے گا۔ وہی قابل اتباع ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا هُوَ الَّذِيۡ اَرْسَلَ
 رَسُوْلَهٗۤ اِلٰی ہٰذَا لِيُظْہِرَ عَلٰی الدِّیْنِ کَلِمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی وہ رحیم و کریم ذات ہے۔
 جس نے اپنے آخری نبی کو سپردین کر بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کو واقعی ادیان پر غالب کر دے جب
 مقصد رسالت دیکھو ادیان پر غالب ٹھہرتا رہے کیسے ممکن ہے۔ کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب
 کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ کسری کی ہلاکت کے بعد کوئی
 دوسرا کسری پیدا نہیں ہوگا۔ اور قیصر کی ہلاکت کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہوگا۔ مگر رومیؒ نے عیاناً

نزول مسیح علیہ السلام تک باقی رہیں گے۔ اور تم ان تمام سے بادرست و گریبان رہو گے۔ کبھی ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور کبھی تم غالب آؤ گے۔ گویا یہ لوگ قرب قیامت تک باطل پر ڈٹ رہیں گے۔ لہذا ان سے قبول حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہل کتاب میں
اہل ایمان

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ کہ جب کسی قوم کی برائی بیان کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم کے سوائے لوگ ایسے ہی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کی اکثریت ان صفات کی حامل ہے۔ ان میں بعض اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر یہی چیز بتائی جا رہی ہے۔ کہ اگرچہ اہل کتاب کی اکثریت ایسی ہے۔ جو اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹ ہوئی ہے۔ تاہم ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے۔ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ جو اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالْجِئِشِ لوگ ہیں جو حقیقت میں تورۃ اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ جو لوگ سابقہ کتب کا دیہ پر صحیح معنوں میں ایمان رکھیں گے۔ وہ ہی آخر الزمان کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تورۃ و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے گا۔ وہ قرآن پر بھی ایمان لائے گا۔ یہ ساری کی ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمان تو تمام کتب کا دیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر یہ کم نکتہ قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ بہر حال فرمایا کہ اہل کتاب سات کے سات بے ایمان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی ایسے ہیں جو کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ ایمان دار ہیں۔

حق تلاوت

تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ جو شخص زبانی تلاوت تو کرے مگر اس کے احکام کی پروا نہ کرے۔ اس کے احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرے یا اس کی غلط تاویل کرے۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے۔ تو ایسے شخص نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے مگر حکم کی روایت میں آتا ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب کی مدال کردہ چیز کو مدال اور
حرام کردہ چیز کو حرام سمجھے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں مگر
استَحَلَّ حَآرِمًا مَذَّ جَسَّ نَے قرآن پاک کی حرام کردہ چیز کو مدال سمجھ لیا۔ لہذا لازم ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے مدال و حرام کی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ یہودیوں کی عہد اس کے الفاظ اور
کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ کتاب الہی کے محکم اور مشابہات تمام آیات پر ایمان ہونا چاہیے
صحاحات میں مستحبات بھی آتی ہیں۔ اُن پر بھی یقین ہونا چاہیے۔ اور عمل کرنا چاہیے۔ یہ حق تلاوت
ہے۔ ایمان لانے کے بعد احکام کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اگر عمل نہیں کرتا تو اس نے حق تلاوت
ادا نہیں کیا۔

منکرین کیلئے
خدا

فرمایا وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کفر کئے گا۔ یعنی اس کی
تلاوت کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اس کے احکام کو چھپانے گا۔ اس کی غلط تاویلیں کرے گا۔ جیسا کہ
یہودی کرتے تھے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں
اس دنیا میں تو شاید نرا سے بچ جائیں گے۔ مگر ان کا الجھم کاربڑا ہوگا۔ اور آخرت میں یہ لازماً
خدا پانے والوں میں ہوں گے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے احکام میں تحریف
کر کے اللہ کتنا حق کے ذریعہ کتنا نقصان دہ سودا کیا تھا۔

حق و باطل
کی پہچان

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک گروہ وہ ہے جس کی برائیاں مسلسل بیان ہو
رہی ہیں اور جو اپنی ضد و عناد کی وجہ سے ایمان سے محروم ہوا۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کتاب
کو صحیح طریقے سے پڑھتا ہے۔ اور پھر اس میں تحریف کرنے کی بجائے اس کے احکام پر ایمان
لاتا ہے۔ انہیں لوگوں میں حضرت عبد اللہ بن سلام ہیں۔ یہودی عالم تھے۔ مگر منصف مزاج تھے
حضور علیہ السلام سے پہلی ملاقات میں ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے یقین
ہے کہ آپ ہی اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ جن کی بشارت کتب سابقہ میں آچکی ہے۔
ان کی اکثریت متعصب تھی۔ جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور آج تک اُسی ڈگر پر چلتے آئے

ہیں۔ ان میں سے کوئی اکاؤنٹ ایسا نکلتا ہے جو تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور پھر حق کو قبول کرتا ہے۔

اسی میں ایک حق پرست محمد اسد (لیوپولڈ) ہیں۔ یہ بھی یہودی عالم تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی زبان میں 'روڈ ٹو ناکائی' ROAD TO NAKKAI یعنی مکہ کی طرف سڑک انہیں کی کتاب کے اسٹاکس نے ایک اور کتاب اسلام ایٹ کراس روڈ (ISLAM AT CROSS ROAD) یعنی اسلام چورسے پر بھی لکھی ہے۔ بڑے مجاہد دارالحدیث قزلباش ہیں۔ کچھ عرصہ پاکستان میں بھی قیام کیا ہے۔ آج کل اُردو روپ میں ہی کیسے مقیم ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ محمد کچال عیسائی دانشور تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا مستند ترجمہ کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح مکہ و کنویرہ اول کے زمانے میں مٹر کو لیم تھے۔ آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ایمان کی دولت سے شرف ہوئے۔ وہ وضو کے طریقہ سے متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ یہ طریقہ یقیناً ایک بہت سے مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنے خاندان کے انٹی اشنی ص کو مسلمان بنایا۔ عیسائی بڑے ناراض ہوئے۔ تاہم وہ اپنا کام کر گیا۔ بلکہ اُس نے عیسائیوں کو ہمیشہ مناظرہ کی دعوت دی۔ پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھا۔ کوئی اس کے مقابلے پر نہیں آتا تھا اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔

الغرض! یہود و نصاریٰ کی اکثریت بخاری رہی ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔ یہ لوگ سازشی ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق ہمیشہ غلط پراپیگنڈا کر کے لوگوں کو بہ ظن کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی مسلمان یہودی یا عیسائی نہ بھی بن سکے تو کوئی بت نہیں۔ اُسے کم از کم مسلمان نہیں رہنا چاہیے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمان کو بے دین ضرور بنادیں۔ اپنے دین پر اس کا عقیدہ متزلزل کر دیں۔ اور اس طرح ان کا رشتہ اپنے پیغمبر کے ساتھ کٹ جائے۔ یہ ان کی سازش ہے۔ جس کا شکار مسلمان ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تقریباً چالیس برائیوں کی نشاندہی کے بعد انہیں آخر میں نوحیہ انداز میں انعامات یاد کرائے۔ اور فرمایا: يَا بَنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا لِي بَنِي إِسْرَءِيلَ يَادْكُرُوا فَعَمِي السَّيِّئَاتِي اَفْعَمْتُ عَلَيْكُمْ نِيرِي اَنْ نَعْمَتِي كُوجُورِي نے تم پر انعام کیے۔

بنی اسرائیل
پر انعامات

وَاِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ اور میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی۔ بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی فضیلت کا تذکرہ ان دروس میں تفصیلاً آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرائی۔ مگر یہ ایسی ناشکرہ کفار قوم ہے کہ حسد کی آگ میں جل کر تمام حسنات فطرت کو کمر گئی۔

قیامت کا
نقشہ

فرمایا ہے بنی اسرائیل! تم نہ سمجھنا کہ ان تمام برائیوں کے باوجود تم آخرت میں کسی نہ کسی عرب لٹھے سے نہ خود ہو جاؤ گے۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُجْزَىٰ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اس دن سے ذرو جس دن کوئی کسی کے کچھ کا نہ آسکے گا۔ اُس دن انسان کے بچہ کے تمام ذرائع خواہ وہ قوت کے ذرائع ہوں یا گرفت و زاری کے سب ناکام ہو جائیں گے۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا۔ دنیا میں تو مال یا جان یا کسی قدر کے بدلے کوئی جان چھڑائی جاسکتی ہے۔ مگر قیامت کے دن مجرم سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ صرف اسکی اپنی جان ہی قابل مواخذہ ہوگی۔ فَرَأَىٰ ذَٰلِكَ تَنْفَعُهَا شَفَاعَةُ اس دن کسی کی سفارش بھی سودمند نہیں ہوگی۔ اس دن کوئی کسی بہ بخت کی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ متبادرہ عقیقہ باطل ہے کہ سنت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچالیں گے۔ سفارش تو ایماذار کی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے جس سفارش کے زعم میں ہے بنی اسرائیل! تم بدلا ہو اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے اب بھی سمجھ جاؤ۔ اور ایمان قبول کر لو۔

فرمایا جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو پھر قُلْ هُمْ يَنْصُرُونَ ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ رب العزت کی عدالت میں ٹھیک ٹھیک فیصلے ہوں گے۔ ان فیصلوں کو بدل کر مجرمین کی مدد کرنے والی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔ اگلی آیات میں ملت ابراہیمی کی تائیس سے شروع کر کے حضور علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا بیان ہے۔

البقرة

(آیت ۱۲۳)

الْقَوْمِ

درس چل و بشت

وَإِذَا بَتُلَىٰ أَبْنَاءَهُمْ رَبَّهُ يَكَلِّمَتِ فَاتَمَّهِنَّ قَالَ أَنَّىٰ جَعَلْتُ
لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو وہ بیان میں لاؤ، جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ۔ پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

ہے ﴿۱۲۳﴾

گہشت دروہی
پر ایک نظر

سورۃ بقرہ کی ابتداء میں قرآن پاک کے کتاب ہدایت ہونے کا بیان تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا۔ پہلا گروہ ہدایت کو قبول کرنے والوں کا دوسرا منکرین کا اور تیسرا منافقین کا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع سے اپنی توحید کا اقرار اور اپنی عبادت کے لیے کہا۔ پھر قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا ذکر کیا۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے آگے تخلیق آدم علیہ السلام اور پھر ان کی خلافت ارضی کا ذکر کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں طے ہو چکا تھا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے زمانے میں ایک عظیم قوم تھی اُسے اُس وقت اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی خرابیاں لاتعداد ہیں مگر ان آیات میں ان کی چالیس کے قریب خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور فرمایا اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور ان کی ناقدری نہ کرو۔ فرمایا: **وَامِنُوا بِمَا أُنزِلَتْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو میں نے سب سے آخر میں نازل کیا ہے اور وہ سابقہ کتب کی مُصَدِّق ہے۔

یَسْبِيْنِي اِنْ سَوَّاهُ نِيْلًا اَذْكُرُوْا کے جملہ کو دوبارہ دہرایا گیا۔ اور اس قوم کو بار بار توجہ دلائی گئی۔ کہ وہ ہٹ دھرمی، غصہ اور عناد کو ترک کر کے حق کو قبول کر لیں۔ مگر یہ لوگ اپنے باطل حقانہ پر اڑے ہوئے ہیں اور پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی آخر کتاب قرآن پاک کا انکار کرتے ہوئے ہیں۔

قیامت کے متعلق بنی اسرائیل کا نظریہ درست نہیں ہے۔ شفاعت کے متعلق انہوں نے غلط عقیدے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ یہاں سے لیکر آگے روز تک حضور علیہ السلام کی نبوت، آپ کی صداقت اور حقانیت کا ذکر ہے۔ آپ کی معرفت نازل ہونے والی کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملتِ حنیفیہ کے پہلے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی ملت کے آخری امام ہیں۔ اور پھر اسی ضمن میں مرکزِ ہدایت مکہ معظمہ، اس کی تاسیس اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔ یہ ساری باتیں آگے آرہی ہیں۔

یہاں سے لے کر لَئِيسَ الْبَدَا نَ تَوَلَّوْا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ تک ملتِ ابراہیمی کا تذکرہ آئے گا۔ درمیان میں ضمناً اور بھی بہت سے مسائل آئیں گے۔ لیکن خیالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کسی ہزار سال پہلے دعا کی تھی: رَبَّنَا وَبَعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ لَئِيسَ الْبَدَا نَ تَوَلَّوْا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ۔ ان میں رسول بھیج۔ چنانچہ آپ کی نبوت کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پیدا ہونے والے دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی آئے گا۔

امتحان کی غرض
و غایت

یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں اُن امتحانات کا بیان ہے۔ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جہد الانبیاء علیہم السلام کو آزمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِذَا بَسَلْنَا لِابْنِهِمْ رَبُّهُ بِكَلِمَةٍ فَاقْتَصَرْنَا اِلَيْهِ اِنَّ رِجْلَيْهِ لَشَدِيدَتَا۔ اور اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے بعض باتوں میں آزمایا۔ اِذَا بَسَلْنَا لَئِيسَ الْبَدَا نَ تَوَلَّوْا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ بَسَلْنَا لَهُمْ بِكَلِمَةٍ فَاقْتَصَرْنَا اِلَيْهِ اِنَّ رِجْلَيْهِ لَشَدِيدَتَا۔ ہم نے اچھائی اور برائی کے ساتھ لوگوں کا امتحان کیا۔ تاکہ بات کھل کر سامنے آجائے۔ حدیث شریف میں حضرت عمرؓ کا قول ہے۔ بَلِّغْنَا بِالْاَسْرَاءِ فَصَبَرْنَا اَبْنَاءَ بَنِي اِسْرَءٰئِلَ اَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ اَمْتَحَانٌ۔

نمبر کیا۔ مگر جس وقت ہمیں راحتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہم صبر نہ کر سکے گویا ابتلی کا معنی آزمائش ہے۔
 یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آزمائش تو وہ ہے۔ جسے کسی کی اہمیت یا کارکردگی کا علم :
 ہو مگر اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی جانتا تھا کہ
 آپ کس حیثیت اور قدر و منزلت کے نبی ہوں گے۔ اور پھر جس قدر بھی آپ میں اوصاف پائے
 جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے۔ تو ان حالات میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کی آزمائش کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آزمائش کی غرض و غایت یہ بھی ہوتی ہے
 کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو
 تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیسے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا
 امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض
 غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں پر ظہر کرنا چاہتے تھے کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل
 منتخب کیا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ الغرض
 اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ وہ چاہے تو انبیاء علیہم السلام کا امتحان لے لے۔ اور نہ چاہے تو
 ایک گنہگار کو معاف کر دے۔ بہر حال یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں کا ذکر ہے۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے مقام اُرم میں پیدا ہوئے جو موجودہ بغداد سے ساٹھ ستر میل
 کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں بابل آشوریوں کی سلطنت اور بڑا امجدن ملک تھا۔ یہ شہر
 کھدائیوں کا پایہ تخت جمی رہا۔ مگر زمانے کی دست برد کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ اور تباہ و برباد ہو گیا
 اب اس کے کھنڈرات سے اس زمانے کی اشیاء حال نکال کر انہیں عجائب گھروں میں تبدیل
 کر دیے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کے کھنڈرات ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ٹیکسلا کے کھنڈرات ہیں۔
 اسی طرح کے بعض مقامات سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کے کھنڈرات سے پرانی تہذیبوں
 کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالوف بابل تھا۔ جس کے
 اب کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ مگر اپنے زمانے میں یہ بہت بڑا شہر اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کا وطن مالوف

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلمت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نے ہوش و حواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل عمر میں ہی رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ تَبَيَّنَ إِبْرَاهِيمَ عَلَى الْإِسْلَامِ لَمَّا كُنَّا فِي الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّهُ كَانَ كَافِرًا۔ قوم اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ خاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ پچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا۔ حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا إِلَٰهَتَكُمْ عِٰمِیۡنَ ہمارے معبودوں کو جو نقصان پہنچا یا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے بہت بڑی مقدار میں ایندھن جمع کیا گیا۔ اور پھر اسے ایک کھائی میں اچھی طرح جلا کر بھینق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا۔ ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے اترے انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی کوئی جبرع فزع نہیں کیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کو کوئی درخواست نہیں کی۔ بلکہ نہایت خند و شہابی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَرَادُوا بِہِ کَیۡدًا فَجَعَلْنٰہُمُ الْاٰخِسِرِیۡنَ وہ ایک دوا کھینا چاہتے تھے۔ کسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھڑکتی آگ سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ ہم نے ان بھائیوں کو ہی گھاٹے والا بنایا۔ یعنی ان سب کو مار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور آپ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہوئے۔ اسی کے تعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بعض باتوں میں آزما کر فاقمہم تو آپ ان آزمائشوں میں پورے اترے۔ یہ آپ کی پہلی بڑی آزمائش تھی۔

دوسری آزمائش
وطن سے ہجرت

اتنی بڑی آزمائش دیکھنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپ پر ایمان نہ لائی۔ بلکہ آپ کو ایک دوسرے امتحان سے گذرنا پڑا۔ آپ کا نام اذان ایک یونی حضرت سارہ اور خدیجہ حضرت لوط علیہ السلام پر مشتمل تھا۔ لوط علیہ السلام ہمچنین ہی سے آپ کی تحویل میں تھے۔ اور آپ پر یقین بھی رکھتے تھے۔ اتنی بڑی تمدن عظمت میں کوئی دوسرا شخص ایمان نہیں لایا۔ اگرچہ قوم پہلے منصوبے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن تھے۔ اور آپ کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا۔ یہ آپ کی دوسری آزمائش تھی۔ ہجرت کرنا معنی وطن اور گھر بار چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ تو نبی اس کی تعمیل میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ بلکہ نبی کے ساتھ اگر اہل ایمان کو بھی ہجرت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کھٹن گھاٹی کو عبور کر لیتے ہیں۔ ہمارے نبی آخر الزمان علیہ السلام اور صحابہ کرام کی ہجرت ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے قرآن و التَّائِبُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الدُّنْيَا أُولَٰئِكَ هُمُ السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّشْرَبَاتٍ وَيُفَجَّرُونَ فِيهَا نَهَارًا

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم پر بیک کتے ہوئے ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور فرمایا اِنِّیْ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ آپ نے یونی اور خدیجہ کے ہمراہ بابل اور عراق کو چھوڑا۔ آپ کو مصر کے راستے سے شام اور فلسطین پہنچنے کا حکم تھا۔ راستے میں شرق اردن کے علاقے میں بحر میت آتا ہے۔ اس کے کنارے پر بنے متھن لوگ آباد تھے۔ انہوں نے حلی درت کا نظریہ حکومت قائم کر رکھا تھا۔ اس مقصد پر حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تم یہیں قیام کرو۔ اور ان لوگوں کو دین حق کی دعوت دو۔ چنانچہ آپ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے یونی بچے کے ہمراہ آگے شام اور فلسطین اور پھر نہر تک چلے گئے۔ منہ میں آپ کو ایک اور آزمائش

سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہاں کے ظالم حاکم نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کو قبضہ میں کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور اس جابر حاکم سے نجات دلائی۔

تیسری آزمائش
بیوی بچے سے
جہانی

مصر کے حاکم نے حضرت سارہؓ کو ایک لونڈی دی تھی۔ اگرچہ وہ لونڈی نہیں تھی مگر اس وقت وہ لونڈی کی حیثیت میں تھی۔ حضرت سارہؓ نے باجروہ لونڈی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی۔ اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ شام و فلسطین کے قیام کے دوران حضرت ہاجرہؓ سے بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام امی اسماعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی شہ خوار کی عمر میں تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ کہ اے ابراہیم! اس بچے اور اس کی ماں کو عرب کے دور دراز بیابان وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے حکم کی تعمیل میں بیوی اور بچے کو بھرا لیا۔ اور موجودہ مکہ مکرمہ والے مقام پر پہنچے۔ جو کہ اس وقت بے آب و گیاہ وادی تھی۔ اس مختصر قافلے کے ساتھ کوئی سہان بھی نہیں تھا۔ ایک مشکیزے میں تھوڑا سا پانی اور کچھ کھجوریں تھیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لٹختہ چکر اور بیوی کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ یہ سارے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی جاتے اور اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیابان وادی میں زمزم جیسے بہترین پانی کا انتظام فرمادیا۔ پھر وہاں بوجہ ہم قید کے لوگ آباد ہو گئے۔ اور اس طرح وہ دیران اور غیر آباد جگہ بستی میں تبدیل ہو گئی۔

چوتھی آزمائش
بیٹے کی قربانی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور بڑی آزمائش آئی۔ جب حضرت اسماعیلؑ بارہ تیرہ سال کے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا۔ کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آئی ہے۔ آپ کو بار بار خواب آیا۔ آخر آپ نے اس کا ذکر بچے سے کیا۔ بچہ بڑا صابر تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر دیں۔ چنانچہ آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی گردن پر پھری چلا دی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ اس نے قربانی بھی قبول کر لی اور بچہ بھی صحیح سلامت نکلا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان، مال، اولاد ہر طریقے سے آزمایا۔ اھ! آپ اس آزمائش میں پستے اترے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ثابت قدمی پر جو انعامات عطا کیے۔ ان کا ذکر بھی قرآن پاک میں آتا ہے۔

امام القرآن کے نام سے بہت سے بزرگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حلال و حرام سے متعلق قرآنی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر امام ابو جبر جصاصؒ نے کی ہے۔ یہ حنفی امام ہیں ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ ان کے بعد پنجویں صدی میں امام ابو جبر بن العربیؒ ہوئے ہیں آپ کا تعلق ہمدانی مسلک سے ہے۔ اور آپ کا وطن ہمدان تھا۔ آپ بھی بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ حضرت امام شافعیؒ کی احکام القرآن موجود ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کتاب نہیں لکھی۔ مگر امام بیہقیؒ نے ان کی کتابوں سے متعلقہ تفسیری آیات کو منتخب کر کے علیحدہ کتابی صورت دی ہے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور امام ہیں۔ کشف اور سلوک کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ ساتویں صدی میں ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے حلال و حرام کے مسائل کی بجائے تصوف پر زیادہ مسائل جمع کیے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو بھی احکام القرآن تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے بعض شاگردوں اور مریدوں کو اس کام کی تکمیل کے لیے کہا۔ چنانچہ احکام القرآن کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اور دوسرا مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف کیا اور ایک حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ابھی بقایا ہیں۔ جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

الغرض امام ابو جبر بن العربیؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے: ﴿سورة نجم کی آیت وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ کا یہی مطلب ہے کیا تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی۔ جنہوں نے پورا پورا کر دکھایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آیا۔ انہوں نے پورا کیا۔ اور اس طرح ہر آزمائش پر پورے اترے۔ آپ نے اپنا سارا مال مہمانوں اور محتاجوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ اکیلے کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب تک کوئی دھان نہ شامل ہو جاتا۔ آپ نے اپنے آپ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی ذرا پس و پیش نہ کیا۔ اپنے قلب کو ہمیشہ دھان کے سامنے رکھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا اور آپ ہر مستحق میں کامیاب ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
امام ان سید

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ مبارک ہستی ہیں۔ کہ جب ان اٹھانوں میں کامیاب ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر انعام مرحمت فرمایا۔ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں تم میں لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانے والا ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جسکی اقوال و افعال میں اقتداء کی جائے۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے امام ہوتے ہیں وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰمَةً يُحَدِّثُوْنَ بِاٰمُرِنَا مجاہدائے حکم سے امت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کا ذکر خیر ہو رہا ہے، وہ ترقی حقیقیہ کے بہت بڑے امام ہیں۔ آپ کا لقب ابوالانبیاء ہے۔

آپ تمام بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے باپ اور جد امجد ہیں۔ الغرض تمام آئمہ نشینوں میں سے گنتی کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجدد دنیا کے لئے ابراہیم! میں تجھے لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانا ہوں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہمیت کا انعام پایا۔ تو فوراً درخواست پیش کر دی۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ عَرَضَ لِيْ اِذَا كُنْتُ اِلٰهًا لِّكُلِّ شَيْءٍ مُّشْفَعًا

ظالم محروم ہے

اہمیت سے نوازا ہے۔ کیا یہ سلسلہ میری اولاد میں بھی جاری رہے گا۔ کیا میری اولاد بھی اس عمدہ جلیلہ پر فائز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ منصب اہمیت صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ قَالَ لَا يَنْفَعُكَ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ اِنْ هُمْ لَا يَرْجُوْنَ وَعْدَهُ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ظالم اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے منصب اہمیت عطا کیا جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے حصے میں آتا ہے۔ اور یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو چیز عطا ہوئی۔ وہ نبوت ہے۔ فقہار۔ محدثین۔ محکمین وغیرہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے آنکھ نہ پکھنے کے وقت کی مقررہ بھی کفر یا شرک کیا ہو تو وہ عمدہ نبوت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قدر پاک رکھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں۔ ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے۔ اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں۔ کوئی بھی ظالم ہستی والی کے لائق نہیں ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاَتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُمَسِّكًا وَاَعٰهَدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْقٰیْمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵
وَإِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَاَرْزُقْ اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمِیْعُهُ قَلِیْلٌ ثُمَّ اَضْرَبْنَا اِلٰی عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۱۲۶

تس جہرہ د اور اس بات کو دسیان میں لاؤ۔ جب کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے رجوع اور امن کی جگہ بنایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑا ہونے کی جگہ کو مصلیٰ یعنی نماز کی جگہ بنا لیا۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو ۝۱۲۵ اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ جو کوئی ان میں سے ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اور جس شخص نے کفر یا میں اُسے سخت دوزخ کا۔ اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بُری جگہ ہے ۝۱۲۶

گزشتہ
سے
پیوستہ
بنی اسرائیل کی خبروں کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر اس سلسلہ کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اگلی آیات میں اس دعا کا

کیا ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔ **اَلْاِسْلَامُ كَيْفَ فَرَمَا كَانَ قَبْلَهُ لَدُنَّ**
 لانے کے بعد مومن کے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام صحیح بہ کرامت۔ اسلام
 کی دولت سے مالا مال ہو کر سابقہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے۔ لہذا اس کے باوجود ان
 پر کفر و شرک کا الزام لگانا قبیح حرکت ہے۔ اور مذکورہ آیت کریمہ سے غلط استدلال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کا تذکرہ بیان
 فرمایا۔ **وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمِّنًا** اس بات کو خیال میں رکھو جب
 ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے مٹا ہوا اور امن والا بنایا۔ بیت اللہ سے مراد خانہ کعبہ
 ہے۔ اور مٹا ہونے کے دو معنی آتے ہیں۔ پہلا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہاں بد بار
 آتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق و شوق انیس دنیا کے کونے کونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و عبادت
 کے لیے کھینچ کھینچ کر لاتا ہے۔ وہاں پر ایک مرتبہ پہنچ جانے والا سیراب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا
 ذوق و شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح وہ پھر وہیں پہنچ جائے۔
 مٹا ہونے کا یہی معنی ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم بھی یہی دی گئی ہے کہ حاجی طوافِ دراع کے وقت
 یہ دعا مانگے۔ اے اللہ! یہ میرا آخری غم نہ ہو بلکہ مجھے پھر بھی موقع دے کہ میں تیرے گھر کی زیارت
 کروں۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو **هُدًى لِّلْعَالَمِينَ** یعنی دنیا بھر کے لیے ہدایت
 کا مرکز بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مٹا ہونے کا دوسرا معنی ثواب کی جگہ ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقدس مقام پر جس قدر
 ثواب حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ پر نہیں ملتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور نبی کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے۔ مسجدِ تمام یعنی حرم شریف میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری
 جگہ پر ایک لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص بیت المقدس یا مسجد نبوی میں ایک
 نماز ادا کرتا ہے۔ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب پاتا ہے۔ بہر حال یہاں پر مٹا ہونے کے دونوں
 معنی ہیں یعنی مرکزِ ہدایت اور ثواب کی جگہ۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جس نے بیت اللہ شریف کو امن والی جگہ بنایا۔ ظاہر ہے۔ جو شخص ایسا نہ کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے آخرت کے عذاب سے امن مل جاتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی جو کوئی احرام کی حالت میں وہاں جاتا ہے۔ اس کو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا

ہم اے اہم البوصیغہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی مجرم حرم میں داخل ہو جائے۔ تو اس کے خلاف تعزیری کارروائی حرم میں بھی جائز ہے۔ اُسے حرم سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پھر مد جاری کر دی جائے گی۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی قاتل جیسا بڑا مجرم بھی حرم میں داخل ہو جائے تو اُسے وہاں کچھ نہ کہو ہاں اس کا دانا پانی بند کر دو۔ جب مجبور ہو کر خود ہی مدود حرم سے باہر آئے تو اس پر مد جاری کر دی جائے۔ گویا یہ مقام ظاہری طور پر بھی گموارۃ امن ہے۔

مقام ابراہیم

بیت اللہ شریف کے ضمن میں مقام ابراہیم کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُمَلِّئًا اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو — نماز کی جگہ بناؤ۔ مقام ابراہیم سے مراد کوئی کمرہ نہیں ہے۔ جہاں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ پختہ رہت جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ آپ کے پاؤں مبارک کے نشانات اس پتھر پر اب بھی موجود ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا: وَادْخُلْ فِي السَّابِقِ بِالْحَجِّ۔ اے ابراہیم! لوگوں میں اعلان کر دو کہ اللہ تعالیٰ کا کھڑ تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کاج کرنے کے لیے آؤ۔ تفسیر مدارک میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ پروردگار! میری آواز کون سنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: امتنا کام اعلان کرنا ہے۔ میں اس آواز کو تمام نسل انبی کی پشتوں پہ پہنچی دوں گا۔ جن کی قسمت میں بیت اللہ کاج مقدر ہے۔ ان تک آپ کی آواز پہنچے گی۔ بہر حال مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس کے متعلق فرمایا کہ اس کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔

سنت عمرؓ کی فضیلت کے باب میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپؐ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمیشہ یہاں پر نماز پڑھنے کا حکم ہو۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی: **وَتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ رَبِّكُمْ مَوْكِنًا**۔

مقام ابراہیمؑ تقریباً چودہ انچ مربع چھوٹا سا پتھر ہے۔ حور بہت اللہ شریف کے قریب ہی تعمیر کعبہ کے وقت سے پڑا ہے۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر کو فضلی بنا کر اس کے اوپر تو نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ تاہم اس سے مراد یہ ہے کہ پتھر کے قرب و جوار میں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والا طواف کے سات چکر پلے کرنے کے بعد دو رکعت مقام ابراہیمؑ کے قریب ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بالکل قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے کہیں بی دو رکعت واجب الطواف ادا کر لیے جاتے ہیں۔

اہم عظیم البوصیضہ کے نزدیک عواف کے دو رکعت واجب ہیں۔ جب کہ دوسرے کمرہ کرام اُسے سنت کہتے ہیں۔ بہر حال اس مقام پر نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت ہے۔ پہلے یہ پتھر ایک چوڑے پر رکھی جاتی تھی۔

مگر موجودہ حکومت نے مقام ابراہیمؑ کے چوڑے اور زمزم کے چوڑے کو بٹا دیا ہے۔ اور اب مقام ابراہیمؑ شیشے کے ایک غوبہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے اوپر پستل کی خوبصورت جاں لگا دی گئی ہے۔ اور اس طرح بتہ کی دہری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے ایک خول نقصان پہنچے تو کم از کم وہاں وقت نہ ہے۔ حکومت سعودیہ نے لاکھوں ریال کے خرچ سے حفاظت کا یہ انتظام کیا ہے۔ اب مقام ابراہیمؑ دور سے تو نظر نہیں آتا۔ مگر جالی کے قریب کھڑے ہو کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ اس پر حضرت

ابراہیمؑ علیہ السلام پاؤں کے نشان موجود ہیں۔ یہ پورا دس پانچ باب نعمت سے محو ہے فاصلے پر مطاف میں رکھا ہوا۔ عام ایام میں تو طوافین مقام ابراہیمؑ اور بیت اللہ شریف کے درمیان ہی چلتے ہیں مگر ایام حج میں جوں جوں ریش بڑھتا ہے۔ ہر ابراہیمؑ طواف کرنے والوں کے درمیان میں آجاتا

ہے۔ اور لوگ اس کے دونوں طرف سے گزرتے بہتے ہیں

بیت شریف
کی صفائی

مقام ابراہیم کے تذکرے کے بعد پھر بیت اللہ شریف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَهْدْنَا إِلَىٰ ابْنِهِمْ وَاسْمَاعِيلَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ لَكُمْ مِصْبَا اَنْ طَهَّرَا بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ مِثْرَةَ كَهْرُكَ پاك صاف رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے وَالْعَافِينَ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے وَالتَّكْوِيعَ التَّجْوِيعَ اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ پاک و صاف رکھنا دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ یعنی ظاہری پاکیزگی اور باطنی پاکیزگی۔ چونکہ حج و عمرہ کے لیے دو روزہ روزے لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کی سہولت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ظاہری صفائی کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک کو ہر قسم کی غفلت بدبود وغیرہ سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ لوگ وہاں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ وہاں اعتکاف بیٹھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور دیگر وظائف میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم دونوں باپ بیٹا میرے مہازوں کی خاطر اس گھر کو ہمیشہ پاک صاف رکھو۔ جس طرح بیت اللہ شریف کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح عام مساجد کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ سورۃ نوح میں ارشاد ہے: فِي بُيُوتٍ اِذْنُ اللّٰهِ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ اَنْ تَحْمَدُوْا مِنْ حَمْدِ اللّٰهِ تَعَالٰی صَنِعَهُ رَكْنٌ كَامِلٌ دیا ہے۔ اور وہاں اس کا نام ذکر کرنے کو کہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے۔ قَطِّفُوْا اگر تم نے گھر میں بھی کوئی جگہ نماز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ تو اس کو بھی پاک صاف رکھو۔ ظاہر طور پر وہاں کوئی کوڑا کاٹا یا گندگی نہیں رہنی چاہیے۔

مساجد کی صفائی

مساجد کی باطنی صفائی کا مطلب یہ ہے کہ وہاں پر کوئی مشرکانہ حرکت نہ کی جائے اور نہ ہی وہاں پر نیروی باتیں کی جائیں۔ جس طرح بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح عقل اور دل کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اگر دل کے کسی کونے میں شرک و نفاق کا کوئی شائبہ بھی ہو گا تو پورے کا پورا انسان ناپاک ہو گا۔ اسی لیے ارشادِ ربانی ہے: اِنَّكُمْ الْمُشْرِكُوْنَ كُنُوْا

یعنی مشرکین پیہ میں ان کے دلوں پر شرک کی نجاست پڑی ہوئی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دل و دماغ اکثر شرک و بدعت و دیگر خرافات سے پاں و درختہ توجیہ پر صحیح طریقے سے ایمان ہو۔
حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ملت کو پائین ہی ضروری ہے۔ ہماری ملت میں اکثر شرک و بدعت کی جو کھنڈی سرایت کر چکی ہے۔ اس سے صحیح پھڑانا ہی ضروری ہے۔ گندے عھدہ نے پوری ملت کو ناپاک کر رکھا ہے۔ لہذا انفرادی طہارت کے ساتھ ساتھ اجتماعی پاکیزگی کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی خصوصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ صحیح احادیث میں آیت ہے کہ آپ سے پہلے شخص اول من اختلفتہ میں جنہوں نے غلط کیا۔ تفسیری روایتوں میں یہ بھی آیت ہے کہ ابراہیم علیہم السلام بخون پیدا ہوئے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے نہیں ہوئے۔ انہیں اسی سال کی عمر میں غصہ کا حکم ہوا۔ چنانچہ تادم کے مقام پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے سنتِ تطہیر ادا کی۔ اب حتم یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اُسے چاہیئے کہ یہ سنت ادا کرے، خواہ عمر کے کسی حصے میں ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جن کی دماغی میں سفید بال نکلنے شروع ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا سب کی دماغی سیاہی ہی۔ مگر آتی تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں داخل ہوئے۔ تو سفیدی دیکھ کر عرض کیا۔ مولا کریم! یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ آپ نے پھر عرض کیا۔ اے اللہ! زدنی وقاراً میری اس عزت کو ور بڑھاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اللہ کریم کی وحی آئی کہ اے ابراہیم! انت اکرم اھل الارض الی آپ میرے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں سے برگزیدہ ہیں۔ جب آپ نماز ادا کرتے وقت حالت سجدہ میں ہوتے ہیں تو آپ کا سر نہیں کھنکھاتا چاہیے۔ چنانچہ سب سے

۱۔ اللہ الرحمن فی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۶۵ ۲۔ تفسیر عزیزی ص ۲۲۹ پ

۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۲۹ ۴۔ تفسیر عزیزی ہندی ص ۲۲۹ ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۲۹ پ

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پا بار پنا۔ اگرچہ تہ بند پنا بھی درست ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پا جا رہی پنا کر دو۔ اور تہ بند بھی بانڈھا کر دو۔ یہود تہ بند نہ بانڈھتے تھے۔ آپ نے دونوں چیزوں کی بابت فرمائی۔ آپ نے پا جائے کی تعریف فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں ملا۔ تاہم پا جا رہ خیرہ نے کا ذکر آتا ہے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے: کہ منبر پر کھڑے ہو کر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خطبہ دیا۔ اور دُھیمی کی روایت میں ہے کہ مہمانوں کی خاطر سب سے پہلے آپ نے نان شیر مال تیار کیا۔ یہ کھانا دودھ اور نان کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ بمائے ہاں برصغیر میں حیدر آباد دکن اور کھنڈر والے بڑے شوق سے تیار کرتے ہیں۔ اور مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ بڑی لذیذ چیز ہے اسی طرح معافقے کا طریقہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا تو آپ اس سے گلے ملتے۔

معافقے کا
پس منظر

کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام جانوروں کی چراگاہ کی تلاش میں کسی پہاڑ کے اندر تک چلے گئے۔ انہوں نے ایک مقام پر نہایت غناک آواز سنی۔ کوئی شخص نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ اُدھر متوجہ ہوئے۔ تو دیکھا کہ ایک ضعیف عمر شخص اپنے حال میں محو ہے۔ آپ نے اس بڑے شخص سے دریافت کیا کہ تم کس کو یاد کر رہے ہو۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ کو۔ آپ نے پوچھا تمہارا اللہ کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا آسمان پر ہے۔ فرمایا زمین پر بھی وہی خدا ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارا قبلہ کدھر ہے۔ تو بڑھے نے بیت اللہ شریف کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پوچھا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا نیچے اسی غار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھے کا ٹھکانا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو بڑھے نے کہا کہ وہاں جانا محال ہے۔ کیونکہ راستے میں گہری ندی پڑتی ہے۔ جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تم کیسے پہنچ جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا خرق عادت

کے طور پر چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک کرامت ہے۔ جس کی وجہ میں خشک پاؤں مذی کو عبور کر لیتا ہوں
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جو ہم بھی اسی طریقے سے چلتے ہیں۔ جو خدا تمہارے لیے پانی کو مسخر
 کرتا ہے۔ وہ میرے لیے بھی کرے گا۔ چنانچہ دونوں پل بیٹے۔ غار میں اترے تو آگے مذی تھی۔
 اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُسے عبور کر لیا۔ اور آپ کے پاؤں تک نہیں بھیگے۔ پانی کے نیچے آپ
 اُس شخص کے عبادت خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس کی نشاندہی کے عبادت خانے کا رخ واقعی بیت اللہ
 شریف کی طرف تھا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہ خدا پرست انسان ہے۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے بزرگ ریا و کر سب سے خوفناک دن کون سا ہے۔
 تو اس نے جواب دیا کہ جس دن اللہ تعالیٰ کرسی عدالت پر بیٹھے گا۔ اور بنی اور اللہ تعالیٰ کے
 سب سے قریب لڑ رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم
 دونوں کو اس دن کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ بڑھا کہنے لگا۔ کہ مجھے دعا کرتے ہوئے تین
 سال ہو گئے ہیں مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہاری
 دعا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس پہاڑ میں گیا۔ تو مجھے ایک نوجوان ملا جس کے بال بکھرے ہوئے
 تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے
 دوست ابراہیم علیہ السلام کے جانوروں کے لیے چراغ تلاش کر رہا ہوں۔ بڑھا کہتا ہے کہ اس
 دن سے میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اے مولا کریم! اگر دنیا میں تیرا کوئی خلیل ابراہیم علیہ السلام
 بھی ہے۔ تو مجھے اس کی زیارت نصیب فرما۔ مگر آج تک میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حضرت
 ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا بڑے میاں! اللہ تعالیٰ نے تیری دعا قبول فرمالی ہے اٹھو اور میرے
 ساتھ معافہ کرو۔ چنانچہ معافے کا طریقہ وہاں سے جاری ہوا۔

حج کی فضیلت

بیت اللہ شریف کی تعمیر کا تذکرہ آگے آئے گا۔ پہلے کعبۃ اللہ اور حج کی فضیلت کے متعلق
 کچھ بیان ہوگا۔ صحیح احادیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ
 کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل میں حج کیا۔ تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے۔ گویا کہ

وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ بیت اللہ شریف پر ہر روز ایک مہینے میں رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں پر، چالیس دیگر عبادت کرنے والوں پر اور بیس اُن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ جو بیت اللہ شریف کی طرف دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **النَّظَرُ إِلَى الْكُفَّةِ عِبَادَةٌ** یعنی بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ البتہ طواف کے دوران کعبہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ طواف سے فاصلہ ہو کر نہایت ذوق و شوق اور محبت سے بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا چاہیے۔ صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ حجر اسود جنت کے یا قوتوں میں سے ایک یا قوت ہے۔ یہ پتھر بہشت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو سورج کی طرح یہ مشرق و مغرب کو روشن کرتا۔

طواف کا
مہر و ثواب

تاریخ از رقی میں آتا ہے کہ طواف کی نیت سے گھر سے چلنے والا شخص ایسا ہے۔ جیسے کہ وہ دیائے رحمت میں چنا شروع کر دیتا ہے۔ جب مطاف میں پہنچتا ہے۔ تو گویا رحمت کے دریا میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جب طواف شروع کرتا ہے۔ تو ہر قدم اٹھانے کے عوض اُسے پانچ سو نیکیاں مل جاتی ہیں۔ اور جب قدم نیچے رکھتا ہے۔ تو ہر قدم کے بدلے پانچ سو گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ شخص طواف سے فارغ ہو کر مقام ابابیم تک آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے کہتے ہیں کہ اے بندے! تیرے سابقہ گناہ تو دھل گئے۔ اب آئندہ زندگی میں محتاط رہو۔ اعمال صالحہ انجام دیتے رہو۔ اس نئے سرے سے اچھی زندگی کا آغاز کرو۔

حرم پاک

حرم پاک کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمت والا خطہ بنایا ہے۔ کسی کے لیے اس میں لڑائی کرنا حلال نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن تھوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حرم میں لڑائی حلال ہوئی تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرم شریف میں لڑائی قطعاً حرام ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ محترم ہے اور امن والا شہر ہے۔ چنانچہ یہاں پر

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
 جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا اے مولا کریم! اس شہر
 کو امن والا بنائے۔ دوسرے مقام پر هَذَا الْبَلَدَ کا لفظ آتا ہے۔ گویا یہ ابھی کھلی جگہ ہے
 شہر آباد نہیں ہوا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی سرمت کی دعا کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی
 روایت میں آتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے در ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف دالی زمین کو
 اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے فرشتے عبادت کرتے تھے۔ وہاں پر ایک
 پردہ ساٹھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو پوری دنیا کا مرکز قرار دیا۔ اور پھر اسی جگہ سے تمام زمین
 کو پیدا کیا۔ گویا یہ مقام ساری زمین کا وسط (وسط البلاد) ہے۔ یہ بخور می نے اپنی شرح شامل میں
 لکھا ہے۔ جس شخص کو بخیر مٹتی ہو۔ اس کی پیشانی پر کچھ دیا جائے الْعُكَّةُ وَسُطُ الْبَلَدِ وَاللَّهُ
رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ تو اس کی عمر بند ہو جائے گی۔

فرمایا اے اللہ اس شہر کو امن کا گہوارہ بنائے۔ وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ اے اللہ اس
 کے بننے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ جو
 کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے کفر کیا فَأَمْتَعْنَاهُ
فَلْيُدَّاهُ اے تمھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا۔ ثُمَّ أَصْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ پھر اے کشاں
 کشاں دوزخ کی طرف بھاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے يُحْزَنُ
 فائدہ سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو ممکن ہے کہ کافر بھی آدم سے رہیں۔ لیکن اس کے
 بعد انہیں بہر حال دوزخ میں جانا ہوگا۔ مگر اہل ایمان کو دونوں چیزیں حاصل ہوں گی دنیا میں امن بھی
 نصیب ہوگا۔ اور آخرت میں نجات بھی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا
 کو قبول فرمایا۔ چنانچہ عرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا

الْعَمَّ

درس پنجاہم

البقرة ۲

(آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)

وَذَرَفْعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَلِسْمَعِيْلُ رَبَّنَا
 تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
 لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
 عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) بیت اللہ
 شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کہتے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے
 قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنائے ہم
 دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے۔ اور بنائے ہماری اولاد میں سے بھی ایک
 اپنی فرمانبرداری امت۔ اور بتلا ہم کو ہمارے احکام۔ اور ہمارے اوپر رجوع فرما مہربانی کے
 ساتھ۔ بے شک تو ہی رجوع فرمانے والا اور از حد مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

رہنمائی

اس آیت کا تعلق سابقہ درس کی آیت مبارکہ وَلَذُجْعَلْنَا الْبَيْتَ مَشَابَهُ لِّلنَّاسِ
 کے ساتھ ہے۔ وہاں پر تھا کہ اُس بات کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے
 رجوع کی جگہ، مرکزِ ہدایت اور جائے امن بنایا۔ اس کے ساتھ مقام ابراہیم کا ذکر ہوا۔ بیت اللہ شریف
 کو پاک و صاف رکھنے کا حکم ہوا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی تھا۔ جس میں اہلین
 شہر مکہ کے یہ پھلوں کی روزی طلب کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا
 جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

تاریخ کعبہ

آیت زیر درس میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کے فضائل میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی تعمیر آپ کے ہاتھوں سے
 کرائی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَذُيَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
 وَلِسْمَعِيْلُ وَدَكْسَنِي مَبَارَكٌ مَّحْمُودٌ وَابْرٰهٖمُ وَاسْمٰعِيْلُ عَلٰیہِمَا السَّلَامُ یعنی باپ بیٹا اپنے

مبارک ہاتھوں سے بیت شریف کی بنیادیں اٹھائے تھے۔ بعض دوسری احادیث میں آتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی... ابتدائی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اولین گھر کی تعمیر کا ذکر آیت ہاں اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وَّضَعْنَا لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا مِّنْ اَيَّامٍ اِسْمِ اللّٰهِ میں لفظ بکۃ استعمال ہوا ہے۔ مگر بکۃ اور مکہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ تورات میں بکۃ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اے اُمّ القریٰ بھی کہتے ہیں۔ گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا حضور! اس کے بعد کون سا گھر تعمیر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ بیت المقدس۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔ یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تربست زیادہ فرق ہے۔ پھر دونوں گھروں کی تعمیر میں صرف چالیس سال کے وقفہ کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تعمیر سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام والی تعمیرات مراد نہیں بلکہ ان دونوں گھروں کی اولین تعمیرات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے بعد حضرت نون علیہ السلام کے زمانے کا طوفان آیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سیلاب آئے۔ جن میں بیت اللہ شریف کی عمارت بہ گئی۔ اور وہاں پر صرف ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا۔ عمارت منہدم ہو گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔

قرآن پاک کے لفظ قَوَاعِد سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ اس عمارت کی اولین تعمیر نہیں تھی۔ بلکہ یہ عمارت اپنی اصل بنیادوں پر دوبارہ اٹھانی جا رہی تھی۔ چونکہ اس وقت عمارت کے کوئی نشانات باقی نہ تھے۔ صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا۔ کہ عمارت کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے اس اصل بُد پر سایہ کر کے اس کا تعین کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجھ گئے کہ بیت اللہ شریف کا اصل مقام یہ ہے چنانچہ

آپ نے اسی جگہ پر دوبارہ تعمیر شروع کی۔ اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک چودہ سال کی تھی۔

خبر گیری کیلئے
حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی آمد و رفت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہؑ شام و فلسطین میں تھے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام حجاز میں تھے۔ آپ ایک سال دو سال میں ایک مرتبہ آکر بیوی بچے کی خبروں کرتے۔ تاہم آپ کی بیوی سارہؑ کی یہ شرط تھی کہ آپ بیوی بچے کی خبر گیری کے لیے قیس وقت کے لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے پاس رات کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہو گیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قبیلہ بنو جہم میں نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ کہیں شکار کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ آپ نے گزران اوقات کے بارہ میں پوچھا تو اس عورت نے کہا کہ ذریعہ حاش کوئی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے گزر اوقات ہو رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لیے فاقے آتے ہیں۔ یہ شکایت سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ پیغام بھی دینا کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار سے واپس آئے تو انہیں باپ کی آمد کی خبر و بکت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیوی کے بتانے سے پہلے خود ہی پوچھ لیا کہ میرے بعد کون آیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا۔ اُس نے مال احوال پوچھا تو میں نے سب احوال بتا دیے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پھر دریافت کیا کہ وہ کوئی پیغام بھی دے گئے ہیں۔ تو بیوی نے کہا کہ ہاں۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ بیوی کو الگ کر دیا۔ اور بتایا کہ اب میں تمہیں گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے در سرانجام کیا۔ کئی سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

دوبارہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پھر گھر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کی بیوی موجود تھی۔ آپ نے اُس سے گھر کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گھر کے حالات بہت اچھے ہیں۔ میرا خاندان بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ نیک سیرت اور عبادت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میں رزق بھی دیا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار بھی کرتے ہیں گزراوقات بھی بڑی اچھی جو رہی ہے۔ اس عورت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سواری سے اترنے کی درخواست کی تاکہ آپ کی خاطر تواضع کر سکے۔ مگر آپ نے کہا کہ میں نے گھر نہیں ہے ہاں جب تمہارا خاندان آئے۔ تو اُسے میرا یہ پیغام دینا کہ تمہارے مکان کی چوکھٹ بہت اچھی ہے اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر واپس آئے۔ تو بیوی نے پیغام دیا۔ آپ نے فرمایا وہ میرے باپ تھے۔ اور یہ پیغام دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔

یہ واقعہ بھی تفسیری روایتوں میں موجود ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیسری مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی بیوی حضرت سارہ سے طے کر لیا کہ اس دفعہ میں کچھ عورتوں کے ساتھ نہ جاؤں گا۔ چنانچہ یہ ان ایام کا ذکر ہے کہ آپ کریمت اللہ شریف کی تعمیر کا کام ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کے ایک ٹکڑے کو ہموار کیا۔ اور اس طرح باپ بیٹے نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر گھر بنایا جو کہ دیواریں چنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کے لیے گارا اور پتھر لاتے رہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد جب یہ عمارت طوفانی نوح کی نذر ہو گئی تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت ذی قعدہ میں شروع ہو کر ذی الحجہ میں تقریباً ایک ماہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر مذکور کے بعد دوبارہ تعمیر قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوئی جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ مبارک

تعمیر کے مختلف
ادوار

میں بیت اللہ شریف کی عمارت پھر بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ قریش مکہ نے چندہ جمع کر کے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینیس برس تھی۔ گویا یہ تعمیر آپ کی بعثت کے پانچ برس قبل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ رداسا مکہ نے طے کر لیا تھا کہ اس مقدس تعمیر میں ناپاک ڈال ستمال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ پاک و صاف اور حلال مال سے جو چندہ جمع ہوا وہ پورنی عمارت کی تعمیر کے لیے کافی تھا۔ لہذا عظیم والاسات ہاتھ کا حصہ چھوڑ کر باقی عمارت پر بیت اللہ تعمیر کر دیا گیا۔ اسی موقع پر محمدؐ اسود کی تنسیب کا مجرہ اکھڑا ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ حضور عید السلام کے مبارک ہفتوں کے اس طرح کر دیا کہ سارے لوگ خوش ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ نبوت میں بیت اللہ شریف کی تجدید نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو سرمایہ کی کمی تھی۔ اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اس کو دوبارہ تعمیر کرتا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرز پر کرتا۔ اور اس وقت عمارت میں تغیر و تبدل کرنا مناسب نہیں تھا۔ یزید کی وفات کے بعد حجاز میں نو سال تک حکومت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس رہی، حجاز، مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ آپ ہی کے زیر نگرانی تھے۔ اُس زمانہ میں آپ نے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور آپ نے یہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پر قائم کی یعنی حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم پر عمارت کی تجدید کی اور حطیم کو پھر باہر نکال دیا۔

ہارون الرشید نے اپنے زمانے میں حطیم کو پھر شامل کر کے از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اہم مالک نے اُسے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ مقدس گھر آئندہ آنے والوں کے لیے کھلونا بن جائے گا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں کے عہد میں سلطان مراد خان کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تجدید ہوئی۔ یہ سترہ کا واقعہ ہے۔ موزودہ عمارت وہی ترکوں کی تعمیرِ رد ہے۔ اب تک بیت اللہ کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ موجودہ سعودی حکومت کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ کہ انہوں نے بھاری رقم خرچ کر کے یہ ایک کوہِ بیت وسیع کر دیا ہے۔ اور زائرین کے آرام و سہولت کے لیے بڑے

بڑے — منصوبوں پر کام کیا ہے۔

الغرض جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ نماز تھلکانہ انداز میں دُعا بھی کر رہے تھے۔ رَبَّنَا اقْبَلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ خدمت مقبول فرما لے إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ تو دعا کو مستجاب بھی ہے۔ اور ہمارے اخلص کو بھی جانتا ہے۔ لہذا ہمارے عمل کو قبول فرما لے۔

ظاہر ہے کہ قبولیت کے بغیر ہر عمل بیکار محض ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ ہمارا عمل قبول ہو جائے۔ ہر مومن کی بھی یہی مناجات ہوتی ہے کہ اس کی نیکی بارگاہِ رب العزت میں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میری دو رکعت نماز قبول ہوگئی ہے تو میں اس کے بارے میں دنیا و دنیا کی ہر چیز کو ہٹا دوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ بہت جلد ہے إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ متقین کے اعمال کو ہی قبول فرماتا ہے۔ نیکی اُسی کی مقبول ہوگی جس کا دل تقویٰ سے معمور ہے۔ اگر تقویٰ سے خالی ہے، دل میں کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری پھری ہوئی ہے تو کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوگا۔ قبولیت کا معیار خلوص اور تقویٰ ہے۔

اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اگرچہ چودہ سال کے نیک تھے مگر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کی دولت ابتداء کے زمانہ کی سے ہی ردییت کر دی تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باپ بڑا کے عمل کو شرف قبولیت بخشا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو کر رسول نبی بنے، اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ صاحب شریعت رسول ہوئے ہیں۔ تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متعدد بیویاں اور بارہ بیٹے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے خاندان پیدا کیے۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا نابت تھا۔ اور سب سے چھوٹا قیدار تھا۔ کہ

بعد بیت اللہ شریف کی تہ لیت آپ کے بڑے بیٹے نابت کو ہی ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں بڑے کو اتنی فضیلت بخشی۔

قبولیت دعا
کی شرائط

ترمذی شریف کی حدیث میں نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے ——— وَقَبْلُ صَلَاةٍ
بَعَثَ رُطُومًا بِمَعْنَى اللّٰہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کسی نماز کو قبول نہیں ———

فرماتے۔ گویا نماز کی قبولیت کے لیے طہارت بمنزلہ شرط کے ہے۔ پاکیزگی کے بغیر کتنی نمازیں پڑھو
قیام کرو۔ رکوع و سجود کرو، کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح دیگر نیکیوں کی شرط بھی ایمان اور اخلاص ہے۔
اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسی طرح بعض برائیاں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں مردود
ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ شراب نوشی کرنے والے کی چالیس دن تک
نماز قبول نہیں ہوتی۔ اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔ ورنہ قانون یہی ہے۔ فرمایا
جو غلام اپنے مالک کی مرضی کے خلاف بھاگ جائے، وہ جب تک واپس نہ آئے، اس کی کوئی
نماز قبول نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مالک کو دھوکا دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت میں آیت ہے کہ سمنہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَخْلَصْ فِي
دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلًا مِنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کر لو تو پھر تبارک و تعالیٰ کا عمل بھی
کفایت کر جائے گا۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے مُخْلِصِينَ لَهُ السَّعْيَ اخلص کے
ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص ایک ایسی نعمت ہے جو توجہ کے بغیر حاصل نہیں ہو
سکتی۔ اہم ابوہریرہ صحت فرماتے ہیں۔ اگر انسان میں خلوص موجود ہے، اس کا عقیدہ توحید پر ہے، فخر
درست ہے، تو پھر اس کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی
فرمانبرداری

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تذکرہ کے بعد امت مسلمہ کی اسس اور پھر نبی آغا ابراہیم علیہ السلام کی
کی بعثت کی دعا ہے۔ یہی مرکزی محور ہے۔ جو اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
اپنی دعا میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست پیش کی، گویا نبی علیہ السلام کے ظہور

۱۔ ترمذی ص ۲۱۶ ۲۔ ترمذی ص ۲۱۷

۳۔ جامع سنن ترمذی شرح فیض القدر ص ۲۱۶ ۴۔ احکام القرآن ص ۲۱۶

سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا کی۔ اور دُعائے پُت سے
میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ سے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
بنالے۔ کہ ہم دونوں ہر حالت میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی ہمیشہ
یہی دعا رہی تُوَفِّقْنِي مُسْلِمًا وَالْحَقُّ بِالصَّالِحِينَ نے اللہ۔ ہماری موت فرمانبرداروں
کی حالت میں آئے۔ درجہ وصیت کرتے ہیں ترزا تے ہیں فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ
کوشش کرو بھائی کہ تمہارا خاتمہ اسلام اور فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
اور اسماعیل علیہ السلام نے جی بی دعا کی۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اللہ! ہم دونوں
کو اپنا فرمانبردار بنا۔ اور یہ جی سہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے۔ يٰۤاِبْرٰهٖمُ اسْلِمْ فَرَدِّہٖ ہونا۔ آپ نے جواب دیا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
میں رب العالمین تمہیں تو یہ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض مسخاڑوں کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو راست
عطا کی۔

امت مسلمہ کی
تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پتے پتے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعا مانگی۔ اور
پھر اپنی اولاد کے متعلق دعا کیا وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اور ہماری اولاد
میں سے ایک فرمانبردار امت پیدا فرما۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس وقت یہ دعا کی گئی۔
اسوقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی موجود تھے۔ لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت
اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت حق علیہ السلام تو اس وقت تک ابھی
پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی مقام پر یہ دو نصاریٰ دھوکا کھاتے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کی راست
کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دعا حضرت اسحق علیہ السلام کے حق میں ہے۔ اور
امت مسلمہ بھی آپ ہی کی قوم ہے۔ حالانکہ تاریخ غنی شواہد سے واضح ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ
کا تعلق حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہے۔ جو اس وقت موجود تھے۔ اور دعائیں شامل تھے چنانچہ
یہ قبولیت دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے
مبعوث فرمایا۔

من یک
کی تعبیر

دعا کے درست حصے میں باپ بیٹے نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی وَادِّعْنَا سَنًا

اے پروردگار! ہم کو ہمارے مناسک حج بھی بتا دے۔ مناسک مناسک کی جمع ہے جس کا لفظی معنی دھونا ہے۔ اسی لیے عربی والے کپڑا دھو لے کر نسک الشوبہ بولتے ہیں۔ نسک قربانی کو بھی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے عبادت و ریاضت کو نسک کہتے ہیں۔ اور عابہ کو مناسک اور عبادت کا وہ یقربانی کی جگہ کو مناسک کہتے ہیں۔ گویا معنی یہی نکلتا ہے کہ جس طرح دھونے سے کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور عبادت سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تو جیسا کہ گذشتہ درس میں ذکر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کا حکم صادر فرمایا۔ تو حضور نبی تھا۔ کہ جس حج کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا طریقہ اور احکام بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اسی لیے باپ اور بیٹا دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ارکان حج بھی سکھلا دے تاکہ جو لوگ اس ارادے سے آئیں وہ تیرے احکام کے مطابق اس فریضہ کو ادا کر سکیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں اونٹ کی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا یَا أَيُّهَا النَّاسُ خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ اے لوگو! مجھ سے احکام حج اچھی طرح سیکھ لو لَعَلَّكُمْ لَا تَكُونُوا بَعْدَ عَامِي هَذَا شَيْءَ اس سال کے بعد تمہارے ساتھ ملاقات نہ ہو سکے۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ آپ اس حج کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ نہ آ سکے۔ اور تین ماہ بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بغرض مناسک سے حج کا طریقہ اور اس کے احکام مراد ہیں۔ جن کے مطابق قیامت تک آنے والے لوگ حج کرتے رہیں گے۔

لفظ اَرِنَا ریت یا رائی سے ہے۔ اس کا مصدر رَاى بھی آتا ہے۔ اگر ریت مصدر لیاجئے تو اس کا معنی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اے اللہ! ہمیں مناسک حج دکھا دے اور رائی مصدر ہو تو اس کا معنی نزل سے جاننا ہوگا۔ اَلَمْ تَسْأَلِ الْكَذِبِيَّ ریتِ قَلْبِي مراد ہے تو یہاں بھی اَرِنَا کا معنی یہ ہوگا کہ ہمیں مناسک حج کا علم عطا فرما۔ وَتُبَّ عَلَيْنَا اے ہمارے

توبہ قبول فرما، مہربانی کے ساتھ ہم پر جو غم فرما۔ اِنَّكَ اَنْتَ لِتَوَابِ الرَّحِيْمِ بَشِيك
 توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یعنی مہربانی کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔ تو از حد مہربان ہے۔
 باپ اور بیٹے کی دعا کے دو حصے مکمل ہوئے۔ تیسرے حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ
 علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست کی گئی ہے۔ جو اگلے درس میں آئے گا۔

الْعَا

درس پنجاہ ویکہ

انبیاء

آیت ۱۲۹

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول بھیج،
جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور انہیں پاک

کرتے۔ بیشک تو زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

جس وقت حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھائے تھے، تو ساتھ
ساتھ دعا بھی مانگ رہے تھے۔ دعائے بعض حصے گزشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں، سب سے پہلے انہوں
نے عرض کیا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرما، اِنَّكَ
اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ تو سنتا بھی ہے اور ہر شخص کی نیت اور ارادے کو بھی جانتا ہے دونوں
باپ بیٹے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور عرض کیا کہ ہمارے اس عمل کا مقصد محض تیری رضا ہے، لہذا تو ہم
سے یہ عمل قبول کر لے۔

دعائے دوسرے میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے ہمارے پروردگار!
ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ مگر ہماری اولاد
میں سے ایک ایسی جماعت بنا جو تیری فرمانبرداری ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا کو شرف
قبولیت بخشا۔ اور حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کی اولاد میں امت مسلمہ پیدا کی۔ بنیادی طور پر
اس امت مسلمہ میں عرب ہی شامل ہوئے۔ جو کہ اسمعیلی نسل کے قریش تھے، اس کے بعد انصار مدینہ
نہیں شامل ہوئے۔ اور پھر جو لوگ بھی ان کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ وہ سب اس امت میں شامل
ہیں۔ اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ کئی ہزار سال بعد نکلا جب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ
علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

دعا کے قیامت حصہ میں عرض کیا "وَإِنَّمَا مَنَّا رِجَالٌ" اور ہمیں نہ اس کا حق بھی تھا کہ ہمارے بعد آنے والے بھی اسی طریقے کے مطابق بیت اللہ شریف کا حج کرتے رہیں۔ نیز یہ دعا کی "وَتَبَّ عَلَيْنَا" نے اللہ! ہماری توبہ قبول فرمائے کیونکہ اِنَّكَ اَنْتَ السَّوَابُ الرَّحِيْمُ توبہ قبول کرنے والا اور ہم ہمارے بہ نسبت براہیم علیہ السلام یہ دعا کر سکتے تھے۔ "صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام آئیں کہ رد میں شامل تھے۔

حضرت غیل اللہ علیہ السلام کی دعا ہو چکا ہے یہ تھا۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ہمارے پاس پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست پہلے اور رسول کی بعثت کی دعا بعد میں کیوں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست اپنی اولاد میں سے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ قریش عرب حضرت براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کی داغ بیل ڈالی۔ پھر ان کے ساتھ انصار مدینہ شامل ہوئے۔ اور پھر باقی اقوام عالم کو امت مسلمہ کی رکینیت حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی بعثت امت مسلمہ میں سے مطلوب تھی اس لیے امت کا ذکر پہلے کیا اور بعثت نبوی کا بعد میں کیا۔ سورہ جمعہ میں اسی قسم کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رُسُلًا مِنْهُمْ" اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے عرب کے ناخوندہ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا۔ ظاہر ہے کہ عرب کے اکثر لوگ کھنسنے پڑنے سے عاری تھے۔ کرئی اکاؤنٹ آدمی ہی نوشت و خواند سے واقف تھا۔ لہذا اس مقام پر انہوں کا ذکر کیا۔ مگر مخاطب وہی قریش ہیں۔ جو کہ حضرت براہیم علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔

لفظ رُسُولٌ اسم نکرہ ہے۔ اور اس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے لہذا اس کا معنی صرف رسول نہیں بلکہ عظیم الشان رسول ہوگا۔ دوسری آیات میں بھی یہ لفظ نکرہ کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے۔ جیسے "بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رُسُلًا مِنْهُمْ" اس میں مِنْهُمْ اس کی قید سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بعثت

عظیم الشان رسول

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے اُمت مسلمان بنائی۔ اور پھر ان میں سے الرَّسُولُ نہیں بلکہ رُسُوْلٌ یعنی نہایت عظمت والا رسولِ مبعوث فرمایا۔ یہ ایک عام سنت اللہ بھی ہے۔ کہ ہر نبی اپنی قوم میں سے مبعوث ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایسا ہی مذکور ہے۔ مثلاً عاد، ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم قوم ابراہیم، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی قومیں، غصیکہ ہر نبی اپنی ہی قوم میں ہوا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی ہی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا۔ ایسا ہونا منطقی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اپنی ہی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے نبی کے اخلاق و اطوار کو ہر شخص جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اس کے اخلاص کی بنا پر نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی بعثت کی سعادت بھی آپ کی اپنی قوم کو حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی اپنی ہی قوم میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اُسی جنس میں سے یعنی انسان ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرف مبعوث ہونے والا نبی انسان ہی ہوگا۔ کسی غیر نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو۔ تو امت کو نبی کے اتباع میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے۔ یا بعض معاملات میں اتباع ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فرشتے یا جن کو ان لوگوں کی طرف نبی مبعوث کیا جائے۔ تو یہ نسل ہی مختلف ہوگی۔ نبی اور امت کے مادہ تخلیق میں فرق ہوگا۔ ان کی بود و باش اور عادات و خصائل میں فرق ہوگا۔ ان کی ضروریات مختلف ہوں گی۔ لہذا نبی کا اتباع کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ نبی کا اپنی قوم کی جنس سے ہونا کوئی غار کی بات بھی نہیں ہے۔ علم عقائد والے نبی کی تعریف یہ رکھتے ہیں الرَّسُولُ رَاسُ الْإِنْسَانِ بَعَثَهُ اللَّهُ تَعَالَى إِلَى الْخَلْقِ لِتَبْلِيغِ الْأَحْكَامِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف احکام شرعیہ پہنچانے پر مقرر کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے جس انسان کو منتخب فرماتے ہیں۔ اس پر وحی نازل فرماتے ہیں اور اس کی شان کو بلند فرماتے ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باطل عقائد وضع کر لیے ہیں کہ نبی کو انسان کے سے اس کی نمود باللہ تو مین ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ نبی کا انسان ہونا تو انسانیت

نبی انسان
ہی ہوتا ہے

کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو کہنا اِنِّیْ خَالِقُ الْبَشَرِ مِنْ طِیْنٍ میں
بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ اس میں حقیر کی کون سی بات ہے۔ نہ معلوم لوگوں نے یہ
کیسے سمجھ لیا ہے کہ بنی کو بشر کہنے سے بنی کی توہین ہو جائے گی۔ اس پر ضرور ہے کہ بنی ایک
عام انسان کی طرح نہیں ہوتا۔ جس میں ہر نیک و بد شامل ہوتا ہے۔ بلکہ بنی کو تمام امت پر فضیلت
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ محصوم ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسانیت یا بشریت کا تعلق ہے۔
قرآن پاک نے بار بار اس کی تصدیق کی ہے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَللّٰهُ تَعَالٰی
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان بشریت کرایا ہے۔ دوسری جگہ آپ ہی کی زبان سے کھلایا
”هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ“ آپ فرمادیتے کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان
ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ نہ میں عالم الغیب ہوں۔ نہ مختار کل ہوں۔ نہ میرے قبضے میں
خزانے ہیں۔ نہ تمہاری فرمائش پوری کرنا میرے بس میں ہے۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول اور
انسان ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی کہتے ہیں کہ میں بھی
تمہاری طرح انسان اور بشر ہوں۔ جس طرح تم کسی کی اولاد ہو اسی طرح میرے بھی۔ آپ میں
جس طرح تمہاری نسل سے تمہاری اولاد ہے۔ اسی طرح میری بھی ہے۔ تمہاری بھی ضرورت
زندگی میں اور میری بھی ہیں۔ باقی انسانوں پر پیش آنے والی واردت بیماری، صحت وغیرہ
انبیاء علیہم السلام پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ تمام طبعی امور حتیٰ کہ موت و حیات بھی سب پر طاری
ہوتی ہے۔ البتہ فرمایا کہ بنی کو امت پر فضیلت ہے: ”يُؤْتِيْهِ الْاِلٰہُ مَحْدِیْہٖ“ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔
اور یہ بہت بڑی عزت و اکرام والی چیز ہے۔ جو اُسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کام
کے لیے منتخب کر لے۔ اس سے زیادہ فضیلت والی اور کوئی چیز نہیں غرضیکہ انبیاء کرام علیہم السلام
بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر انسانیت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انسان کہنے میں ان کی
توہین نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان تو وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت بخشی۔
اسی لیے تو فرمایا ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ“ ہم نے آدم کے بیٹے یعنی انسان کو عزت بخشی۔

امتی خواہ کتنی بھی نیک کلام صالح اور پاکیزہ ہو۔ وہ معصوم نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ عام انسان تو گنہگار ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف بنی ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس صفت کے بغیر بنی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں معصومیت معفود ہو تو اس کا اتباع ممکن نہیں لہذا کوئی بدترین شخص بھی بنی کی تہین نہیں کر سکتا۔ وہ تو معصوم ہے۔ اگر کوئی شخص بنی کے درجے میں برابر کی کا دھوے کرے تو وہ مومن نہیں رہتا۔ مگر ہمارے ہی بھائیوں نے بنی کو انسانیت کے دائرے سے خارج کر کے نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ کا خطاب دے دیا۔ بھائی یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے۔ وَجَعَلُوا لَكَ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا اللّٰہِ کے لیے اُسی کے بندوں میں جبر و بنایا اور مشرک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو خالق ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی کمال صنعت کا ظہور ہے۔ اس کو خدا کا جبر و بنانا سخت بے ادبی اور گستاخ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا ہے۔

تلاوت قرآن پاک

فرمایا اے ہمارے رب! امت مسلمہ میں انہی میں سے ایک رسول بھیج بیشک
عَلَيْهِمْ اٰیٰتِكَ جَوَّانٌ پر تیری آیات قوت کرے۔ آیت سے مراد احکام یا فرمان ہے جو بنی پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ بزرگم علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولا کریم! جس عظیم الشان بنی کی بعثت کی دعا کر رہا ہوں اس کا پہلا فرض یہ ہو کہ وہ تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور انہیں تیرے احکامات آگاہ کرے۔ کیونکہ بنی کیلئے اللہ تعالیٰ کا عام حکم ہے یَاٰیٰہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آپ پر نازل ہوا آپ اُسے آگے امت تک پہنچا دیں۔

تلاوت کے دو معنوم ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا مقصد احکام کو دوسروں تک پہنچانا یا دوسروں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ اور اس کا دوسرا مقصد خود اپنی ذات کے لیے تلاوت ہے جس طرح ہم قرآن پاک کو کلام الہی ہونے کی وجہ سے ثواب کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جس قدر بار بار تلاوت کرے گا۔ تنہا ہی ثواب کا اتھار ہو گا۔ خود لفظ قرآن کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ کتاب جو بار بار پڑھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کی آیات جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ وہی کئے ذریعے حضور علیہ السلام کی ذات والا صفات پر نازل ہوئی تھیں۔ جب آپ پر وہی نازل ہوتی تو آپ گھر سے باہر تشریف لاتے اور کاتبان وحی میں سے جو بھی قریب ہوتا اُسے طلب فرماتے اور حکم کرتے کہ اس آیت یا سورۃ کو فلاں مقام پر لکھو تو وہ لکھ لیتے۔ بعض اوقات آپ عام مجلس میں تشریف لاتے اور اعلان فرماتے کہ ابھی بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا ہے بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا کہ مجمع عام میں تشریف فرما ہوتے اور آپ پر وحی کی کیفیات طاری ہو جاتیں۔ آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ ارشاد فرماتے کہ یہ وہی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ حضرت زیدؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ یا جو بھی کاتب مل جاتا اُسے تحریر کروا دیتے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ عظیم الشان رسول تیری آیات کی تملادت کرے گا۔ اب دوسری بات یہ بتائی کہ وَيُؤْتِيهِمُ الْكِتَابَ کہ وہ رسول اُمت کو کتاب کی تعلیم دے گا۔ کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم دینا دوسری بات ہے۔ یہاں پر کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے۔ اور علم محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں إِنَّمَا يُعَلِّمُوا بِالتَّعَلُّمِ علم خود بخود حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ سیکھنے سے آتا ہے۔ اور جو لوگ خود بخود سیکھتے ہیں۔ استاد کی مدد حاصل نہیں کرتے۔ صرف کتابیں پڑھ کر عالم بنا چاہتے ہیں۔ وہ علم میں کچھ سیکھتے ہیں اور ان میں اکثر گمراہ ہوتے ہیں۔ ان میں کما حقہ علم کی نکتہ نہیں آتی۔ علم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ سلف صالحین نے حصول علم میں جس قدر محنت کی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اہم شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال تک اس حالت میں رہا کہ رات کو ریاس منگتی تھی تو رات بھر ایک پیالہ پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ کہ کہیں مطالعہ میں غفلت نہ آجائے۔ اگر غمزدگی طاری ہوگئی تو مطالعہ ادھورا رہ جائے گا۔ چالیس چالیس سال تک لوگوں نے اتنی بڑی بڑی محنت کی ہے۔ تب جا کر علم حاصل ہوا ہے۔

بہر حال تعلیم ایک اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ

اس قسم کے نجات تعلیم کے ذریعے مل جاتے ہیں۔ کہیں کسی حکم کو خاص کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خصوصیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ جو کہ استاد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بعض چیزیں جنات کے قبیلے سے ہوتی ہیں۔ انسان ذرا سی توجہ کرے، تو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔

میسے فرمایا: **هُوَ الَّذِي رَسَدَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ** وہ ذات خداوندی جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔ یہاں پر ہدایت اور دین حق کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی معمول چیز نہیں ہے جو ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اے اللہ! انہیں میں سے رسول بھیج جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

حکمت کی تعلیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری دعائی تھی **وَلْيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** ایسا رسول مبعوث فرمایا جو کتاب کے علاوہ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حکمت کی تشریح میں مفسرین کرام کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد انوارِ قلوب یا باطنی باتوں کا جانا ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ حکمت عقل کی دلیل اور دل کی بصیرت کا نام ہے۔ حضرت ام المومنین فرماتے ہیں **مَعْرِفَةُ الدِّينِ وَالْفَقْهُ فِيهِ وَالتَّوْبَعُ لَهُ** یعنی حکمت نام ہے دین کی معرفت۔ اس کی سمجھ اور اس کے اتباع کا۔ عام طور پر حکیم کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔ **مِنْ أَنْعَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ** حکیم وہ ہے جس نے علم اور عمل میں سختی حاصل کر ڈاکر کا معنی ماہر فی الفن ہے۔ خواہ وہ بے عمل ہو۔ مگر حکیم وہ ہوگا جو علم اور عمل میں مادی ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ شریعت الہیہ میں جتنی مصلحتیں اور دین کے جتنے احکام ہیں ان کو پہچاننے کا نام حکمت ہے۔ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے

ہیں کہ تمام چیزوں کو ان کی حقیقت کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے
 اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا ۛ اللہ! ہمیں حق کو سمجھنے کی توفیق عطا کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہم باطل کو حق
 سمجھنے لگیں۔ بزرگان دین کی دعا میں آتا ہے کہ ہمیں چیزیں اس طرح دکھا جس طرح وہ واقعہ
 میں ہیں۔ بسا اوقات آدمی کسی چیز کو سمجھتا کچھ ہے، مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ امام ابن عربہؒ
 جو کہ لغت کے اہم ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو تمہارے لیے نصیحت کا باعث بنے یا نہیں
 بُرائی پر زجر کرے یا کسی قبیلہ کا مہ سے رد کے یا کسی بزرگی کے کام کی طرف دعوت دے وہ سب
 حکمت ہے۔ اہم راغب جو لغت اور تفسیر کے اہم ہیں فرماتے ہیں الْحِكْمَةُ اصَابَةُ
 الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْدُ حَقٌّ كَوَاعِلُ الْعَمَلِ کے ذریعے پالینا حکمت ہے اور بعض فرماتے
 ہیں کہ قول اور عمل میں برابری کا نام حکمت ہے۔

اہم بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسی چیز جس کے ذریعے انسان کے
 نفس کی تکمیل ہوتی ہو حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ
 اللَّهِ یعنی حکمت کی جڑ اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ جس انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا
 ہو جائے۔ سمجھ لو کہ اس میں حکمت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے مَنْ
 خَلَصَ لِلَّهِ رَبِّينَ يَوْمًا ۛ جس نے چالیس دن تک اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت
 کی جَرَّتْ يَنْبَغِ الْحِكْمَةُ مِنْ قَلْبِهِ ۛ علی لسانہ حکمت کی سہولت اس کے دل
 کی طرف سے اس کی زبان پر جاری ہو جائے گی۔

بعض محققین کہتے ہیں حکمت نام ہے معرفۃً اَفْضَلُ الْأَشْيَاءِ بِأَفْضَلِ
 الْعُلُومِ افضل چیز کو افضل علم کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سب افضل
 چیز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اور سب افضل وہ علم ہے جس سے انسان کو
 حضور قلب حاصل ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ خدا تعالیٰ کی

ذات اور اس کی صفات کو پہچان لے گا اور سمجھ جائے گا کہ یہ شخص حکیم ہے۔ تاہم عام فہم معنی میں حکمت، الشوری، کعبہ اور پستے کی باتوں کو کہتے ہیں ایسی باتیں احکام ہوتے ہیں۔ ان کی مصلحتیں اور ان کے اثر بھی ہوتے ہیں۔ ان کے غوامض ہوتے ہیں۔ اس میں سنت بھی شامل ہے۔ اور حضور نبی کریم علیہ السلام نے یہ تمام باتیں کھائی ہیں اس لیے فرمایا وَيَقْلِبُهُمُ الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ وہ رسول جو لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

دعا کا چوتھا جزو تھا وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کرے۔ یہ لفظ بڑے دور رس معانی تزکیہ نفس کا حامل ہے۔ پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ ان سے تمام رذائل دور ہو جائیں۔ اور تمام فضائل ان میں پیدا ہو جائیں۔ رذائل میں خفاق، بد اخلاق، گندگی، معاصی، بد انتمائی، اور دیگر تمام شریر چیزیں آتی ہیں جن میں سب سے پاکیزگی مطلوب و مقصود ہے۔ تزکیہ اسی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام۔ اس موقع پر یہ بات سمجھائی کہ کسی قوم میں فوز و فلاح اور سعادت تزکیہ کے بغیر نہیں آسکتی۔ لہذا انہوں نے امت مسلمہ کے لیے تزکیہ کی دعا کی۔ اور پھر آپ کی دعا کا اثر بھی دیکھئے حضور نبی اکرم علیہ السلام کے اولین مخالفین کی جہالت مثالی تھی۔ ان کی خباثت، جہالت اور ہٹ دھرمی سب کچھ عیاں ہے۔ مگر اس تزکیہ کی بدولت کیسے کیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے تن من و حن ہر چیز دین پر قربان کر دی۔ ایک درس کے مقام پر تزکیہ کو یوں بیان فرمایا خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کر لیں تَطَهَّرُ لَهُمْ و تزکیہ ہوگا وہ ظاہری اور باطنی بر دو پہلوؤں سے پاک ہو جائیں گے۔ غرضیکہ تزکیہ سے مراد ظاہری پاکیزگی بھی ہے۔ اور باطن کی پاکیزگی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ لے اللہ! ان میں ایسا رسول بھیج جو تیری آیات پر حاکم بنائے۔ انیس کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا آخری حصہ تزکیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے

اس کو دعائے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ بزرگان دین کی بیعت حصول تزکیہ کا ایک ذریعہ ہے جو کہ حضرت علیؑ سے چلا آیا ہے۔ بزرگان دین مرید کو وظیفہ بتاتے ہیں۔ عبادت و ریاضت کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اور ضروری پرہیز بھی بتاتے ہیں۔ تاکہ مرید بانیوں سے پاک ہو جائے اور اس میں خوبیاں اجاگر ہو جائیں۔ مگر آج پیری مریدی ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بیعت ایک

بیعت اور
تزکیہ

رہی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ فاسق فاجر۔ بے نماز، بیٹرا اور کتے پالنے والے گدی نشین ہیں۔ اور جھٹلا سے بیعت لے رہے ہیں۔ نہ پیر کو احکام الہی کا علم ہے۔ نہ مرید کے پٹے کچھ پڑا ہے۔ بس چند رسوم ادا کر کے پیری مریدی کے بندھن میں بندھ گئے۔ نہ پیر نے تربیت کی از حلال و حرام کی قیڑ بکھائی۔ تو تزکیہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے جن لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اُس کا کوئی مقصد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں سے ان شرائط پر بیعت لیں کہ کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ گناہ کی باتوں سے پرہیز کریں گے۔ جوری نہیں کریں گے۔ بدکاری نہیں کریں گے۔ کسی پرستان نہیں باندھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا اگر ان شرائط کے مطابق مرد اور عورتیں بیعت کریں۔ تو ان کی بیعت میں اور جو ان شرائط کو پورا نہ کریں ان سے بیعت نہیں۔ مگر آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ بیعت بھی ہو رہی ہے۔ اور کفر و شرک، بدعات کی بھی فراوانی ہے۔ کوئی پیر مرید سے نہیں پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو۔ قبریں پکی بن رہی ہیں، گنبد تعمیر ہو رہے ہیں۔ ان پر قوالی ہو رہی ہے۔ گانے گائے جاتے ہیں۔ قبروں پر چادریں چڑھتی ہیں، سجدے ہوتے ہیں۔ بتائیے اب تزکیہ کہاں سے آئے گا۔ بزرگان دین نے ان باتوں کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے لیے جھوٹا بھی پسند نہ کیا۔ اس دنیا کی پوری زندگی مسافروں کی طرح گزار دی۔ مگر آج ان کی قبروں پر عالیشان گنبد بنائے جاتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں کی تعلیم یہ تھی کہ مرد کے لیے سونا اور ریشم حرام ہے۔ انکی قبروں پر سونے کے دروازے اور ریشم کی چادریں چڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا وہ بزرگ ان ظرافت سے بیزار نہیں ہوتے ہوں گے۔ وہ تو ساری عمر ایمان کی دعوت دیتے رہے، کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، مگر ہم ان کے بعد کیا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ پیغمبر کا ایک فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک شخص آیا۔ حضور! میں نے فلاں جگہ پر جانور ذبح کرنے کی منت مانی ہے۔ کیا اسے پورا کر دوں۔ آپ نے پوچھا۔ اُس جگہ کبھی کوئی بت تو نہیں تھا یا کسی زمانے میں وہاں کوئی بزرگ تو نہیں بیٹھا تھا۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے وہاں پر جانور ذبح کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ زمانہ جاہلیت

ہیں وہاں کوئی تھان جو جس کی پوجا ہوتی ہو۔ کوئی بزرگ کسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو درخت کی پوجا ہونے لگی۔ آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی۔

الغرض! حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام نے دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف فرمائی۔ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اے مولا کریم! تو ہی کمال قدرت کا مالک ہے۔ عزیز کا معنی غالب ہے۔ یعنی ہر چیز پر تیرا ہی غلبہ ہے۔ اور حکیم سے مراد کمال حکمت کا مالک بھی تو ہی ہے۔ تیرے سب امور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری دعا کو قبول فرما اور امت مسلمہ قائم کر اور پھر ان میں عالیشان رسول بھیج جو تیری آیات پڑھے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَمَنْ يَدْعُبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مِنْ سَفِهَةٍ نَفْسِهٖ وَلَقَدْ
اصْطَفَيْنٰهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۳۰
اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِربِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۳۱
وَوَضٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهٖ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰى لَكُمْ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۲
اَمْرُكُمْ شَهِدَا اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ
لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَاللّٰهَ اَبَاكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۝۱۳۳
وَوَحٰى لَهُ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۴ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَنْهَا كَالَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۵

ترجمہ : اور نبی اعراض کرتا ابراہیم (علیہ السلام) کی امت سے مٹو رہے تھے جس
نے اپنے نفس کی بیوقوف بنایا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پسند فرمایا دنیا میں
بیشمار آخرت میں البتہ نیکوکاروں میں شمار ہوگا ۝۱۳۰ جب اُس کے رب نے فرمایا
ہو جاؤ۔ تو اُس نے کہا میں فرمانبردار ہو چکا ہوں رب العالمین کے لیے ۝۱۳۱ اور ابراہیم
(علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اس امت پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ اور یعقوب (علیہ السلام)
نے بھی۔ اور کہلے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رہیں کر چن لیا ہے پس
تم نہ مرد، مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو ۝۱۳۲ کیا تم حاضر
تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آئی تھی جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے
کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم عبادت کر بیٹے
تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسمعیل، اور اسحق (علیہم السلام)

کے معبود کی۔ وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۱۳۳) یہ ایک عجبت ہے جو گزرتی ہے۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے کیا۔ درتمہ سے اُن باتوں کے متعلق نہیں پڑا جائے گا جو کچھ وہ کرتے تھے (۱۳۴)

اللہ تعالیٰ نے پہلے بیت اللہ شریف کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر کا ذکر فرمایا۔ اور پھر اسی شخص میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا ذکر رکھی۔ دعا میں سب سے پہلے عمل کی قبولیت اور اور پھر اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق طلب کی گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے کی اولاد میں سے اُمتِ مسلمہ کے قیام اور پھر اُن میں سے ایک عظیم الشان رسول کی بعثت کی دعا تھی۔ اور پھر اُن فراموش کا ذکر تھا جو آخری رسول انجام دے گا۔

یہاں پر مرکزی نکتہ منہ بخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی ہے۔ کیونکہ اہل کتاب آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یہ مرکزی مضمون آگے دُور تک جائے گا۔ ابتدا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ اور پھر اس دعا کے مصداق کا بیان ہے۔ تو یہ دعا کہ دعائے خلیل سے ظاہر ہے۔ کہ وہ ذات والا صفات صمدیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہو سکتی ہے آپ ہی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا خاندان قریش اُنکی نسل سے ہی پھلا آ رہا تھا۔ انہیں میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کا قیام فرمایا۔ اور دعائے مطابق انہیں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آثار

آپ کی بعثت کے متعلق منہ انہ میں آتا ہے کہ کسی نے پوچھا۔ حضور! آپ کی ابتداء کیسے ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا اَنَا دَعْوَةٌ إِلَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَرُءُيَا اُمِّي وَبَشَارَةٌ عِيسَىٰ یعنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، اپنی ماں کے خواب اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُسی دعا کا ذکر ہے۔ جو گزشتہ درس میں گزر چکی ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ لِمَا يُرْسَلُ ۚ اِنَّ يَوْمَئِذٍ يَّسْمَعُونَ ۚ اِنَّ يَوْمَئِذٍ يَّسْمَعُونَ ۚ اِنَّ يَوْمَئِذٍ يَّسْمَعُونَ ۚ

حضور علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا۔ کہ ان کے پلو

سے ایک ایسی روشنی نکلی ہے جس سے شام اور بصری کے مہلات روشن ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ اس حدیث کی ترجمانی مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی طویل نظم مرد و جزر اسلام میں خوب کی ہے۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہو یا دعائے غسیل و نوید مسیح

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تمہاری طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ میں اپنے سے پہلی کتاب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ ”وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ“ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہو گا۔ عبرانی اور سریانی زبان میں احمد کو فار قلیط کہا گیا ہے جس کا معنی دنیا بھر کا تعریف کیا ہوا۔

شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی؟ غالب کے شاگرد تھے اور علوم دینیہ میں حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء کی جنگ آزادی میں آپ زیر تعلیم تھے۔ بڑا سہنکامی کی وجہ سے اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ آپ کا شمار قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام کے غرور و زوال کی داستان نہایت مؤثر انداز میں نظم کی صورت میں پیش کی ہے۔ آج کل لوگ میلاد خوانی کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی مرح کے نام پر کھڑیہ اور شکر یہ کھات کہہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام نعمتوں کے مقابلے میں مولانا حالی کا یہ ایک ہی شعر کافی ہے۔ حدیث کے مخزن کو ایک شعر میں کمال طریقے سے سمو کر حضور علیہ السلام کی تعریف کی ہے۔

تفسیر معالم التنزیل میں شان نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ کے بھائی کے دو بیٹے بھی صاحب علم تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ توراۃ میں یہ بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں بنی اسرائیل اور بنی اسمعیل میں ایک نبی مبعوث کروں گا۔

اہمیت کا شان
نزول

جس کا نام احمد ہوگا۔ اور جو شخص اس پر ایمان لائے گا، ہدایت پا جائے گا۔ اور جو اس کا انکار کریگا وہ ملعون ہوگا۔ چنانچہ ان دو بھائیوں میں سے ایک بھائی مسلمان ہو گیا اور دوسرا یہودیت پر قائم رہا۔ آیات زیر درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وقتِ ابراہیمی
سے اعلیٰ

فَرَا وَمَنْ يُرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ فَلَمَنْ يَفْضَحْهُ نَفْسُهُ أَوْ يَكْتُمْهُ
کرتا مکتبِ ابراہیمی سے مگر وہ شخص جس نے اپنے نفس کو بوقوف بنالیا۔ یعنی ایسا کام وہی کر سکتا ہے جو پرے درجہ کا بوقوف ہو۔ اپنی عقل و ضرر کو بردہ کے کار نہ لاتا ہو۔ وہ عقل مند شخص جس کی اپنی کوئی رائے ہو۔ وہ مکتبِ ابراہیمی سے اعراض نہیں کر سکتا۔

دینِ ملت
اور شریعت

دین، ملت اور شریعت تین مختلف چیزیں ہیں۔ دین تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک میراث ہے۔ قرآن پاک کے دو حکم مقام پر آتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ یعنی ہم نے آپ کی طرف وہی دین نازل کیا جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف نازل کیا۔ دین ایک بنیادی معیہ ہو مگر جو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ ہمیں اولین پیغمبر تو نبیہ است اسکے بعد فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور قیامت پر ایمان ہے۔ یہ ایسے بنیادی عقائد ہیں۔ جن میں کسی زمانے میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ ملت میں موٹے موٹے اصول اور کلیات ہوتے ہیں۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی ملت میں بھی بہت مددِ شرک ہوتا ہے اور ملت کبھی مٹتی نہیں ہوتی مگر ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بعض کلیات ہر ملت میں قائم رہے ہیں۔ مثلاً طہارت، خدا کے سامنے عاجزی، ساحت و مینا صنی، عدل و انصاف، تہذیب نفس وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جو تمام مل میں قدرِ شرک رہی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی گویا ایک ہی ملت ہے۔ ایسے ملتِ اسلامیہ کہہ لیں یا ملتِ ابراہیمی، مطلب ایک ہی ہے۔ اور اس آخری دور میں حضور علیہ السلام کا اتباع ہی ملتِ ابراہیمی کا اتباع ہے۔ جو شخص نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت کا فرد نہیں ہے۔ اُسکی طرف سے ملتِ ابراہیمی سے تعلق کا دعویٰ باطل ہے۔ ایسا شخص گمراہ ہوگا۔ چنانچہ اس وقت

لَوْبِ الْعَلَمَيْنِ انہوں نے کہا میں ہمہ تن جان و مال، خطیہ و باطن میں رشتہ العلین کا فرما ہر دار
ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا امت کا اولین اصول ہے۔ امت کا یہ فرض ہے کہ ہر آنے
والے نبی کا اتباع کرے۔ فرمانبرداری کی یہ شان ہے۔ ملتِ برابری میں سب بھٹا پیدا ہوا تو یہودیت
اور نصاریت پیدا ہوئی۔ اسی لیے ان دو گروہوں کی مذمت کی گئی ہے۔ حقیقت میں ملتِ برابری بھی
ہی ملتِ اسلامیہ ہے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رہنما تھا۔ اور جس پر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام
— بھی کار بند ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ارشاد ہوا اَنْ اَتَّبِعْ مِلَّةَ
اِبْرٰهٖمَ حَنِيفًا ۚ لَمَّا اسْمٰوِیۡہِ عَلٰی الدِّیۡمِ کا اتباع ہی حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت
کا اتباع ہے۔ جو شخص پہلے نبی کی اطاعت کا دعویدار ہے۔ اور آخری نبی کا انکار کرے۔ وہ ملتِ برابری
کا پیروکار کیسے ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر دین اسلام کو
قبول کر لیں۔

حضرت ابراہیم اور
یعقوب علیہما السلام
کی وصیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اسی ملتِ اسلامیہ پر کار بند بننے
کی وصیت کی۔ وَوَصَّی بِہَا اِبْرٰہٖمَ سَبِّحَہٗ وَ یَعْقُوْبُ حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے کتنے بیٹے تھے۔ اس میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چار بیٹے تھے۔ بعض نے
ساتھ اور بعض نے چودہ لکھے ہیں۔ آپ کی متعدد بیویاں تھیں۔ اور مدین، مائین، اسماعیل اور اسحاق
سب ابراہیم علیہ السلام کے ذندہ تھے۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام کے بھی بارہ بیٹے تھے۔ تو ان دونوں
جلیل القدر انبیاء کرام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ لے
بیٹو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین
ہے۔ اسی پر کار بند رہنا۔ فَلَا تَمُوْنُ اِلٰہَ وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور تمہاری موت صرف اسی
حالت میں آنی چاہیے کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو۔ یعنی دین اسلام پر قائم ہو۔ مقصد یہ تھا کہ
موت ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ پتا نہیں کس وقت دار ہو جائے۔ لہذا تمہارا ہر لمحہ اطاعت
خداوندی میں دین اسلام پر گزرنا چاہیے۔ یعنی مرتے دم تک ملتِ اسلامیہ پر قائم رہو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نہ رکھتا ہو۔ ترمیٹوں نے بیک آواز جواب دیا قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے وَاللَّهُ أَبَاحُكَ اور تمہارے آباؤ اجداد اب اس سے وَأَسْمَعِيكَ و اسحق ابراہیم، اسمعیل اور اسحق علیہم السلام کے معبود کی عبادت کریں گے۔ إِلَهًا وَاحِدًا جو ایک ہی معبود ہے۔ ہم صرف اُسی کی عبادت کریں گے۔ وَنَحْنُ لَكَ مُسْلِمُونَ اور ہم صرف اُسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہ سب باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دم واپسین کے وقت کی ہیں۔ جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کار بند ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ کے لیے ملت ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو۔ اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور علیہ السلام پر ایمان لانا ہو گا۔ کیونکہ آپ ہی ملت ابراہیمی کے پیچھے پیروکار اور پیچھے جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں۔ آگے سورۃ آل عمران میں آئے گا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعوایہ یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہو۔ تو بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا پڑے گا۔ آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تمہاری جھوٹی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

ان جلیل القدر مخبروں حضرت ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی توحید پر سختی کے بعد فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ خَلَتْ مِنْكُمْ اَسْوَءُ الْاَسْوَءِ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُعْبَدُوْنَ گئی، وہ دین توحید پر قائم رہی لہٰذا ماکسبت انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کیا۔ یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال و افعال کا اجر ان کو ملے گا وَلَكُمْ مِّنْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہارے لیے وہ ہو گا جو تم کماؤ گے۔ اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تمام لوگے۔ تو مراد کو پہنچو گے۔ اور اگر اپنی ضد اور عناد پر قائم رہے۔ تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا۔ اہم غزالیؒ نے بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھاپی لے۔ تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی۔

ہر امت اپنے افعال کی ذمہ دار ہے

جب تک وہ خود نہیں کھائے پئے گا۔ اسی طرح یسود و نصاریٰ کے آباؤ اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپالیں۔ فرمایا وَلَا تُسْلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تم سے یہ نہیں پرچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کا دین کیا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود اُن کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگی۔ تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔

وَقَالُوا كُذِّبُوا هَؤُلَاءِ اَوْ نَصْرُیْ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ رَبِّهِمْ
 حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۲۵ قُلُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا
 اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلَىٰ اٰبَادِهِمْ وَاسْمَعِیْلَ وَرَاحِیْقَ وَ
 یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ وَمَا اُوْتِیَ مُوسٰی وَعِیْسٰی وَمَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ
 مِنْ رَبِّهِمْ لَا تَفَرِّقْ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَتَخْذُلْ لَهُ مُسْلِمُوْنَ
 ۝۱۲۶ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنُتُمْ بِهِ فَقَدْ اٰمَنَ تَوَّهٗ
 وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّكُمْ مِّنْ رِّفِّ شِقَاقِ فِیْكُمْ فِیْهِمُ اللّٰهُ وَهُوَ
 السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۱۲۷ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنْ اللّٰهِ صِبْغًا
 وَتَخْذُلْ لَهُ عِبْدُكَ ۝۱۲۸

ترجمہ: اور یہودیوں کہتے ہیں یہ نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پابار کے لئے
 پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ہرگز نہیں، بلکہ ہم ملتِ ابراہیمی کی پیروں کریں گے جو ایک طرف
 رجحان کے والے رہتے ہیں اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے ۝۱۲۵ (اے ایمان والو!)
 ہم ایمان لائے ہیں اس شریعہ اور اس پیغمبر پر جو ہمارے طرف اتاری گئی ہے۔ اور یہ
 ابراہیم، اسماعیل، اسحق، یعقوب (علیہم السلام) ایمان کی اولاد پر اتاری گئی ہے اور
 ہم ایمان لائے ہیں اس پیغمبر پر جو موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) اور دیگر پیغمبروں کو
 ان کے رب کی طرف سے دی گئی ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق
 نہیں کرتے۔ اور ہم اُن کی پروردگار کی پیروں کرنے والے ہیں ۝۱۲۶ پس اگر یہ
 لوگ ایمان لے آئیں جیسا کہ تم ایمان لائے ہو تو تمہیں یہ ہدایت پابار میں سے اور انہوں نے
 پروردگار کی پس پشت مومنیت میں ہے۔ پس معترِب اللہ تعالیٰ نے بت کرے گا آپ
 کے لئے ان سے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ۝۱۲۷ (ہم نے)

اللہ کا ہم اختیار کیا ہے۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے؟ اختیارِ مذہب کے

اللہ ہم اُسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں (۱۳۸)

گزشتہ سیرت

یہود و نصاریٰ اور شرکین تینوں کو وہ ملتِ ابراہیمی کے مخالف تھے۔ خصوصاً اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت اور نصرا نیت کو سی ملتِ ابراہیمی خیال کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی یہی چیز اختیار کرنی دعوتِ مسیح تھی۔ مدینہ طیبہ کے اطراف میں بسنے والے یہودیوں میں ایک بڑا عالم عبد اللہ بن مسور یا مشور زمان تھا۔ اُس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ یہودیت اختیار کر لیں۔ ہدایتِ پابائیں گے۔ دلیل اُسی بھی یہ تھی کہ وہی اصل ابراہیمی طریقے پر قائم ہیں۔ عمار بن ابی لہب ان کا یہ دعوے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت تورات کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور نصرا نیت انجیل کی مسخ شدہ صورت۔ انہوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کی آمیزش کر کے اپنے مذہب کو باطل کر لیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف خالی نسبت پر ہی اتارتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل عقائد کو رد فرمایا ہے۔

یہودیت

اہل کتاب کا باطل کی طرف دعوت کا طریقہ یہ تھا کہ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا تَهْتَدُوا۔ وہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ۔ ہدایتِ پابائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو رد فرماتے ہوئے نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کی دعوت کے جواب میں قُلْ بَلَّ مَلَكًا أَبَدًا۔ حَقِيفٌ۔ آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہارا باطل مذہب اختیار کر لیں۔ اور اگر اس میں بگاڑ نہ بھی پیدا ہو تو بھی تورات اور انجیل تو مسخ ہو چکی ہے۔ اب قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جو کہ پہلی کتابوں کی ناسخ ہے لہذا اب تورات اور انجیل پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہودیت کا باطل طریقہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایجاد ہوا تو وہ یہودیت سے ہرگز ان کا طریقہ نہیں سمجھے اختیار کیا جاسکے۔ اسی طرح موجودہ نصرا نیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو سو سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ موجودہ نصرا نیت کا پیش کردہ عقیدہ تثلیث ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہے۔ لہذا یہ دونوں مذہب کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ طریقہ ابراہیمی نہیں ہے۔ بَلَّ مَلَكًا أَبَدًا۔ حَقِيفٌ۔ ہم تو اصل ملتِ ابراہیمی کی پیروی کریں گے۔ اُس حقیقی ملت کو اختیار کر کے ہی پرہیز

ہیں گے پہلی آیتوں میں گنہگار ہے کہ صحیح ملتِ ابراہیمی ہی ملتِ اسلامیہ ہے۔ وہ نہ مذہب
 عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ الْاَمَنُ سَفِیْہٌ لَّہٗ فِیْہِۃٌ اور اس ملت سے انحراف نہ
 کوئی یقوت ہی کر سکتا ہے۔ اور ان کا طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ ہے۔ اور اس
 آخری دور میں تہجیت محمدی ہی ملتِ ابراہیمی کی اصل بنشہین ہے۔ لہذا ہم تو اس ملت کا اتباع کریں
 گے جو حضرت ابراہیم صلی اللہ علیہ السلام کی ملت ہے۔ اور یہ اب شریعت محمدی کی شکل میں بہتے
 پاس موجود ہے۔

حضرت عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں گچی ہو۔ اور وہ چلتے وقت
 ایک طرف کو مال ہو جاتا ہو۔ اس کو احف بھی کہتے ہیں۔ لفظ حیف اُسی مائے سے ہے۔ اور
 اس کا معنی ہے۔ ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والا یعنی یکسو۔ اور اصطلاحاً حیف اُس شخص
 کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ حَفِیٌّ
 لِلّٰہِ غَیْرِ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی یہی آیا ہے۔ وَمَا
 کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ آپ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔ مگر جس یودیت اور نہایت
 کی دعوت تم سے ہے ہو۔ وہ تو شرک سے آلودہ ہے۔ تم تو عتیدۃ البیت کے قابل ہو
 جسے تشبیہ پائی جاتی ہے۔ لہذا ہم تمہارا شرکاز دین قبول نہیں کر سکتے بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی کا اتباع
 کریں گے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پاک تھے۔

شاہِ راہ اللہ محنت دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حیف وہ شخص ہو
 گا جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو۔ حج کرنے والا ہو۔ نماز میں بیت اللہ شریف کی طرف رُح
 کرنے والا ہو۔ فتنہ کرنے والا ہو۔ اور محرماتِ نکاح کو حرام سمجھتا ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی
 تفسیر میں ملتِ ابراہیمی کی چالیس خصوصیات بیان کی ہیں جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر بت کرے
 دے سے ماریاں شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانے ہو۔ بہ حال حضرت ابراہیم علیہ السلام
 حقیقت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ تم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت

کہ نباح کریں گے۔ تمہاری خود ساختہ یودیت و نہرانیٹ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ہاں ہاں

فرمایا کہ آپ ان کو اہل ملت ابراہیمی کی تشبیح بھی کر دیں۔ فَقُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ یعنی یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر یعنی ہماری ہر بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بٹھراتے۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ حلال و حرام میں کسی چیز میں اس کا شریک نہیں بناتے۔ بر خلاف اس کے بنی اسرائیل نے حلال و حرام کا منسوب پارہ یوں کے پرہ کر رکھا ہے۔ جسے پارہ کی حلال کر کے وہ حلال ہے۔ اور جس چیز کو پارہ حرام قرار دے گا، وہ حرام ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تحلیل و تحریم تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ منسوب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہاں جب بنی کسی چیز کی حلت و حرمت کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کردہ حکم کے مطابق ایسا کرتا ہے خود اپنی مرضی کے کسی چیز کو حلال و حرام قرار نہیں دیتا۔ یہودی چونکہ حلال و حرام کا اختیار اپنے اہل اور رہبان کو سپنٹے ہیں، اس لیے وہ تحلیل و تحریم میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تور
برایان

اہل ایمان کو خطاب سورہ بقرہ کہ ایمان باللہ کے بعد تمام کتب کا دیہ پر ایمان لانے کا بھی اعلان کر دو وَمَا أُنْذِرُكُم بِمَا أَسْأَلُكُمْ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں، جو ہماری طرف نازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَا أُنْذِرُكُم بِمَا أَسْأَلُكُمْ وَاِسْمَعِيلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَآدٰىسَ ط اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر مکمل آسمانی کتابیں تو جاری ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبا علیہم السلام پر چھوٹے چھوٹے صحیفے بھی نازل فرمائے۔ چنانچہ قرآن میں سورہ ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا ذکر آتا ہے۔ یہاں پر اسی صحائف کا ذکر ہے۔ کہ جس طرح ان کے کتبہ کا دیہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ان کے آسمانی ایمان پر بھی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ ان کے آسمانی ایمان سے ان کے ایمان علیہم السلام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد ان کے صحائف کو سچوٹ فرمایا۔ اور ان پر اور ان پر نازل ہوئے وہی اچھے ایمان پر ایمان کا مشیور ہے۔

فرمایا ہمارا ان کتابوں پر بھی ایمان ہے وَمَا أُولَئِكَ مُّؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا بِأُولَئِكَ اور
 عیسیٰ علیہما السلام کو عطا کی گئیں۔ یعنی توراۃ اور انجیل وَمَا أُولَئِكَ النَّبِيُّونَ مِنْ دُونِهِمْ
 اور اس چیز پر بھی ایمان لائے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دی
 گئی۔ غرضیکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نوح انسان پر جس وقت اور جو کچھ اپنے پیغمبروں
 کے ذریعے بھیجا ہے۔ سب پر ایمان ہونا لازم ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاں
 ہم ایمان لانے کا تعلق ہے۔ تم زبور، توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھو مگر وَلْيَسَعِدْكُمْ الْقُرْآنُ
 عمل کرنے کے لیے تمہارے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ یعنی سابقہ کتب پر عمل کرنے کی ضرورت
 نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک نے سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔
 اب قابل عمل احکام صرف قرآن کریم کے ہیں۔

اہم شافعی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں چار
 کریم عظیم کتابیں ہیں۔ یعنی زبور، توراۃ، انجیل اور قرآن کریم اور سو چھوٹی کتبیں صحیفے ہیں۔ جو حضرت
 آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے۔ ایسے ہی صحیفوں
 کا ذکر حضرت یونس، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور دیگر کئی انبیاء کرام کے ساتھ بھی
 آتا ہے۔ موجودہ مجموعہ کتب معراجہ بائبل کہتے ہیں، اس میں ۳۹ صحائف شامل ہیں۔ ان کتابوں
 اور صحائف میں اگرچہ بہت کچھ تحریف و تزیین ہو چکی ہے۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور
 ہمارا ان سب پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بذریعہ وحی انبیاء کرام پر نازل فرمائے۔

رسول اللہ ایمان

آگے اس بات کا اقرار ہے لَا تَفْشَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ہمارا ان تمام
 رسولوں پر بھی مکمل ایمان ہے۔ جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ بلکہ ان انبیاء کرام پر بھی ایمان ہے
 جن پر کوئی باقاعدہ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ اور ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے جھٹکت
 یہ ہے کہ ایمان مکمل اُسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان ہو

کسی پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا۔ یہ تو کفر کے مترادف ہے۔ بنی اسرائیل اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ دو بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر تو ایمان لائے مگر بنی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ دیکھو! اہل اسلام تمام سابقہ انبیاء کرام پر یعنی حضرت موسیٰ، عیسیٰ علیہما السلام و دیگر سب پر ایمان رکھنے کے ساتھ بنی آخر الزمان علیہ السلام پر بھی ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ دو دو نصاریٰ آخر نبی کے منکر ہیں۔ اس لیے یہ کافر ٹھہرے ہیں۔ لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ كَمَا مَطْلَبُ یہ ہے کہ ہمارے تمام انبیاء کرام پر یکساں ایمان ہے۔ ہم کسی میں بھی تفریق نہیں رکھتے۔ جو انبیاء کرام ہیں تو ہم کی طرف اور جس زمانے میں بھی مبعوث ہوئے، اگرچہ ہم انہیں جانتے نہیں مگر ان کی بعثت کے یکساں طور پر قائل ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل ایمان! تم سبے برحق ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور اس کی تمام کتابوں کو برحق مانتے ہو۔ اور ان میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے۔ وَتَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں جس نے تمام انبیاء اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور یہی ملتِ ابراہیمی کا اصول ہے۔

مصدق

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار دیا۔ اور فرمایا فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُ بِهِ اِگر یہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو فَقَدْ اهْتَدَوْا تا تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے گویا نزولِ قرآن کے زمانے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہؓ معیار قرار پائے۔ مگر بعد میں آنے والوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بھی انہیں کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ بھی اُسی معیار پر پرکھے جائیں گے۔ چونکہ اُن زمانے کے یہود و نصاریٰ صحابہؓ کے معیار پر پورے نہ اُترے۔ وہ اس طرح تمام انہما کرام اور تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ایمان لائے تھے۔ لہذا وہ مردود ہوئے۔ آج بھی جو کوئی صحابہ کرامؓ کے طریقے کے خلاف کرے گا۔ گمراہ ہو گا۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے نامی گمراہ کے متعلق فرمایا مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي

یعنی نجات یافتہ وہی لوگ ہوں جو میرے اور میرے عتاب کے طریقے پر ہوں گے۔ باقی سب گمراہ ہوں گے۔ صحابہ میں سے آپ نے خلفائے راشدین ائمہ تین کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔
 کیونکہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام خطہ زمین پر دین کو استحکام بخشا۔ واقعہ یہ کہ جس تک کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مسلمانوں سے ٹکرے سکے۔ سب مغلوب ہو چکے تھے۔ نہ صرف
 دلیل سے بلکہ سیاسی طور پر اسلام غالب آچکا تھا۔ یہ تو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے اہل بیت
 کی وہ بہت حالات نے پیشا دکھایا۔ ورنہ پچاس سال تک اسلام بہترین سے غالب رہا۔

الغرض! یہ دو نصاریٰ کو فرمایا کہ تمہارا دین اور تمہارا ایمان درست نہیں ہے بلایت
 حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی دین حق پر اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اہل
 ایمان لاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی عند اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہو گے تو ہدایت نہیں
 پاؤ گے۔

اہل ایمان
 کی کامیابی

فرمایا اگر یہ مکمل ایمان لانے کی بجائے وَإِنْ تَوَلَّوْا اگر یہ روگردانی کریں گے فَإِنَّمَا
هُمْ فِي شِقَاقٍ تو یہ محض خد اور اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ تو منصف مزاج ہیں
 اور نہ ہی حقیقت کے طلبکار ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے جائیں۔ ان کی پروا نہ کریں فَيَكْفِيكَهُمُ
اللَّهُ ان کی طرف سے ہر شرف و د کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا۔ آپ کو
 ان کی شرارتوں اور حیل سازوں سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو لوگ آپ کے متبع ہیں۔ وہ بھی ہموں ہوں
 گے۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ آپ کے دشمن ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ اور آپ کے
 ساتھی بالآخر کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ اہل کتاب نے دیکھ لیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں
 اسلام یوں غلب اور پھر آدمی دنیا تک پھیل گیا۔ وہی اہل کتاب جو آپ کے خلاف طح طرح کی
 سازشیں کرتے تھے۔ انہیں مدینہ طیبہ اور دیگر قلعوں سے نکلنا پڑا۔

ملوکیت کی
 فسطحیاں

صحابہ کرامؓ نے جو معیار قائم کیا تھا وہ بڑے اونچے درجے کا سیارہ تھا۔ اور اس پر کار بند
 رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والے لوگ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے اور خلافت کی بجائے

ملوکیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ خلافت راشدہ کے طریقے کو پس پشت ڈال دیا اور عیاشی و فحاشی والا طریقہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی طرح یہ بھی ذلیل ہوئے۔ یہ درست ہے۔ کہ بعد میں کچھ اچھے لوگ بھی آئے اور اسلام کو وقتی طور پر تقویت بھی حاصل ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ آگئی اور ہر صاحبِ اقتدار اپنی من مانی کرنے لگا۔ چوبہ کی افضل حق ہماری قوم کے بڑے مدبر انسان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے ذکھ کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بنی امیہ کا دور آیا تو انہوں نے خلافت راشدہ کے نفیس فرش کی جگہ شنشائیت کا ناٹ بچھا دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جو معیار حق صحابہؓ نے قائم کیا تھا اس میں زوال آگیا۔ اور امت میں اتفاق و اتحاد کا دامن مارا رہ گیا۔ جنگ اُمد میں اگرچہ شکست کا رمن کرنا پڑا مگر مصیبت کرامت نے **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** پر عمل کر کے زمین اس شکست کو برداشت کیا۔ بلکہ اپنے اتحاد کو اور مضبوط کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام عرب سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔

اہم البو بخاری ص ۱۱ فرماتے ہیں کہ جس معاملہ میں وحی کے ذریعے رہنمائی نہ کی گئی ہو، اُس معاملے میں نبیؐ کے لیے بھی واجب ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے۔ مگر ملوکیت کے راستے پر چل نکلنے والے صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کا کہاں حق پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ تو ابلیس کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کابل مصر اور بخارا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے ملوک نے کس قدر ظلم کیے۔ اسلام کے صحیح طریقے کو چھوڑ کر باطل طریقے پر چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدیوں سے زوال مچایا ہوا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو فرمایا کہ اگر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو آپؐ گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ ان کے مقابلے میں وہ تمہارے لیے کفایت کرے گا۔ **وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی دُعا کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اُس سے کچھ مخفی نہیں۔

مبغوثہ

فرمایا یہ آپ کو یہودیت اور نصرا نیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ آپ انہیں فرمائیجئے کہ صِبْغَةَ اللہِ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ تمہاری باطل یہودیت اور نصرا نیت سے ہمارا کیا تعلق۔ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی برائی رنگ از قسم شہنشاہ نیلایا پیدا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان کے اقوال و افعال اور اعمال پر درجہ کی وجہ سے اور چمکتا ہے۔ ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ یہودیت اور نصرا نیت والا رنگ نہیں جو کہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں تختی کا اظہار کرتے ہیں

فرمایا: وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہوگا۔ جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے۔ یہ ملت براہمچی کا رنگ ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے۔ جو اس ملت پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سحر گذار ہیں۔ جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدٌ اِس لیے ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

الْم

درس پنجاہ چہار

البقرة

(آیت ۱۳۹، ۱۴۱)

قُلْ اَتَحَاجُّوْنَكَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَكِنَّا اَعْمَالُكُمْ
 وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُولُوْنَ اِنْ
 اٰبُرِهْمَ وَاَسْمِعِمْ لَ وَاَسْحَقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا
 هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی قُلْ ؕ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَمَنْ اَظْهَرُ
 مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
 تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
 مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے (اہل کتاب سے) کیا تم ہم سے اللہ کے
 بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ہے۔ اور ہمارے
 لیے ہمارے اعمال ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہم اُسی کے لیے اخلاص
 کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کیا تم یوں کہتے ہو کہ (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور
 یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، آپ فرما دیجئے کیا زیادہ
 جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اس کو اپنی کو چھپاتا ہے۔
 جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔ اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے
 جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک مباحثہ ہے جو گنہگار چلی۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے
 جو اُس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم نے کیا۔ اور تم سے ان کاموں
 کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ جو وہ کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے ہل مذہب کی عزت
 دعوت دیتے تھے کہ یہودی نصرانی بوجہ اولادیت پہاؤ گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ
 نے اہل ایمان سے کہلویا کہ ہم تو ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں اور اسی پر کار بند رہیں گے۔

۱۴۱

حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے۔ اس کے بعد ملت اسلام اور ملت ابراہیم کا اہم اصول اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ تم اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی توحید اور اس کی کتاب کو مانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف نازل کی ہے۔ اور ان صحائف کو بھی مانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف نازل فرمائے۔ ہمارا اس شریعت اور دین پر بھی ایمان ہے۔ جو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو جو چیز بھی عطا کی گئی، ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اور ہم تفریق بین الرسل نہیں رکھتے کہ کسی کو مان لیا اور کسی کو نہ مانا، بلکہ سب کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کے رسول تسلیم کرتے ہیں۔ اور تمام کتب سماویہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ عمل کے لیے صرف قرآن پاک کو کافی پاتے ہیں۔

حضرت علیہ السلام کے صحابہ کرام بھی اسی اصول پر عمل درآمد کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں۔ جس طرح صحفہ ایمان لائے ہیں، تو وہ بھی ہدایت پا جائیں گے۔ اگر مخالفت کریں تو یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تلقین دی کہ اہل کتاب کے شر سے خائف نہ ہوں۔ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا۔ پھر فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کا رنگ پکڑنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ اور وہ دین توحید اور ملت ابراہیمی والا رنگ ہے۔ آخر میں اہل ایمان سے کہلویا کہ ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ جسکی وحدت کا اقرار کر چکے ہیں۔

اہل کتاب کے
ساتھ جو کلام

آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ساتھ مقاطعہ کی بنیاد رکھی ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ پیغمبر علیہ السلام سے خطاب کیا۔ قُلْ آپ ان اہل کتاب سے کہہ دیں اَتَحَاجُّونَنِي فِي الْاِثْمِ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم سے تعبیر کرتے ہو کیا بنائے محاسنت اللہ کی دانہ نیست اس کا دین یا اس کی عبادت ہے بلکہ جھگڑے کی بنیاد یہ ہے۔ کہ اہل کتاب اس زعم میں مبتلا تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر بڑا مہربان ہے اس کی تمام تر نوازشیں انہیں کے لیے ہیں۔ لہذا آخری نبی بھی بنواحق ہیں سے ہی آنا چاہیے۔ تاکہ ان کے خاندان کی برتری قائم رہے۔ اسی لیے وہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حالانکہ گذشتہ آیات میں گدہ پرکھا ہے کہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ اللہ جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے

_____ کسی ایک فرد یا قوم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی رحمتیں صرف انہیں کے لیے ہیں۔ اسی چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کلمہ لایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو۔ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ عَلَانِہِ دہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات ہے۔ اگر اس نے ایک زمانے میں کسی ایک خاندان کو برتری عطا کی ہے۔ تو دوسرے زمانے میں دوسرے خاندان کو شرف بخشا ہے۔ کیونکہ وہ ساری مخلوق کا رب ہے اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وہ سب کا مالک ہے۔ لہذا تم میں آپس میں مخالفت نہیں پیدا کرنی چاہیے۔ اور اگر تم نے ضرور جھگڑا ہی کرنا ہے۔ تو وَلَکُمْ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ یعنی ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُونَ اور ہم تو صرف اُسی خالق و مالک کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

اخلاص
فی الدین

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کا بنیادی اصول ہے۔ تم باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے۔ یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے۔ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فضا بھر دے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ بجز اللہ ہم نے ایمان قبول کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا ہے۔ اور صحیح معنوں میں ملتِ ابراہیمی میں شامل ہونے میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَخْلَصْ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ یعنی اپنے دین میں اخلاص پیدا کر۔ تمہارا عموماً عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل

قبول ہوتا ہے۔ ریاکاری اور دکھاوے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے۔ اہل کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں۔ وہ ضدی اور عنادی میں۔ لہذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔ مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارا دین۔ اب صلح کی گنجائش نہیں۔ یہاں بھی اہل کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں گویا یہ ایک چیلنج ہے کہ آئندہ جہاد کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔

اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ہیں۔ وہ سب کے سب انیس کے عقیدہ پر یہودی یا نصرانی تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس غلط دعویٰ کا جواب دے دیا ہے۔ اَمْ يَقُولُونَ كَيْفَ يَكُنَّ آيَاتُ رَبِّهِمْ وَاسْمِعِيلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطَ كَاَنَّهُمْ اَوْفُوا اَوْ نَصُرُوا کہ حضرت ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان کے فرمادیں۔ کہ اس دعوے کے متعلق اَنْتُمْ اَعْلَمُ اِمَّا اللہ کی تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ کہ انبیائے سابقین کس طریقے پر تھے۔ فرمایا یہ حضرات نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو خلیفہ تھے۔ یعنی خالص اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے تھے۔ تمہاری یہ یہودیت یا نصرانیت تو تورات اور انجیل کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اور انبیائے متعلقین کے صدیوں بعد کی پیداوار ہے۔ ان کا ان باطل عقائد کے ساتھ کیا تعلق وہ تو خالص ملت اسلامیہ پر کاربند تھے۔ اور اُسی کی تبلیغ کرتے رہے خاص طور پر جب الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو پہلے بھی کسی درس میں آپ کا ہے۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی آپ تو خلیفہ اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ آپ مشرکین میں سے قطعاً نہیں تھے۔ لہذا ان کی نسبت یہودیت یا نصرانیت کی طرف کرنا نہایت ہی قبیح حرکت ہے۔ بجلالہ اللہ تعالیٰ کے نبی یہودیت اور نصرانیت کا باطل طریقہ کیسے اپنا کتے میں۔ جو انکار نبوت، عقیدہ تشبیہ اور تفریق بین الانبیاء والا طریقہ ہے۔ ایسے باطل عقائد تمہیں مبارک ہوں۔ انبیائے سابقین ان سے مبرا تھے۔

انبیائے سابقین کا عقیدہ

آگے اہل کتاب کی ایک اور زیادتی کو بیان فرمایا۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَبَ شَهَادَةً
عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ اسْخُسَ مِنْ بَرْصٍ كَوْنِ ظَالِمٍ هُوَا۔ جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے
گواہی موجود ہو۔ اور وہ اسے چھپائے۔ یہ گواہی کون کی تھی۔ جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے۔
گواہی حضور علیہ السلام کی بعثت۔ قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے بارے میں تھی۔ آگے
آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کر رہے تھے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو۔
مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ
کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم
نہیں کرتے تھے۔ گویا توراۃ نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی۔ اسے
چھپاتے تھے۔ انہیں کے متعلق فرمایا کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے پاس
موجود شہادت کو چھپا جائے۔

شہادۃ کا چھپانا دیکھ ہی گناہ ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ
شہادت کو چھپانے والے کا دل گنہگار ہے۔ بلکہ صحیح گواہی دینا تو ضروری ہو جاتا ہے بغیر
ہر جب کہ وہ دین کے متعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ
اللہ تعالیٰ کے لیے شہادۃ کو قائم کرو۔ اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ظالموں میں
شمار ہو گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی طرف سے کتاب شہادت کو سورۃ اعراف میں یوں بیان
فرمایا۔ يَجْزِيكَ دُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ اس نبی اُمی کی
پیش گوئیاں اور حال توراۃ اور انجیل میں ان کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ حق بات کو
چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی قبیح حرکات کا علم نہیں بلکہ وہ تو
ہر چیز کو جانتا ہے۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ لِّعَمَلِكُمْ لَوْ أَنَّكُمْ غَافِلُونَ لَمَا كُنْتُمْ
تمام کاروائی کو جانتا ہے۔ اور مناسب وقت پر تم سے مواخذہ کرے گا

یہ آیت گذشتہ سے پوچھتا ہے کہ اس میں بھی آپ کی سے۔ یہاں اس کو دہرایا گیا ہے

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ يَوْمَ يَأْتِيهِمْ أَمْتُ قَوْمِهِمْ
جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اس اُمت نے کمایا اور تمہارے لیے وہ سب جو تم نے
کمایا، وَلَا تَسْأَلُونَهُمْ عَنْ شَيْءٍ قَدْ أَنْفَضَ غَمَلُهُمْ عَنْهُ ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائیگا
کہ وہ کیا کرتے رہے۔ بلکہ تم اپنے کمر دار کے ذمہ دار ہو۔ وہ اپنے فعال کے ذمہ دار ہیں۔ مطلب یہ کہ اُسے
اب کتاب اگرچہ تم اپنی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کرتے ہو مگر تم ان کے عقیدے پر قائم
نہیں رہو گے۔ لہذا تمہاری یہ معمولی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان کے عقیدے اور اعمال بیشک
درست تھے۔ لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے۔ تمہیں اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔
تَمَّتِ الْبَرِّيَّةُ بِكَ اہم ترین اصول وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ہے یعنی کوئی
کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک شہی ہے لَا تَجْنِي عُنُقَكَ
وَلَا تَجْنِي عُنُقَ بَابٍ اور بیٹے کے متعلق فرمایا کہ باپ کا گناہ بیٹے کی گردن پر نہیں ہوگا۔ اور
نہ بیٹے کی زیادتی پر باپ کو چڑا جائے گا۔ ہر کوئی اپنے کام کا ذمہ دار ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ
انبیاء علیہم السلام کی طرف محض نسبت کر لینا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک ان کی پوری پوری اتباع
نہیں کی جائے گی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ کا دہرایا جانا خاص مقصد کی بنا پر ہے
صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی۔ اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے
تو اس سے مراد اہل اسلام کی تفسیر ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بی خالی نسبت پر تکیہ لگا کر نہ
بیٹھے رہیں۔ بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ السلام کے احکام کی پابندی
کریں۔ تو ان کے لیے بھی راہ نجات کھل سکتی ہے۔ اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ آج کل
کے پیرزادوں، امیر زادوں، گدی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کا محاسبہ کریں۔
آباؤ اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی۔ باپ نیک و صالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ بہت
بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی۔ نسبت تو جب مفید ہوگی تب بزرگوں کے خصائص سے حسبِ نیاز ہو۔

اماموں کے ساتھ نسبت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہی مالِ شائع طریقت کا ہے۔ اپنی نسبت بلند خانہ اوروں کی طرف کرتے ہیں مگر ان کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ آج چشتیہ اور قادریہ سلسلہ کی طرف نسبت کرنے والے کتنی لغو بات میں ملوث ہیں۔ کیا شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مواظظ اور دیگر تصنیفات ہیں۔ ایک ایک نقطہ سے ایمان اور حقیقت ٹپک رہی ہے۔ کفر اور شرک سے بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے مگر ان کی طرف نسبت کرنے والے کفر و شرک اور بدعت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے عرس منے جاتے ہیں، ان کی قبروں پر چڑھاٹے چڑھاٹے جاتے ہیں۔ رسومات باطلہ کا دور دورہ ہے۔ مگر نسبت ان کی طرف ہے۔ ایسی نسبت کیا فائدہ ملے گی۔

چشتی اپنے آپ کو خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملک میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ فرید الدین گنج، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جیسے مشائخ کے ذریعے اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ان کے ذریعے برصغیر کے کتنے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ کتنے لوگوں کا حلق بائیں قائم ہوا۔ ایسے بزرگوں کا اس خطہٴ ارضی پر کتنا احسان ہے۔ مگر تاج انہیں کے پرکار چشتیہ خاندان کی طرف نسبت کرنے والے راگ، رنگ اور گانے بھگنے میں مشغول ہیں۔ قوالی کا نام دے کر کتنی ہی رسوم باطلہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا۔ یہ خالی نسبت کام نہیں آئی گی جب تک ان بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں گے۔ اسی چیز کو یہودیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اہل ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ وہ بھی یہودیوں کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ بلکہ اپنے اندر حقیقی ایمان بیدار کریں۔

ہم سے ہاں امام البرصغیرؒ کی طرف نسبت کر کے حنفی کھلانے والے لوگوں کی اکثریت سے مگر ان میں سے کتنے ہیں جو صحیح معنوں میں امام صاحبؒ کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض حنفی کھلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا جب تک آپ کا اتباع نہ ہوگا، اسی طرح امام شافعیؒ کی طرف نسبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنے طریقہ پر قائم نہیں ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوا ہے۔ لاکھ شافعی کہلا میں کچھ فائدہ نہیں۔ اس قسم کی خالی نسبت تو وہی یہودیوں والی نسبت ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ

انتیارتہ کریں۔ اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کا نام لے لے کر فرمایا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المطلب خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن لوگ اعمال لے کر آئیں۔ اور تم محض خاندانی تعلق اور رشتہ داری لے کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔ آج اپنی فکر کرو۔ اَلْهٰذَا اَنْفُسُكُمْ مِنَ الشَّارِ اِیٰنِ جَانِزِں کو دوزخ سے بچا لو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایمان کو درست کرو۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرو۔ اس طرح تم کو آخرت میں درجات نصیب ہوں گے

فرمایا یہ امت سبے جو گزر چکی۔ جو کچھ اس امت نے کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کمایا وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کیسے کرتے تھے۔ بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔ تم سے سوال ہوگا۔ کہ تم نیکی اور توحید پر کار بند تھے یا نہیں۔ تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں۔ تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرک و افعال کی طرف بھرتے تھے۔ تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی بھگڑنے میں مصروف رہتے۔ آج اپنا محاسبہ کرو۔ قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا۔

نمازِ مسنون کلاں

تالیف

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی

دامت برکاتہم

نمازِ مسنون غلہ کے بعد نمازِ مسنون کلاں ایک ایسی مفید اور نماز کے موضوع کا جامع کتاب ہے
 جو نماز کے تمام ضروری مسائل مع قوی دلائل از کتاب و سنت احادیث و فقہاء و ائمہ کرام
 رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تاہمین عظام رحمہم اللہ تعالیٰ اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مضبوط اقوال سے
 مزین ہے جس میں طہارت، اذان، اوقات نماز، فرائض، سنن و استحباب، مسکرات و
 مفہومات کھراہین ہے۔ ارکان، واجبات و سنن کی پوری حکمت اور ضروری مباحث
 و مسائل جمع و میدان، نماز جنازہ اور نوافل وغیرہ کے جملہ اہم مباحث اور اس کے
 ساتھ ذکر دعوت اور خطبات کا ایک بہترین نصاب درج ہے۔
 امام ترمذی کے علاوہ علماء کرام، اساتذہ عظام اور خصوصاً علماء علم دین کے لیے ایک نعت
 غیر مترقبہ ہے جس کا انداز بیان اور زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔
 عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، مسیدی جلد بندی، قیمت ۱۶۰/- روپے

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

محلہ فاروق گنج، گوجرانوالہ

ملنے کے ہیں

۱۔ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ المسلمین گوجرانوالہ

۲۔ مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج، گوجرانوالہ

علماء کرام، طلباء عظام اور عوام الناس کے لیے گرانقدر علمی تحفہ

شمائل ترمذی

مع اردو ترجمہ و شرح

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ

مقدمہ، اضافہ، حاشیہ

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

یہ کتاب حضور ﷺ کے شمائل و خصائل کے شعبہ میں امام ترمذیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے جو کہ مدارس میں درس نظامی کے نصاب میں بھی داخل ہے اس کتاب کے کل چھپن ابواب ہیں جن میں سے ابتدائی پچیس ابواب کی شرح نہایت دلنشین اور اچھوتے انداز میں منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب کی احادیث پر اعراب، سلیس اردو ترجمہ، عمدہ تشریح اور حواشی میں روایات کے اسماء و کنی، القاب، سن، موالید و وفیات کے علاوہ بہت سے علمی، تحقیقی مواد پر مشتمل و محفوی ہے۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۵۰۸ صفحات پر مشتمل جلد اول کی قیمت صرف ۱۳۰ روپے ہے باقی ابواب کی شرح انشاء اللہ العزیز جلد دوم میں شائع ہوگی۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

معالم العرفان — دُرُوس القرآن

المآلات

مفتی محمد صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد نائی صاحب

مطبوعہ

الحق پبلشرز دین صاحب (پریس سونامی)

زمرہ انتظام

انجمن مجاہدان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

منزل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

فرائض

محمود انور بیٹ ایڈووکیٹ

ماہنامہ مکتبہ المکرمہ

محمد منیر صاحب Ph: 221943

مکتبہ دُرُوس القرآن گوجرانوالہ